اتر پردیش اردو اکادمی کا علمی و ادبی مجلہ

دو ماہی

اکادمی

لکھنؤ

جلد نمبر ۱۰ | نومبر دسمبر ۱۹۹۰ و جنوری فروری ۱۹۹۱ | شمارہ نمبر ۳ و ۴

ایڈیٹر
محمد یونس نگرامی

عبدالماجد دریابادی نمبر

سالانہ چندہ : بیس روپے
فی شمارہ : چار روپے

اس خصوصی نمبر کی قیمت : بارہ روپے

خط و کتابت کا پتہ :
اتر پردیش اردو اکادمی
قیصر باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

جگدیش چندر چڈھا، سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے میسرس نظامی پریس وکٹوریا اسٹریٹ لکھنؤ سے چھپوا کر ۲۱، آر کے ٹنڈن روڈ، قیصر باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱ سے شائع کیا۔

عبدالماجد دریابادی نمبر

ترتیب مضامین

اداریہ

مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲-۱۹۷۷) کا شمار ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں ہے جنھوں نے اپنے علمی اکتسابات کے وسیلے سے اردو ادب کے دامن کو مختلف حیثیتوں سے مالا مال کیا اور خود عالم گیر شہرت کے مالک ہوئے۔

مولانا بلند پایہ ادیب، نقاد، صحافی، مفسر قرآن اور عالم دین تھے۔ انھوں نے انگریزی کی بعض اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ فلسفے کا شمار بھی ان کے مرغوب موضوعات میں ہوتا ہے۔ فلسفے کی مبادیات پر انھوں نے وقیع تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔

عالم شباب میں مولانا کچھ عرصہ تشکیک کا شکار رہے تھے ورنہ ان کی بقیہ حیات پابند صوم و صلوٰۃ متشرع، دین دار و وضع دار عالم باعمل کی تصویر نظر آتی ہے۔ رواداری اور ملنساری مرحوم کی شخصیت کے خاص جوہر تھے۔ جہاں تک صحافت کا تعلق ہے مرحوم کی حق گوئی اور بے باکی زباں زد عام ہے۔ ہفتہ وار "سچ"، "صدق" اور ان کا مشہور کالم "سچی باتیں" اصلاح معاشرہ کے تئیں ان کے دلی لگاؤ کے آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے ہمیشہ یہ باور کرایا کہ اسلام دوسرے مذاہب سے ٹکراؤ کی ہرگز تعلیم نہیں دیتا بلکہ اس کے برعکس دوسروں کے ساتھ بھائی چارے اور رواداری کے برتاؤ کی تلقین کرتا ہے۔ وہ اختلافِ نظریات کی بنیاد پر تصادم کی صورت پیدا ہونے کو نوع انسانی کے لیے نہایت مضر سمجھتے تھے۔

عالم دین اور مفسر قرآن کی حیثیت سے مولانا دریابادی کو عرب دنیا میں بھی نہایت قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ حال ہی میں حکومت مراکش نے دنیا کی بہترین تفسیروں کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ مولانا مرحوم کی تفسیر کو کثیر تعداد میں شائع کرا کے عالمی پیمانے پر تقسیم کرایا جائے۔

گزشتہ برس مولانا کی یاد میں ۱۹ ، ۲۰ مارچ کو اکادمی کے زیر اہتمام ایک کل ہند سمینار منعقد ہوا تھا جس میں مولانا کی حیات و خدمات پر علما و ادبا نے مقالے پیش کیے تھے۔ تمام مقالات پر مشتمل دو ماہی اکادمی کا ایک خصوصی شمارہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ جو مقالے ہمیں مل گئے ان کی کتابت کرالی گئی اور جو نہیں ملے ان کا انتظار کیا گیا۔ انتظار طول کھینچتے کھینچتے بالآخر مایوسی کی منزل میں داخل ہو گیا۔ نتیجتہً اس افسوس کے ساتھ کہ ہماری کوشش کے باوجود چند مقالات اس شمارے کی زینت نہیں بن سکے، آگے بڑھنا پڑا۔ بہر حال اگر یہ مقالے ہمیں بعد میں موصول ہوتے ہیں تو ان کو عام شماروں میں شائع کر کے نذرِ قارئین کیا جائے گا۔

عبدالماجد دریا بادی سمینار کی افتتاحی تقریب ۱۹ ، مارچ ۹۱ کو منعقد ہوئی تھی۔ سمینار کا افتتاح عزت مآب بی ستیہ نرائن ریڈی گورنر اتر پردیش نے کیا تھا۔ ریاست کے وزیر اعلا عالی جناب ملائم سنگھ یادو مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ افتتاحی تقریب کی صدارت کے لیے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی سے درخواست کی گئی تھی جسے شرف قبول بھی حاصل ہوا تھا۔ لیکن عین وقت پر انھیں کسی ناگزیر کام سے مدراس تشریف لے جانا پڑا اور انھوں نے عدم شرکت کے لیے اپنا تحریری معذرت نامہ ارسال فرما دیا۔ اس خط کا عکس تبرکاً اس شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

محمد یونس نگرامی

Phone : 22948
29747

Darul Uloom Nadwat - ul - Ulama

LUCKNOW—7

No.　　　　　　　　　　　　　　　　Date 18th March 1990

نگرامی

عزیز گرامی مولوی محمد یونس صاحب

چیرمین اترپردیش اردو اکیڈمی، مکرم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

اترپردیش اردو اکیڈمی کی دعوت پر اور آپ کی خصوصی توجہ و اہتمام میں مولانا عبدالماجد دریابادی سیمینار ہر اعتبار سے لائق تبریک و تہنیت ہے مولانا مرحوم کے میرے افراد خاندان، تحریک ندوۃ العلماء اور اسکے ذمہ داروں کے ساتھ بڑے گہرے روابط تھے خود مجھ پر بھی ہمیشہ شفقت و کرم فرماتے رہے، جس کی وجہ سے اس تقریب سے مجھے ذاتی دلچسپی تھی اور بڑی خواہش تھی کہ اس موقع پر مولانا مرحوم کے ایک معتقد اور مستفید کی حیثیت سے شریک ہوتا اور اسی ارادہ سے دہلی آیا تھا کہ ۱۹ تک واپس آجاؤنگا لیکن مجھے دہلی سے اچانک ایک اہم اور ضروری کام سے مدراس کا سفر کرنا پڑا اور اس تقریب میں شرکت سے محروم رہ گیا، میرا دل و دماغ اور میری دعائیں آپکے ساتھ ہیں اللہ تعالیٰ آپکی ہمت بلند رکھے جد وجہد کو قبول فرمائے اور اس سیمینار کو ہر اعتبار سے کامیاب اور مفید بنائے۔ آمین

دعاگو

ابوالحسن علی حسنی ندوی

عکس مکتوب مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی

پروفیسر نثار احمد فاروقی

مولانا عبدالماجد دریابادی
ایک ہشت پہلو شخصیت

مولانا عبدالماجد دریابادی اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے انیسویں صدی کا نصفِ آخر اور بیسویں صدی کا نصف اوّل دیکھا تھا۔ ان کے ابتدائی دور تک ہندوستانی مغل تہذیب کی کھرچن کچھ نہ کچھ باقی تھی۔ ابھی بچوں کو گھروں پر قرآن کریم پابندی سے پڑھایا جاتا تھا، پھر عربی و فارسی کی ابتدائی نصابی کتابوں پندنامہ و کریما و مقیماں انوارِ سہیلی اور بہارِ دانش، گلستاں اور بوستاں تک نوبت پہنچتی تھی۔ اگر عربی میں مزید تحصیل کی طرف رجحان ہے تو معقولات و منقولات کی تعلیم انفرادی درس گاہوں میں بھی ہو رہی تھی اور بعض قدیم مدارس بھی بڑے شہروں میں چل رہے تھے۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ زندگی کے دو بالکل متضاد رویے واضح ہوتے جا رہے تھے اور اِکّا دُکّا کالج بھی کھل گئے تھے جن میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے والوں کو سرکاری ملازمت آسانی سے مل سکتی تھی۔ جن لوگوں کی مالی حالت بہتر تھی وہ اپنی اولاد کو ولایت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی بھیجنے لگے تھے، یہ وہاں سے "صاحب بہادر" بن کر آتے تھے اور اب انھیں اپنی مشرقی زندگی کی رسمیں اور ریت رواج سب احمقانہ نظر آتے تھے۔ وہ مغربی طرزِ زندگی اور معاشرت میں ساری خوبیاں دیکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تعلیم یافتہ نسلیں الکندی و فارابی ابن سینا اور غزالی، ابنِ رُشد اور البیرونی، مولانا روم اور سعدی و حافظ و جامی کے ذہنی اُفق سے دور اور مغرب کے اہلِ فکر و نظر سے نیم شناسا ہوتی گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں مشرقی

آثار و اقدار کی بیخ کنی ہو رہی تھی، مگر یہ عمل ایسا تھا جیسے گھڑی کی سوئیاں چلتی نظر نہیں آتیں
اور وقت بدلتا رہتا ہے۔ اسی عبوری اور بحرانی دور میں اکبر الٰہ آبادی پیدا ہوئے، جو اُس
عہد میں اقدار کی شکست و ریخت کے ترجمان بن گئے ہیں۔ مولانا دریابادی کو ابتدائی خانگی
کے بعد جب کالج کی ہوا لگی تو اُن کی آنکھیں بھی خیرہ ہو گئی تھیں اور دہریت و الحاد کی جانب
ہو گیا تھا۔ اس دور میں انھوں نے بعض کتابوں کے ترجمے بھی کیے اور کچھ مضامین بھی لکھے
ان میں یہ رنگِ دہریت تو نمایاں رہنا ہی تھا۔ فلسفۂ اجتماع ان کی اسی زمانے کی تالیف
ہے (۱۹۱۵ء)۔ مگر یہ دور زیادہ طویل نہ رہا۔ اکبر الٰہ آبادی سے نیاز مندانہ تعلق پیدا ہو
پھر خواجہ حسن نظامی اور مولانا محمد علی جوہر، سید سلیمان ندوی جیسی شخصیات سے ربط ضبط
بڑھا، مطالعہ مثنوی کا ذوق ہوا تو اس نے تصوف کی طرف دامن کھینچا اور آخر کار مولانا
اشرف علی تھانوی کی خانقاہ تک پہنچا کر چھوڑا۔

مولانا دریابادی یک فنے نہیں ہیں، اُن کی متعدد اور متنوع حیثیات ہیں اور ان
میں ہر حیثیت پر تفصیل سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ ہم پہلے اُن کی بعض ممتاز خصوصیات پر اختصار
سے روشنی ڈالیں گے پھر مولانا کی ادبی حیثیت کا جائزہ قدرے تفصیل سے پیش کریں گے۔

(۲)

مولانا دریابادی نصف صدی سے زیادہ عرصے تک بے تکان لکھتے رہے۔ انھوں
نے ابتدائی دور میں بعض افسانے بھی لکھے۔ ایک ڈرامے کا ترجمہ بھی کیا۔ فلسفہ و اجتماع کا
ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس زمانے کی ایک اور کوشش تاریخ اخلاقیات یورپ ہے، جو لیکی
کی کتاب (HISTORY OF EUROPEAN MORALS) کا ترجمہ دو بڑی جلدوں
میں ہے۔ کتاب تو خیر اپنی جگہ تحقیق کا شاہکار ہے ہی، اور ہر اُس شخص کے مطالعہ کرنے کے
لائق ہے جو مغربی تمدن سے مرعوب ہو گیا ہو، مولانا دریابادی نے اس کا ترجمہ بھی ایسا کیا
ہے کہ اُس سے بہتر، سلیس تر، شگفتہ اور رواں دواں ترجمہ ممکن نہیں۔ اس میں فلسفہ و
نفسیات، مذہب اور قانون کی بہت سی اصطلاحیں بھی آئی ہیں جن کا اردو مرادف پہلی بار
مولانا نے دیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۷ء میں چھپا تھا (انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ

اس کے بعد یہ ۱۹۳۲ء میں پھر چھپی تھی۔

مولانا دریابادی نے اردو میں پہلی بار علم النفس کے موضوع پر بھی ایک دل چسپ اور پُراز معلومات کتاب کتاب "ہم آپ" لکھی تھی (ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد ۱۹۴۸ء)۔ اردو میں نفسیات پر کتابیں ہیں ہی کتنی، اُن میں آج بھی مولانا کی یہ کتاب قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ ہے۔ (صفحات ۲۲۴)

مولانا نے سوانح کے موضوع پر بھی قلم اٹھایا اور اس میں بھی جدت اور جودت دکھائی ہے۔ اُن کی تصنیف "مولانا محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق" خاصی ضخیم اور دو جلدوں میں بھرپور کتاب ہے (کل صفحات ۷۲۸) اور اس کو انھوں نے اپنی ڈائری کی یادداشتوں پر استوار کیا ہے۔ یہ کچھ ایسی تکنیک ہے جسے فلم کی اصطلاح میں مونتاژ (MONTAGUE) کہتے ہیں۔ اس میں مختلف حوادث اور واقعات کے ٹکڑوں کو جوڑا گیا ہے مگر تاثر کا شیرازہ کہیں ٹوٹنے نہیں پایا ہے، اور کتاب شروع سے آخر تک قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے اسے آپ ایک طویل خاکہ کہہ لیں یا سوانح کے زمرے میں رکھ دیں لیکن اس کا انکار ممکن نہیں کہ اس کی تکنیک منفرد اور تاثر گہرا ہے۔

دوسری کتاب جسے ہم سوانح کے ذیل میں شمار کر سکتے ہیں "حکیم الامت" ہے۔ (صفحات ۶۱۴، ۱۹۵۲ء معارف پریس اعظم گڑھ)۔ اگر محمد علی کی بنیاد ڈائری پر رکھی تھی تو "حکیم الامت" کی نیو خطوط پر رکھی ہے اور یہاں بھی خطوط کی پیوندکاری اس طرح کی ہے کہ تاثر کی ایک لے بن جاتی ہے جو مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کی شخصیت، اُن کے طریقِ اصلاح و تربیت، نظامِ خانقاہ اور نفسِ انسانی کے اسرار و خفایا پر ان کی عقابی نظر کو سمجھنے کے لیے اپنے نمونے کی بس ایک ہی ہے۔ اس کی تکنیک بھی روش عام سے ہٹ کر کچھ انوکھی سی ہے مگر اپنے قاری تک جو تاثر دریابادی پہنچانا چاہتے ہیں وہ پورا پورا ملتا ہے۔

اسی قبیل سے انھوں نے خود اپنی سوانح عمری بھی لکھی ہے۔ اپنے بارے میں مختلف اوقات میں متفرق باتیں جو وہ لکھتے رہے تھے ان کو جوڑ کر بھی ان کی خود نوشت تیار

ہو سکتی تھی مگر دریابادی نے اردو خود نوشت کے سرمائے میں بھی ایک ایسی کتاب کا اضافہ کیا ہے جو مواد کی صحت اور اسلوب بیان کی دل کشی کے باعث کبھی فراموش نہیں کی جا سکے گی۔

مولانا تھانوی سے ربط اور مثنوی کے مطالعے نے تصوف کا مذاق تو پیدا کر ہی دیا تھا اب دریابادی نے چاہا کہ تصوف اسلامی کا جو بنیادی ذخیرہ ہے اس کو پڑھ کر بھی دیکھا جائے تو ایک ایک ماخذ کا تنقیدی جائزہ لیا اور اُس کی تلخیص اپنے ملاحظات کے ساتھ تیار کی، اس طرح کتاب "تصوف اسلام" وجود میں آگئی جس کے اب تک متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ جس وقت یہ پہلی بار شائع ہوئی تھی تو اردو میں پہلی کتاب تھی جس میں تصوف کی اتنی بنیادی کتابوں کا ناقدانہ مطالعہ یک جا پیش کیا گیا تھا۔

اسی ذیل میں مولانا دریابادی نے ایک اور اہم کام یہ کیا کہ مولانا روم کے ملفوظات "فیہ مافیہ" کا ایڈیشن تیار کیا۔ مولانا روم اپنی مثنوی اور دیوان شمس تبریز میں جتنے دلکش اور عام فہم اسلوب میں ہمیں ملتے ہیں ان ملفوظات میں وہ اُتنے ہی پُراسرار اور مبہم نظر آتے ہیں۔ ان ملفوظات کے متن کو صحیح پڑھنا اور ان کی تصحیح کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہندوستان میں یہ کام بھی مولانا دریابادی نے سب سے پہلے انجام دیا۔

فلسفہ تو ان کا موضوع تھا ہی اور کالج کے زمانے سے ان کو اس سے دل چسپی تھی۔ دریابادی نے فلسفہ کی بعض کتابوں کے تراجم بھی کیے اور مستقل موضوعات پر مضامین بھی لکھے "فلسفہ وجذبات" ۱۹۱۴ء مسلم پرنٹنگ ہاؤس لکھنؤ سے چھپی تھی (صفحات ۲۵۰) ۱۹۱۵ء میں الناظر پریس لکھنؤ نے فلسفۂ اجتماع شائع کی (صفحات ۲۴۸)۔ اسی دور میں انھوں نے "مکالمات برکلے" کا اردو ترجمہ کیا (صفحات ۱۵۰) اسے مطبع معارف اعظم گڑھ نے ۱۹۱۹ء میں چھاپا تھا اور فلسفیانہ مضامین کا ایک مجموعہ "فلسفیانہ مضامین" ہی کے نام سے ۱۹۲۵ء میں الناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کیا تھا (صفحات ۲۰۶)۔ اس کے علاوہ بھی فلسفہ کے موضوعات پر اُن کی کچھ متفرق تحریریں ہیں۔

سماجیات کے موضوع پر انھوں نے پال رچرڈ کی کتاب کا ترجمہ بھی "پیامِ امن"

کے عنوان سے کیا تھا یہ ۱۹۲۳ء میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے چھپا تھا (صفحات ۱۸۱) اس میں پہلی جنگ عظیم کے حالات اور اس کے بھیانک نتائج بیان ہوئے ہیں۔

تاریخی کتابوں کے تراجم میں سرِ بہری تھامسن بکل کی تصنیف ہسٹری آف سویلزیشن کا ترجمہ ہے جو محمد احمد علی کے اشتراک سے کیا تھا یہ بھی دو جلدوں میں ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا تھا پہلی جلد میں ۱۵۲ اور دوسری میں ۲۲۰ صفحات ہیں۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے تعلق کے زمانے میں مولانا دریابادی نے نواب حیدر یار جنگ اور قاضی تلمذ حسین کے اشتراک سے "تاریخ یورپ" کا ترجمہ کیا جس کی جلد اول ۱۹۲۲ء میں اور جلد دوم ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد ہی سے شائع ہوئی۔

اسی زمانے میں مولانا دریابادی کی ایک تالیف "تحفۂ خسروی" مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپی تھی (۱۹۲۱ء) ۸۷ صفحات کی اس مختصر تالیف میں حاکم و محکوم کی حیثیت پر قرآن و حدیث اور اقوال حکما کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور اس کا پس منظر غالباً تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات تھی جس سے مولانا دریابادی وابستہ تھے۔ اس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

ادبیات نثر کی ایک شاخ سفر نامہ بھی ہے۔ مولانا برسوں سے گوشہ نشین ہو گئے تھے اور دریاباد ہی میں بیٹھ کر ادب و انشا کے دریا بہا رہے تھے، کبھی اتفاقاً کہیں کا سفر پیش آتا تھا تو اُس کی تھوڑی بہت روداد صدق کے پڑھنے والوں کے لیے لکھ بھی دیا کرتے۔ مگر انھوں نے باضابطہ سفر نامے بھی لکھے جن میں وہی شگفتگی اور برجستگی، حلاوت اور عذوبت ہے جو مولانا دریابادی کا خاصہ تھی۔ انھوں نے اپنے سفر حج کا حال "سفر حجاز" میں لکھا تھا یہ سفر نامہ کتابستان الٰہ آباد سے شائع ہوا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں انھوں نے پاکستان کا سفر کیا تو ایک مختصر مگر دلچسپ سفر نامہ "ڈھائی ہفتے پاکستان میں" وجود میں آگیا (۱۹۵۵ء)۔

اردو شعر و ادب سے بھی مولانا کو ایسا لگاؤ تھا کہ شاعری کا رس جس اُن کی تحریروں میں بس گیا تھا۔ فارسی اور اردو کے بہترین اشعار ایسے برمحل استعمال کرتے تھے جیسے وہ خاص اُسی موقع کے لیے کہے گئے ہوں کبھی شعر کو نثر میں سمیٹ لیتے تھے تو اس کا لطف الگ

ہی ہوتا تھا۔ یا اشعار کے صرف چند الفاظ یا اشارہ استعمال کر کے قاری کا ذہن اُدھر موڑ دیتے تھے۔ انھیں غزل ہی نہیں دوسری اصناف سے بھی ایسی ہی دل چسپی تھی۔ مصحفی کی مثنوی "بحر المحبت" کو تو پہلی بار مولانا ہی نے شائع کیا تھا اس پر ایک مختصر مگر جامع مقدمہ لکھا اور اس میں جن نکات سے بحث کی ہے اُن پر کوئی خاص اضافہ آج بھی شاید ممکن نہیں۔ دریائے عشق اور بحر المحبت کا موازنہ کرتے ہوئے جو باتیں مولانا نے لکھ دی ہیں وہ ان کی ناقدانہ بصیرت کی گواہی دے رہی ہیں اور اس سے زیادہ نپی تلی رائے اب تک اور نہیں دی گئی۔

(۳)

مولانا دریابادی کی تصنیفی خدمات میں اُن کی عالمانہ تفسیر "تفسیر ماجدی" ہے۔ اس کی خصوصیات پر ایک جداگانہ اور مفصل مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ تفسیر ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے اور یہ اردو انگریزی دونوں زبانوں میں لکھی گئی ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیت ایک تو یہ ہے کہ اس میں اہل سنت والجماعۃ کے عقائد کے مطابق تفسیر کی گئی ہے اور تفسیر بالرائے کی جو صورت محمود ہے صرف اسی کو دخل دیا گیا ہے۔ دوسرے اس میں ترجمہ فصیح و سلیس اور بامحاورہ و شائستہ ہے، محاوروں کی ٹھونسم ٹھانس نہیں ہے۔ اس میں مولانا نے مفسرین قدما کی کتابوں کے علاوہ جدید تحقیقات سے اور انگریزی مصادر سے بھی استفادہ کیا ہے اور بہت سے مقامات ایسے آئے ہیں جہاں مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ اور اثریات پر علمائے مغرب کی تحقیقات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ تفسیر قدیم طرز کے علما اور جدید تعلیم یافتہ دونوں کے لیے قابل قبول ہے اور اس میں متنازعہ فیہ مسائل کو کہیں نہیں آنے دیا ہے جہاں ایسے امور آئے ہیں مولانا نے اعتدال کے ساتھ ان کا جائزہ لیا ہے۔ اُن کی ایک مختصر مگر اہم تصنیف "جغرافیہ قرآنی" بھی اس موضوع پر لکھی جانے والی تین چار کتابوں میں سے ایک ہے۔

مصنف و مترجم ہونے کے علاوہ مولانا دریابادی صحافی بھی تھے۔ انھوں نے نصف صدی سے زیادہ مدت تک 'سچ'، لکھنؤ پھر 'صدق'، اور آخر میں 'صدق جدید' کی ادارت کی۔

ن کے پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ برصغیر ہی میں نہیں یورپ اور امریکا تک موجود تھا
ر انھوں نے اپنی صحافت کو اس زمانے کی آلودگی اور مکاریوں سے پاک رکھا اگر وہ اہلِ
مانہ کی روش پر چلتے ہوتے تو صدق ہی کے ذریعے لاکھوں روپے کی جائداد بنا سکتے تھے۔
ر اتنی طویل زندگی اور ایسی مقبولیت کے باوجود صدق ایک مخصوص سنجیدہ حلقے کا ہی
خبار رہا اور اس کی اشاعت بھی محدود ہی رہی۔ اس اخبار میں علمی و تحقیقی مسائل بھی ہوتے
ھے، تاریخ بھی، سیاست بھی۔ دینی اور مذہبی موضوعات بھی اس میں جگہ پاتے تھے۔ مولانا
ے شذرات "سچی باتیں" ایسے دل چسپ، عام فہم اور ادبی چاشنی لیے ہوتے تھے کہ برصغیر
ے اخباروں میں بھی خوب نقل کیے جاتے تھے اور ان سے محظوظ ہونے والوں کا حلقہ اس
عتبار سے بہت وسیع تھا۔ مولانا کا مطالعہ کتب قدیم تک محدود نہ تھا، انھوں نے حالات
اضرہ کا بھی گہرا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر سے اپنے کام کی ریزہ ریزہ خبریں جمع کر کے
ن پر ایسا بھرپور تبصرہ کرتے تھے جس سے اُن کا موقف بالکل واضح ہو جاتا تھا اور عموماً قاری
ن کی رائے سے متفق ہوتا تھا۔ یعنی مسائل و مباحث کو وہ بلا تبصرہ کہہ کر اس انداز سے
یش کرتے تھے کہ گویا کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ جاتے تھے۔ طنز کے تو وہ بادشاہ تھے۔
ن کی زبان میں اودھ کا کلچر رچا ہوا تھا۔ ضلع جگت کا استعمال ان سے بہتر اس دور میں
سی نے نہیں کیا اور یہ ایسی خوبی سے ہوتا تھا کہ اس میں آورد مطلق نہ تھی آپ غور کریں
و سمجھ میں آتا تھا کہ یہاں مولانا ضلع جگت کا پینترا دکھا گئے۔

مولانا کے اسلوب کی ایک خوبی اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ وہ بات کو زیادہ طول
ے کر اور خواہ مخواہ کے لچھے ڈال کر بیان نہیں کرتے تھے۔ سیدھے سادھے جملوں میں چند
فظوں میں اور بے تکلف لہجے میں لکھتے تھے جس میں محاورہ و روزمرہ اور ضلع جگت
ے باوصف سادگی بھی ہوتی تھی اور بات دل میں کھب جاتی تھی۔ وہ اشعار کا، تلمیح و
حاکات کا استعمال بھی خوب کرتے تھے اور اس طرح لکھتے تھے جیسے آپ سے باتیں
ر رہے ہیں۔ دیکھنے میں یہ اسلوب قصباتی سا معلوم ہوتا ہے مگر اس انداز پر کوئی لکھنے
یٹھے تو دانتوں پسینہ آجاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مولانا دریابادی کی خدمات طویل مدت پر پھیلی ہوئی ہیں اور اپنی نوعیت واصناف کے اعتبار سے بھی متنوع ہیں۔ ان کی شخصیت بھی سادہ و رنگین ہے اور اُن کی تصانیف و تراجم اور متفرق نگارشات کا دائرہ بھی اتنا وسیع ہے کہ ان پر کئی پہلوؤں سے تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔ مستقبل کا مورخ جب ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست و ثقافت اور افکار و اقدار کی تاریخ لکھنا چاہے گا تو اُسے سب سے زیادہ مواد مولانا دریابادی کی تحریروں میں ملے گا۔

عبد اللطیف اعظمی

مولانا عبدالماجد دریابادی کی

ادبی خدمات

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے بہ یک وقت علم وادب، تنقید وصحافت اور علوم اسلامی وتفسیر قرآنی کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا شبلی اسکول سے گہرا تعلق تھا۔ وہ شبلی کے باضابطہ شاگرد تو نہیں تھے، مگر نہ صرف ان سے ایک عقیدت مند شاگرد کی طرح علمی استفادہ کیا، بلکہ سیرت وشخصیت سے بہت زیادہ اثر قبول کیا اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علم وادب اور مذہب وصحافت کی خدمت کا بے پایاں جذبہ بڑی حد تک ان ہی سے حاصل کیا۔ میں نے سنا ہے کہ علامہ شبلی کے کمرے پر ایک تختی لگی رہتی تھی، جس پر لکھا ہوتا تھا کہ اتنے بجے سے اتنے بجے تک براہ کرم کوئی صاحب ملنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ اس کی وجہ سے علمائے کرام کو بہت سخت شکایت تھی اور کیوں نہ ہوتی، ان کے لیے یہ ایسی "بدعت" تھی جسے آسانی سے گوارا نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن اگر شبلی ایسا نہ کرتے تو علم وادب اور تعلیم ومذہب کی جو بے مثال خدمت انجام دی ہے، اس کا تہائی اور چوتھائی بھی انجام نہ دے پاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو بھی کوئی مفید کام کرنا چاہتا ہو تو اسے خود اپنے اوپر اور دوسروں پر کوئی نہ کوئی پابندی تو عائد ہی کرنی پڑے گی۔ چنانچہ مولانا ماجد صاحب مرحوم نے بھی کچھ اسی قسم کے ضابطے مقرر کیے تھے۔ میرے ہم وطن دوست سید علی جواد زیدی نے، مولانائے مرحوم کی زندگی ہی میں لکھا تھا:

"اعتدال پسندی ہی نے مولانا کو اوقات کا بے حد پابند بنا دیا ہے، روزانہ

کے معمولات میں کبھی فرق نہیں آنے دیتے۔ زندگی بھر علمی اور ادبی مشاغل ہی سے سروکار رہا، اس لیے خانہ نشینی اور تنہائی پسندی بھی جزو طبیعت بن گئی۔ اس گوشہ گیری میں اُس تصوف کو بھی دخل ہے جو بقول مولانا کے، زمانۂ جاہلیت کے دورِ الحاد کے بعد داخل مزاج ہو کے دو آتشہ ہو گیا ہے۔ لیکن خانہ نشینی کے بعد بھی اپنے بچوں تک کو مولانا نے یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ ان کے نظام الاوقات میں مداخلت کر سکیں۔ اہل خانہ کے لیے بھی وقت مقرر ہے اور ہم وطنوں کے لیے بھی۔ جب وہ صبح کے وقت خطوط کے جوابات لکھ رہے ہوں، یا تصنیف و تالیف و تفسیر کے اہم کام میں مشغول ہوں تو اس وقت وہ کسی کی شرکت گوارا نہ کرتے۔ علم و ادب، اخلاق و مذہب کی محفل میں مولانا خلوت چاہتے ہیں۔ جب انسانوں اور فرشتوں کی سجدہ گاہ میں مراقبہ اور مکاشفہ کا عالم ہوتا ہے، اس وقت کسی کا درانہ یا بے ادبانہ داخلہ اُس حسن و لطف کی فضا کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ ان محفلوں میں جو لوگ ساز بدست آنا چاہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ شاید ان کی حق تلفی یا ان کے ساز کی توہین ہو رہی ہے۔ مولانا کی نظم پسندی ان کو یہ تعلیم دینا چاہتی ہے کہ ایک ہی ساز ایک محفل کے ماحول سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور دوسری محفل میں بے آہنگ۔" لہ

نظم و ضبط کی اس پابندی ہی کا نتیجہ ہے کہ، علامہ شبلی کی طرح مولانا دریابادی نے بھی علم و ادب کا دامن قیمتی موتیوں سے بھر دیا۔ ان کی تحریروں اور کتابوں کے موضوعات کثیر النوع اور کثیر الجہت ہیں اور جس پر بھی لکھا، اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ اعظم گڑھ ہی کے ایک مشہور دانشور اور ممتاز تنقید نگار، پروفیسر سید احتشام حسین رضوی ماہلی لکھتے ہیں:

"اردو میں شاذ و نادر ہی ایسے ادیب ہوں گے جو قرآن و حدیث، تصوف و اخلاق، فلسفہ و نفسیات، سوانح و سیرت، سفرنامہ اور ڈائری، سیاسی موضوعات اور سماجی مسائل، شاعری اور تخلیقی نثر، افراد اور تحریکات کے متعلق بے تکلفی اور ادبی لطافت کے ساتھ اظہارِ خیال میں تازگی، لطفِ زبان، نشتریت اور بلاغت بھی ہو، یہ ساری خوبیاں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔" ٢ھ

لطف یہ ہے کہ ان مختلف، بلکہ کہنا چاہیے کہ متضاد موضوعات پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، محض خانہ پری کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ سب کا سب معیاری، قابل قدر اور اردو ادب میں قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتا ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام کمیت و کیفیت کے لحاظ سے اتنا اہم اور مباحث اور معلومات کے نقطۂ نظر سے اس قدر وسیع اور ہمہ جہت ہے کہ کسی ایک شخص کا کارنامہ نہیں معلوم ہوتا اور بقول مولانا غلام رسول مہرؔ:

"مولانا عبدالماجد کی ذات گرامی سے اردو کو اتنا فائدہ پہنچا کہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی بڑی جماعت بھی اس زبان کا دامن گراں بہا جواہر پاروں سے اس پیمانے پر شاید ہی بھر سکتی، جس پیمانے پر مولانا عبدالماجد نے بھرا۔" ۵۳

مولانا نے اپنی ابتدائی زندگی میں فلسفیانہ موضوعات پر جو کتابیں لکھی یا ترجمہ کی ہیں اس لحاظ سے ان کی بڑی اہمیت ہے کہ اردو زبان و ادب کا دامن ایسی ٹھوس اور مفید کتابوں سے خالی ہے، لیکن چونکہ، خیالات میں انقلاب آجانے کے بعد، ان کو اپنی تصنیفات سے خارج کر دیا ہے، اس لیے ان کے بارے میں کچھ عرض کرنا یا ان کو ان کے علمی کارناموں میں شمار کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ لہٰذا ان کے علاوہ مرحوم کی دوسری کتابیں، مثلاً ارض القرآن، تصوف اور اسلام، بشریت انبیاء، تمدن اسلام، نشریات ماجدی، خطبات ماجدی، (سیرت نبوی قرآنی پر نو لکچروں کا مجموعہ) انشائے ماجد، محمد علی (ذاتی ڈائری کے چند ورق دو حصے) سچی باتیں، اردو کا ادیب اعظم (مولانا ابوالکلام آزاد کے حسن انشا اور مرقع سیرت پر ایک نظر)، تفسیر ماجدی اور خطوط ماجدی وغیرہ۔ اپنے اپنے موضوعات اور مواد کے لحاظ سے یہ سبھی اپنی اپنی جگہ پر قابل قدر اور قابل تعریف ہیں، مگر ایک خصوصیت ان سب میں مشترک ہے اور وہ ہے ان کا ادبی حسن، جس میں مولانا کے خصوصی اور انفرادی اسلوب نگاری کی وجہ سے ان کی دلآویزی اور دلکشی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔

بہت سے ادیب اور دانشور کتابیں لکھ کر اپنی لازوال شہرت اور دائمی زندگی کا انتظام کر لیتے ہیں۔ کچھ ادیب اور دانشور ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے قلم کی مسیحائی سے دوسروں کو حیات جاوید بخش دیتے ہیں۔ مولانا ماجد مرحوم اسی آخر الذکر ادیبوں سے

تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے جس شخص پر قلم اٹھایا اسے زندہ جاوید بنا دیا اور جس موضوع پر لکھا، اسے لازوال شہرت عطا کر دی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کو لے لیجیے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ عظیم آدمی تھے، برصغیر ہند و پاک کے صف اول کے رہنما تھے اور ان کی قومی اور ملی خدمات کسی کی ستائش یا کسی کے قلم کی محتاج نہیں تھیں، مگر ان کی بے لوث خدمت، مخلصانہ ایثار اور بے مثال قربانیوں نے لوگوں کو مجبور کیا کہ ان پر لکھنے کے لیے قلم اٹھائیں اور دلی خراج عقیدت ادا کر کے ان کی عظیم خدمات کا اعتراف کر کے اپنا فرض ادا کریں۔ مولانا محمد علی مرحوم پر سب سے پہلی کتاب "سیرت محمد علی" جامعہ ملیہ سے شائع ہوئی ہے اور مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے مشورے اور ان کی ہدایت پر اس کتاب کا کام جامعہ کے سابق طالب علم مولانا سید رئیس احمد جعفری ندوی مرحوم کو دیا گیا تھا، انھیں مولانا محمد علی سے دلی عقیدت تھی، اس لیے بڑے شوق و ذوق سے لکھا اور بقول مولانا دریابادی:

"بہر کیف و بہر حال چند ماہ کی مختصر مدت میں شوق و عقیدت کے جذبات اپنے نقوش جو کاغذ کے دامن پر پھیلا سکتے تھے وہ حاضر خدمت ہیں، یہ "لخت دل" ہیں، ان پر "مال تجارت" کا دھوکہ نہ ہو۔" ۵۷

لیکن خود مولانا دریابادی ہی کے الفاظ میں:

"ضرورت تھی کہ اچھے جید اہل قلم اور پختہ کار مصنفین کی پوری جماعت ترتیب سوانح کا کام ہاتھ میں لے اور وہ بھی فی الفور نہیں، ایک عرصے تک تلاش و تفحص جاری رکھنے کے بعد اپنی فکر و کاوش کے نتائج ایک نہیں کئی ضخیم مجلدات میں مرتب کر کے شائع کرتی۔" ۵۸

مولانا محمد علی کی وفات کو انسٹھ (۵۹) سال سے ایک دو ماہ زیادہ ہو گئے، اس عرصے میں مولانا دریابادی کی خواہش یا توقع کے مطابق متعدد "ضخیم مجلدات" تو شائع نہیں ہوئیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ بہت کچھ لکھا گیا، خاص طور پر مولانا کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر متعدد سمینار ہوئے، بہت سے موقر رسالوں نے خصوصی شمارے نکالے۔ خود راقم الحروف نے رسالہ جامعہ کے دو نمبر شائع کیے اور انھیں کے مضامین کی بنیاد پر ایک کتاب بھی شائع

کی۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ اس طویل عرصے میں، مولانا دریابادی کے معیار اور نقطۂ نظر کے مطابق کوئی چیز شائع نہ ہوسکی۔ اگر مختلف تحریروں اور کتابوں کے ذریعہ کسی نے مولانا کو زندہ رکھا ہے تو وہ مولانا ماجد صاحب مرحوم کی ذات گرامی ہے۔ خاص طور پر ان کے اسلوب خاص کی دل کشی اور جاذبیت نے۔ اگرچہ لفظ "ڈائری" سے ذہن وہ اثر قبول نہیں کرتا جو کسی بھرپور اور محققانہ سوانح حیات یا سیاسی و ادبی یا مذہبی خدمات جیسے مرعوب کن الفاظ سے لوگ متاثر ہوتے ہیں، لیکن یقین مانیے کہ مولانا ماجد میاں نے "ذاتی ڈائری کے چند ورق" میں جو کچھ لکھ دیا ہے، وہ متعدد مجلدات پر بھاری ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم علامہ اقبال کو ان کی زندگی ہی میں، سیاسی نقطۂ نظر سے "مرحوم" کہا کرتے تھے، مگر جب ان کی فارسی اور اردو کی نظمیں پڑھتے تو ان پر وجد طاری ہو جاتا اور اسی کے ساتھ بے تحاشا آنسو جاری ہو جاتے۔ کچھ ایسا ہی حال مولانا دریابادی کی اس کتاب کا بھی ہے، انھوں نے مولانا محمد علی پر کچھ ایسی عقیدت سے لکھا ہے کہ پڑھنے والا چاہے مولانا محمد علی کا عقیدت مند ہو یا نہ ہو اور چاہے وہ مولانا دریابادی مرحوم کا مخالف ہی کیوں نہ ہو، مگر جب وہ مولانا کی ذاتی ڈائری کے یہ چند ورق پڑھتا ہے تو بلا قصد و ارادہ، جذبات سے مغلوب ہو کر جھوم اٹھتا ہے۔ اس قسم کے اقتباسات تو بہت سے پیش کیے جا سکتے ہیں، مگر طوالت کے خوف سے صرف دو مختصر اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔ ایک کا تعلق ان کی سیاسی خدمات سے ہے اور دوسرے کا تعلق ان کی شاعری سے ہے، ملاحظہ ہوں:

> "ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی، جس کی آواز مشرق نے بھی سنی اور مغرب نے بھی اور جنوب نے بھی۔ ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی لہروں نے بھی، پڑھے لکھوں نے بھی اور ان پڑھوں نے بھی، عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی، شہر کے مہذبوں نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے بھی۔ وائسریگل لاج کی چمکتی اور جگمگاتی ہوئی برجیوں نے بھی اور جیل خانے کی تنگ و تاریک کوٹھریوں نے بھی، راجوں اور مہاراجوں کے قصر و ایوان نے بھی اور فاقہ کشوں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں نے بھی۔"

اب دوسرا اقتباس سنیے جو پہلے اقتباس ہی کا ایک حصہ ہے اگر اس کا تعلق مولانا کی شاعری سے ہے:

"اس کا کلام سن سن کر ڈرائنگ روم کے کوچ اور صوفے کھلکھلا کر ہنسے، اس کا پیام سن کر مسجد کے محراب و منبر بلبلا بلبلا کر روئے، خانقاہیں، مدرسے، پارک اور نشاط خانے، کھنڈر، ویرانے، "قوم پروروں" کی کانگریس اور "ملت پروروں" کی کانفرنس، پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل اور علی گڑھ، جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، سب کے چپے چپے پر اس کے نقش قدم کے نشان، سب کا ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز۔ معاصر اور حریف بہت سے تھے، یہ قبولِ خدا اور مرجعیتِ تام کی دولت سے وہی ایک ممتاز۔ یہ سعادت زور بازو کا نہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ" ؎۲

بات بڑھنے کا ڈر تو ہے، لیکن ایک اقتباس مولانا حالی کی شاعری کے بارے میں بھی سن لیجیے۔ مولانا حالی کا معاملہ مولانا محمد علی سے بالکل مختلف تھا۔ انھیں عالم گیر شہرت حاصل تھی اور رفقائے سرسید میں ایک بلند اور ممتاز مقام حاصل تھا، مگر ان کی غزلوں کے بارے میں لوگوں کی رائے اچھی نہ تھی، ان کا نام سنتے ہی اچھے اچھے نقاد، حتیٰ کہ حالی پرست بھی ناک بھوں چڑھاتے اور سمجھتے تھے کہ ان مولوی صاحب کو حسن و عشق اور تغزل سے کیا واسطہ، ان کا پختہ خیال تھا کہ وہ ایک اچھے اور بلند پایہ نظم گو شاعر ہیں، مگر غزل سے ان کو کیا تعلق؟ ان تنقید نگاروں کا خیال ہے کہ مولانا نے جو غزلیں کہی ہیں ان میں نہ تو جذبات کی فراوانی، نہ امنگ، نہ جوش، نہ تازگی، نہ حسن و عشق کی چاشنی، بس ایک مولویانہ وعظ ہے۔ بعض حضرات نے اسی نقطۂ نظر سے پیروڈی بھی کہی ہے، جس میں انھوں نے مولانا کی غزلیہ شاعری کا مذاق اڑایا ہے۔ اس سلسلے میں اگر کسی نے مولانا حالی کی غزلوں کے بارے میں لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، ان میں مولانا ماجد صاحب مرحوم کو امتیاز حاصل ہے۔ مولانا کے مضمون کا عنوان ہے "اردو کا ایک واعظ شاعر" مولانا حالی کے مشہور شعر

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

پر اپنے مخصوص اسلوب میں تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے مولانا دریابادی فرماتے ہیں:

"ہائیں یہ کیا ارشاد ہوا؟ کہاں مولوی حالی اور کہاں یہ شعر! بے چارے ایک سیدھے سادے واعظ قسم کے آدمی، روکھے پھیکے اشعار کے ناظم، انھیں غزل اور پھر غزل کے کسی پھڑکتے ہوئے شعر سے مناسبت کیا؟ شعر کے سارے تیور استاد غالبؔ کے' تخیل وہی، بندش وہی، زبان وہی، حالی کے کلام میں نہ حسنِ بیان، نہ لطف بیان' نہ روح، نہ جان، نہ تخیل میں رعنائی، نہ طرزِ ادا میں زیبائی، غرض دل نے کچھ جھنجھلا کر اور کچھ خفیف ہو کر یہ ساری جرحیں کر ڈالیں لیکن حقیقت بہر حال حقیقت رہتی ہے۔

دیوان اٹھا کر دیکھا تو غزلیات کی ردیف دال میں شعر اپنی جگہ پر موجود۔" ۵۲

مولانا آزاد کے معتقدین میں مشہور تھا کہ مولانا ماجد مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد کے شدید ترین مخالفین میں سے ہیں، یہاں تک کہ ان کی دلآویز شخصیت، ان کی عظمت اور قومی و ملی خدمات کو تسلیم نہیں کرتے۔ نہ جانے کیوں مولانا مجھ جیسے حقیر پر بہت زیادہ مہربان تھے۔ مجھے یقین ہے کہ میری بعض سیاسی اور مذہبی رایوں اور تحریروں سے ان کو ضرور اختلاف رہا ہوگا، مگر پھر بھی وہ مجھے عزیز رکھتے تھے اور ازراہِ کرم میرے خطوط کے جوابات میں اپنی محبت اور شفقت کا ہمیشہ اظہار کرتے۔ ایک مرتبہ جامعہ تشریف لائے تو ان سے دیر تک مختلف مسائل پر بات چیت ہوئی۔ جامعہ ملیہ کے علاوہ گفتگو کا ایک موضوع مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ مولانا دریابادی کا ایک بنیادی نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہر بڑے سے بڑے آدمی کا ہر دور یکساں نہیں ہوتا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر مولانا آزاد سے مجھ کو کچھ اختلاف ہے تو ان کے ابتدائی دور سے ہے۔ لیکن انھوں نے ادب و مذہب اور قوم و ملک کی جو بے لاگ اور بے مثال خدمت کی ہے، اس کا میں نے ہمیشہ کھل کر اعتراف کیا ہے۔ مولانا نے اپنے ہفتہ وار اخبار "صدق جدید" کے مختلف شماروں میں مولانا آزاد پر جو کچھ لکھا ہے، ان سب کو مولانا آزاد کے ایک پاکستانی عقیدت مند، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے جس کا نام ہے "اردو کا ادیب اعظم" (مولانا ابوالکلام آزاد کے حسن انشا اور مرقع سیرت پر ایک نظر) فاضل مرتب نے اس کتاب کے پیش لفظ میں دونوں بزرگوں یعنی مولانا آزاد اور

مولانا دریابادی کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے کے بعد لکھا ہے:

"ادب و انشا، صحافت و سیاست، مذہب و فلسفہ کا ذوق دونوں میں مشترک تھا۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں:

"اس اشتراک ذوق و عمل کے باوجود خصائص میں پہچان دونوں کی الگ الگ تھی۔ دونوں کے مزاجوں میں بھی نمایاں فرق تھا۔ کئی مذہبی اور سیاسی مسائل میں دونوں کا انداز فکر مختلف اور پسند جداگانہ تھی۔ مولانا آزاد اپنا ایک مستقل نظامِ فکر رکھتے تھے، جبکہ مولانا دریابادی سیاست میں مولانا محمد علی اور مذہب میں مولانا اشرف علی تھانوی کے نظامِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا آزاد سے مولانا محمد علی معاصرانہ چشمک رکھتے تھے اور حضرت تھانوی سے مولانا آزاد کا اس درجہ تجاہل کہ ہزاروں صفحوں میں پھیلے ہوئے رسائل و کتب سے اگر حکیم الامت کے وجود کا ثبوت ڈھونڈھا جائے تو نہ ملے۔ دونوں بزرگ دو الگ دنیاؤں کے باسی تھے۔ اس پس منظر میں دونوں میں لگاؤ کے بجائے لاگ کا تعلق اور ربط و اخلاص کی جگہ چشمک ہوتی تو تعجب نہ تھا، لیکن مولانا دریابادی معترف ہیں کہ مولانا آزاد کی جانب سے کبھی تنگ دلی کا اظہار نہیں ہوا۔ مولانا دریابادی کے کسی عزیز و معتقد کا شکوہ بھی سننے میں نہیں آیا۔" ۵۵

میرے خیال میں ایک ادیب و عالم کی حیثیت سے مولانا دریابادی مرحوم کی یہ رواداری اور کشادہ دلی، ان کے اخلاص اور علمی و مذہبی دیانت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا دریابادی کو مولانا آزاد کے مقابلے میں مولانا محمد علی مرحوم سے، بوجوہ، زیادہ گہرا اور پائدار تعلق تھا اور ان سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مولانا آزاد کی عظمت کے اعتراف اور ان کی ملکی و ملی خدمات کی تعریف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اس کے ثبوت میں مولانا دریابادی کا صرف ایک اقتباس پیش کر دینا غالباً کافی ہو گا۔ ملاحظہ ہو:

"جن لوگوں نے مولانا کو بہ ایں سنجیدگی و وقار ان کی زندگی کے آخری ۲۵۔۳۰

سال میں دیکھا ہے، وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء میں کیا تھے۔ (اور اس سے بھی قبل یعنی اپنی بھرپور جوانی نہیں، بلکہ آغازِ جوانی کے سن میں کیا تھے، اسے بھی چھوڑیے۔) ذہانت و فطانت کا مجسمہ، شوخی و بذلہ سنجی کا مرقع۔ حاضر جوابی میں طاق، لطیفہ گوئی میں استاد۔ اسے چھیڑا، اُسے بنایا، اِس پر فقرہ چست کیا، اُسے چٹکیوں میں اڑایا۔ لوگ تنہا ملتے جلتے، سامنا کرتے گھبراتے، ہچکچاتے اور کنّی کاٹ جاتے۔ ۱۹۱۳ء کا آخر تھا یا ۱۹۱۴ء کا شروع، لکھنؤ میں کھانے پر بلانے کو تو بلا دیا، لیکن فکر یہ ہوئی کہ اتنی دیر مسلسل ہدف ان حضرت کے گرما گرم فقروں کا کون بنا رہے گا؟ اپنے جوار میں ایک بڑے طرّار، شوخ گفتار، طلق اللسان، خوش بیان، ادیب، ظریف چودھری محمد علی رودولوی تھے۔ ۔ ۔ ۔ بس انھیں کو گھیر گھار کر لے آیا گیا اور ہم تماشائیوں کو لطف، مہذب و شستہ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور برابر کی نوک جھونک کا آتا رہا۔ چودھری صاحب نے کہیں اپنے حلقۂ ظرافت کی اصطلاح "بور" (BORE) چالو کی۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ کی تعریف؟ چودھری صاحب بولے: بور مردے ست کم عقل کہ بے ارادہ دیگراں را مکلّف باشد۔ مولانا نے داد دی کہ سبحان اللہ! تعریف کے لیے آپ نے خاص غیاث اللغات کی استعمال فرمائی۔" ۹

مولانا آزاد ہی کے بارے میں ایک اقتباس اور پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جس سے ان کی سیرت، حسنِ اخلاق، انکسار و تواضع، شرافت نفس اور عالی ظرفی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

"۱۹۴۸ء تھا کہ آل انڈیا مشورتی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے دہلی جانا ہوا۔ مولانا اُسی تپاک اور گرم جوشی سے ملے، جیسے پہلے کسی زمانے میں ملتے تھے۔ وزارتِ ہند کی اونچی کرسی کوئی فرق اس میں پیدا نہ کر سکی۔ دوپہر کے لنچ پر بلایا اور اسی روز پشاور کے خان عبدالغنی (فرزند خان عبدالغفار) بھی مدعو تھے۔ ملاقاتوں اور گفتگوؤں میں وہی زور شور، وہی طلاقت لسانی، وہی جامعیت و ہمہ گیری سننے والا حیران و ششدر، خوش خلقی، انسانی ہمدردی، مرنجاں مرنجی میں پہلے سے

کہیں آگے بڑھے ہوئے، تعلّی و ترفع کے بجائے پیکرِ تواضع بنے ہوئے، شرافت نفس اور عالی ظرفی کا یہ عالم کہ اپنے مخالفین، خصوصاً مسلم لیگ کے لیے گلہ شکوہ کا شائبہ بھی زبان پر نہیں، سب کا ذکر یکساں خوش دلی سے، بلکہ پاکستان کے حق میں بجائے شکایت و شماتت، طنز و تعریض کے الٹا کلمۂ خیر... سیاسی لیڈروں میں اس ظرف کی مثال نادر ہی ملے گی۔"[10]

مولانا عبدالماجد دریابادی کی ادبی خدمات پر گفتگو ہو اور ان کی ظرافت اور شوخیِ کا ذکر نہ ہو، اس کے بغیر کوئی گفتگو یا تحریر نامکمل رہے گی۔ وہ اس میدان کے مرد تھے او ایسے مرد کہ پورے اردو ادب میں ان کے منفرد اسلوب اور خصوصی فن کا جواب بہ مشکل ہی مگر یہ گفتگو بہت دراز ہو جائے گی، اس لیے اس کو نظرانداز کر کے، ان کی ایک اور خصوصیہ کا ذکر کر کے اس مقالے کو ختم کرتا ہوں۔

مولانا کی زندگی کا آخری کارنامہ قرآن حکیم کا ترجمہ اور اس کی تفسیر ہے، جو اردو ا انگریزی دونوں زبانوں میں ہے۔ یہ موضوع میرے مقالے کے حدود سے باہر ہے۔ مگر ا ترجمے کی ایک بہت اہم خصوصیت زبان کی سادگی اور اس کا ادبی حسن ہے، اس لیے ایک خاص مقصد سے اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

اردو میں قرآن مجید کے بہت سے ترجمے ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات ہیں اور ہر ترجمے کی زبان معیار، اسلوب اور سادگی کے لحاظ سے مختلف مگر مولانا ماجد صاحب مرحوم کے ترجمۂ قرآن کی سب سے بڑی خوبی، میرے خیال میں زبا کی سادگی اور اسلوب کی دل کشی ہے۔ اردو بائیبل کی سب سے بڑی خوبی یہ بیان کی جا ہے کہ اس کی زبان بہت ہی سادہ، عام فہم اور دل کش ہے۔ تقریباً یہی خصوصیت مولانا صاحب کے ترجمۂ قرآن کی ہے۔ اس سلسلے میں دو نمونے پیش کرتا ہوں۔

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۶۸ حسب ذیل ہے:

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ ج وَاللّٰهُ
يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

مولانا دریابادی مرحوم نے اس آیت کریمہ کا حسب ذیل ترجمہ کیا ہے:

"شیطان تمھیں تنگ دستی سے ڈراتا ہے اور تمھیں بخل کا حکم دیتا ہے اور اللہ تمھیں اپنی طرف سے بخشش اور فضل کا وعدہ دیتا ہے اور اللہ کشائش والا، علم والا ہے۔" لے

دوسری آیت کریمہ ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ (سورہ انعام آیت نمبر ۱۰۹)

مولانا دریابادی کا ترجمہ:

"اور تم لوگ بُرا نہ کہو، جن کو وہ پکارتے ہیں اللہ کے سوائے کہ وہ بُرا کہہ بیٹھیں اللہ کو بے ادبی سے نہ سمجھ کر۔" لے

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے ترجمۂ قرآن کی زبان بھی بہت آسان اور عام فہم سمجھی جاتی ہے۔ ان دونوں آیات کریمہ کا انھوں نے جو ترجمہ کیا ہے، وہ بھی ملاحظہ ہوں۔

پہلی آیت کا ترجمہ:

"شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرز عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمھیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔" (تلخیص تفہیم القرآن، صفحہ ۸۹)

دوسری آیت کا ترجمہ:

"(اے مسلمانو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔"

(سابق حوالہ، صفحہ ۱۰۸)

ان دونوں ترجموں کو دیکھ کر آسانی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کون زیادہ عام فہم، رواں اور دل نشیں ہے۔

اب میں اپنے اس مقالے کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ایک مضمون کے اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔ یہ اقتباس میں نے ایک ہفتہ پہلے درج کیا تھا، مگر آج افتتاحی اجلا

لے عبدالماجد دریابادی نمبر ۲

میں، مولانائے محترم کی عدم موجودگی میں ان کا جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا گیا تھا، اس
نے بھی اس اقتباس کو نقل کیا ہے، گویا ان کے نزدیک بھی مولانا دریابادی کی خصو
اس مختصر اقتباس میں بہترین نمایندگی کی گئی ہے۔ مولانا علی میاں فرماتے ہیں :

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے زمانے کی نادرہ روزگار اور صاحبِ کمال شخصیتوں میں سے ہیں۔ ایک ادیب و صاحبِ قلم کی حیثیت سے بھی، قرآن کے ایک مفسر و خادم کے لحاظ سے بھی، قدیم وجدید کے ایک جامع عالم کے طور پر بھی اور اپنے وقت اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور پہچاننے والے انسان کی حیثیت سے بھی، ایک کہنہ مشق صحافی اور ایک صاحبِ طرز ناقد و طنز نگار کی بنا پر بھی، وہ ہر طرح قابل قدر اور اعزاز کے مستحق ہیں۔" ۱۳ے

حوالہ جات :

۱۔ سید علی جواد زیدی، "آپ سے ملیے" مطبوعہ دہلی۔ اپریل ۱۹۶۳ء۔ صفحات: ۵
۲۔ سید احتشام حسین رضوی مابلی، فروغ اردو (لکھنؤ) عبدالماجد دریابادی نمبر۔ مضمون
عبدالماجد کی تنقید نگاری۔ صفحات: ۹۷۔ ۹۸
۳۔ غلام رسول مہر، فروغ اردو۔ ماجد نمبر صفحہ: ۴۴
۴۔ مولانا عبدالماجد دریابادی: "محمد علی" (ذاتی ڈائری کے چند ورق) حصہ دوم۔ مطبو
۱۹۵۶ء۔ صفحہ: ۲۱۰۔ ۵۔ ایضاً، صفحہ ۲۰۹۔ ۶۔ ایضاً، صفحہ: ۱۰۴۔ ۷۔ ایضاً۔
۸۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری: "اردو کا ادیب اعظم" (مولانا ابوالکلام آزاد کے حس
اور مرقع سیرت پر ایک نظر) دیباچہ۔ صفحہ: ۸
۹۔ مولانا عبدالماجد دریابادی: "اردو کا ادیب اعظم" صفحہ ۱۸۔ ۱۰۔ ایضاً صفحہ ۲۱
۱۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی: "سچی باتیں" (مرتبہ، حکیم ہلال اکبرآبادی) مطبوعہ کراچی، دو
اگست ۱۹۶۲ء، صفحہ ۱۶۔ ۱۲۔ ایضاً صفحہ ۱۴۔ ۱۳۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: فروغ اردو، ماجد

ٹر شجاعت علی سندیلوی

مولانا عبدالماجد دریابادی کی نظر میں

مولانا حالی کی شاعری

(غزل اور مسدس)

مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہمہ جہت و ہمہ گیر علمی و ادبی، اسلامی و مذہبی، سماجی و
جی، قومی و ملکی کارناموں اور فلسفہ و نفسیات، علم کلام و منطق جیسے ادق اور وسیع علوم پر
ی قدرت کاملہ کا احاطہ کرنا مجھ جیسے ناآشنائے علم و ادب کے لیے کیا بڑے سے بڑے
وروں کے لیے بھی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ وہ بیک وقت بے مثل ادیب،
ر صحافی، شگفتہ نگار نقاد و محقق، بالغ نظر فلسفی و سوانح نگار، صاحب طرز طنز نگار،
ل مفسر قرآن اور سخن سنج و سخن فہم تھے۔ ان کو ماضی کی صالح روایات، عصری رجحانا
ں اور معاشرے کے حالات اور زندگی کے مسائل و معاملات کو سمجھنے اور زمانے کے
ض کو پہچاننے اور ان سب کو شستہ و شگفتہ اور دل نشیں انداز میں بیان کرنے پر قدرت
ر حاصل تھی۔ مشرقی اور مغربی ادب پر انھیں پوری دسترس تھی، قدرت نے ان کو
ی فیاضی کے ساتھ ذہن رسا، فکر بلند، بہترین حافظہ، ذوق ادب و شعور عطا کیا تھا۔
فیسر احتشام حسین کے الفاظ میں:

"اردو میں شاذ و نادر ہی ایسے ادیب ہوں گے جنھوں نے قرآن و حدیث، تصوف و اخلاق، فلسفہ و نفسیات، سوانح و سیرت، سفرنامے اور ڈائری، سیاسی موضوعات اور سماجی مسائل، شاعری اور تخلیقی نثر، افراد اور تحریکات

کے متعلق بے تکلفی اور ادبی لطافت کے ساتھ اس طرح اظہار خیال کیا ہو جس میں تازگی، لطف زبان، نشتریت اور بلاغت بھی ہو۔ یہ ساری خوبیاں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے جتنا اور جو کچھ لکھا ہے، غور و فکر کے پیمانے میں ڈھال کر لکھا ہے یا قلم برداشتہ لکھا ہے یا فرمائش پر لکھا ہے یا کسی مخصوص تخلیقی جذبے کے تحت سب میں ایک ادبی آن اور حسین اسلوبی شائستگی نظر آتی ہے۔ یہ قدرت ہر صاحب قلم میں نہیں ہوتی کہ وہ مختلف موضوعات کے لیے مناسب زبان استعمال کرے۔ لیکن ہر ایک کے اندر ایک ایسا آہنگ بھی موجود ہو جو اسلوب اور طرز ادا کی پہچان بن جائے۔"[1]

شعر و سخن کے نکتہ داں، علم وفن کے رازداں اور پیکر فضل وکمال کی زبان وبیا
اور اسلوب میں انفرادیت اور دلکشی کا ہونا لازمی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ عبدالماجد دریابادی کو اسلوب بیان کی لطافتوں، نزاکتو
اور باریکیوں سے بخوبی واقفیت تھی۔ وہ ہر موضوع کو زبان کی لطافت، بیان کی طہا
اور خیالات کی وسعت کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کی دلکش تصویر آنکھ
کے سامنے آجاتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا، معمولی سے معمولی یا بڑے سے بڑا اور خش
مشکل کوئی موضوع ہو۔

"مولانا کے قلم سے چھو کر رنگین اور شگفتہ بن جاتا ہے۔ اسلوب کی یہی ادبیت ہے جو کسی منزل پر ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی، معاصرانہ چشمکوں میں یہی اسلوب اپنی سادگی اور وقار کے ساتھ تیر و نشتر بنتا ہے اور تعزیت کے پیاموں میں آنسو اور مرہم، سفرناموں اور ڈائریوں میں اسی سے مصوری ہوتی ہے اور مذہبی مقالات میں عقیدے کی گرمی سے تابناکی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ان سب کے اندر ایک ہی روح کارفرما ہے۔ ایک خاص طرح کی تنقیدی بصیرت جو تاثراتی

---

[1] فروغ اردو، عبدالماجد دریابادی نمبر ص ۹۸

اور شخصی ہوتے ہوئے بھی استدلالی رنگ رکھتی ہے۔ اپنی بات کہنے کے جوش میں حقائق کو نظرانداز نہیں کرتی اور جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس کے اخلاقی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے بھی تخلیق کے ادبی جمالیاتی حسن پر بھرپور نگاہ ڈالتی ہے۔"

اخلاقی پہلوؤں اور تخلیق کے ادبی جمالیاتی حسن کی مصوری کا کمال دیکھنے کے لیے زہرِ عشق اور امراؤ جان ادا پر مولانا کی گل افشانی تحریر اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی تاثراتی اور شخصی تنقید کا کمال اکبرؔ، حالیؔ، شبلیؔ، محمد علی جوہرؔ وغیرہ کی تخلیقات میں نمایاں ہے۔ اس میں عقیدت اور تنقید، جذبہ اور ذہن سب ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ ان بزرگوں میں مولانا حالیؔ کی شاعری خصوصاً غزل اور مسدس کی سب سے زیادہ مخالفت ہوئی۔ اودھ پنچ اور اس کے مضمون نگاروں نے پانی پت کا میدان پائمال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مخالفت کا ایک طوفان تھا جو لکھنؤ سے تو شروع ہوا لیکن اس کے اثرات پورے شمالی ہند پر پڑے۔ ادبی دنیا کو یہ یقین ہو گیا کہ حالی کی شاعری، روکھی پھیکی، پست اور بے معنی اور اغلاط سے پُر ہے۔ مولانا عبدالماجد بھی یہی خیال یقین کی حد تک رکھتے تھے۔ وہ حالی کو سیدھا سادہ آدمی، روکھے پھیکے اشعار نظم کر دینے والا شاعر جانتے اور سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں:

"حالیؔ کی ترکیبیں بھی بودی اور بندشیں تک پھُس پھُسی تھیں۔"

لیکن اس کو اتفاق کہیے یا حالیؔ کی شاعری کی خوش قسمتی کہ ایک روز الہلال کے کسی مقالے کے ذیل میں یہ شعر ان کی نظر سے گزرا

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

اس شعر نے ان کے دل و دماغ پر کیا اثر کیا انھیں کی زبان سے سنیے:

"پڑھتے ہی طبیعت بے چین ہو گئی۔ لطف لے لے کر خدا جانے کتنی بار پڑھا۔ درج صرف شعر تھا، شاعر کا نام نہ تھا۔ دل نے کہا اور اس کہنے میں کچھ بھی سوچ بچار کی ضرورت نہ سمجھی کہ شعر یقیناً غالبؔ کا ہے۔ یاد نہیں پڑتا نہ سہی، دیوان مطبوعہ میں موجود نہیں نہ ہو، رہ گیا ہوگا لیکن ہے شعر غالبؔ ہی کا۔ اس مسلّم استاد کے سوا اور کہہ کون سکتا ہے؟"

اس یقین کے باوجود مولانا کو (جو اس وقت زیادہ سے زیادہ چودہ پندرہ سال کے ہوں گے) شاعر کا نام معلوم کرنے کی خلش باقی رہی کہ ایک دن مولانا شبلی کی خدمت میں حاضر ہوئے ان سے مذکورہ شعر کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ شعر غالبؔ کا نہیں حالیؔ کا ہے۔

شبلی سے ملنے اور یہ معلوم ہونے کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے:

"حاضری اس درمیان میں ایک روز مولانا شبلی کے ہاں ہوئی۔ ذکر اس شعر کا آیا ارشاد ہوا کہ غالبؔ کا نہیں، مولانا حالی کا ہے۔"[۵]

مولانا سخت حیرت و استعجاب میں پڑ گئے۔

"ہائیں! یہ کیا ارشاد ہوا؟ کہاں مولوی حالی اور کہاں یہ شعر! بے چارے سیدھے سادے سے آدمی روکھے پھیکے اشعار نظم کر دینے والے، انھیں غزل کے پھڑکتے ہوئے شعر سے کیا مناسبت؟ شعر کے سارے تیور استاد غالبؔ کے، تخیل وہی، بندش وہی، زبان وہی۔ حالیؔ غریب میں نہ یہ حسن بیان، نہ یہ لطف زبان، ان کے کلام میں نہ یہ روح نہ یہ جان نہ تخیل کی یہ رعنائی، نہ طرزِ ادا کی یہ زیبائی... غرض دل نے کچھ جھنجلا کر اور کچھ خفیف ہو کر یہ ساری جرحیں کر ڈالیں لیکن حقیقت بہرحال حقیقت رہتی ہے۔"

مولانا، شبلی کے ارشاد کی صداقت سے تو انکار نہیں کر سکے، لیکن تحقیق و تنقید کا رجحان موجود تھا، اس کو اطمینان اسی وقت ہوتا جب وہ خود حالی کے دیوان میں یہ شعر دیکھ لیتا۔ غالباً نہیں یقیناً دیوانِ حالی کا مطالعہ کرنے کا محرک یہی جذبہ ہوا۔ مولانا نے دیوان اٹھا کر دیکھا تو غزلیات کی ردیف دال میں شعر اپنی جگہ پر موجود۔

---

[۵] یہ حاضری مولانا شبلی کے قیام لکھنؤ کے زمانے میں ہوئی ہوگی۔ علامہ شبلی کا انتقال نومبر ۱۹۱۴ء میں ہو گیا تھا اور وہ انتقال سے کئی سال پہلے ندوہ سے جا چکے تھے۔ اس وقت مولانا عبدالماجد دریابادی کا دورِ طالب علمی تھا ان کی عمر بھی چودہ پندرہ برس کی رہی ہوگی۔ اس عمر میں یہ ان کے ذوق ادب اور شعور اور ان کے وسیع مطالعہ کی دین ہے۔

لیکن منطقی اور فلسفی ہونے والے مولانا کو اب بھی اطمینان نہیں، متشکک فلسفی، شک وشبہ سے باز کیسے آجاتا؟ ان کا یہ خیال قائم رہا کہ:

"دو چار شعر تو ہر شاعر کے یہاں اچھے ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک شعر سے ہوتا کیا ہے؟ شعر ہو کیسا ہی بامزہ، ہے تو ایک ہی اور دو ایک بامزہ شعر کس کے ہاں نہیں ملتے؟ مشق کرتے کرتے ادنیٰ سے ادنیٰ شاعر بھی دو چار شعر تو اچھے نکال ہی لاتا ہے۔"

یہ ٹھیک بھی ہے دل میں بیٹھی ہوئی بات اور اس کی خلش جب تک وہ بالکل جھوٹ یا غلط نہ ثابت ہو جائے، کیسے نکلے؟ مولانا کو بھی یہی خیال پریشان کیے ہوئے تھا اور اسی کے پیش نظر انھوں نے 'دیوان حالی' کے اوراق الٹ پلٹ کر پڑھے کہ:

"عجب نہیں کچھ اور چیزیں بھی ہاتھ آجائیں اور یہ گھنٹہ پون گھنٹہ کی محنت رائگاں نہ جائے۔"

یہ تلاش وجستجو کی شدت اور شوق مطالعہ کی فراوانی تھی کہ پورا دیوان گھنٹہ پون گھنٹہ میں پڑھ کر قریب قریب ہر ردیف سے تقریباً ۸۰، ۸۵، اشعار کا انتخاب کر ڈالا۔ ان کے علاوہ مرثیہ حکیم محمود خاں اور کالے گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان، کا بھی انتخاب کیا اور ان سب پر تبصرہ کیا۔ اس میں عقیدت وتنقید، جذبہ اور ذہن کی ہم آہنگی اور استدلالی رنگ نمایاں ہے۔ دیوان حالی کا جوں جوں مطالعہ کرتے جاتے ہیں پردہ ہٹتا جاتا ہے اور حالی کے تغزل کی رنگینیاں ورعنائیاں فلسفی دل ودماغ کو متاثر ومبہوت کرتی جاتی ہیں اور ہر شعر "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست" کا مرقع معلوم ہوتا ہے۔

اب چند غزلوں کے کچھ اشعار کی کرشمہ سازی پر تبصروں کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت کی جاتی ہے۔ ردیف الف میں کل ۱۶، اشعار پر تبصرہ کیا ہے۔ 'کیا ہوتا' کی ردیف کی غزل کے چند اشعار مع تبصرے کے پیش کیے جاتے ہیں:

"ہم وقت وداع ان سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو، روتے بھی تو کیا ہوتا

وداع و رخصت کے بڑے بڑے رقت انگیز مضمون آپ کی نظر سے گزر چکے ہوں گے لیکن حسرت ویاس کی جو تصویر اس رونے میں نہیں ہنسی میں دکھا دی گئی ہے اس کا بھی کوئی جواب ہے؟ اور پھر فرماتے ہیں

جو جان سے در گزرے وہ چاہے سو کر گزرے — گر آج نہ تم آتے، کیا جانیے کیا ہوتا

عاشق کی جاں بازی کے افسانے بھی سب دہراتے چلے آئے ہیں لیکن اس "کیا جانیے کیا ہوتا" کے کنایہ کے اندر جو بات ہے وہ کسی تصریح کے بعد بھی پیدا ہونی ممکن ہے؟

ناصح اور عاشق کی مڈبھیڑ دنیائے شاعری کی بڑی پرانی حکایت ہے۔ حالی بھی ایک بار ملتے ہیں

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح؟ — کچھ ہم سے سُنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

حالی نہ لڑتے ہیں نہ جھگڑتے۔ ایک آہ سرد بھر کر صرف اتنا کہتے ہیں اور کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں

'کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا'

ناصح کو بے درد، بے حس سب نے مانا ہے۔ یہاں عاشق کو اپنی داستان درد کی درد انگیزی پر اس درجہ اعتماد ہے کہ اس کے خیال میں وہ ناصح کے دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پتھر آخر کیسے موم ہو کر نہ رہے گا۔ کوئی فولاد اتنا گرم ہو بھی تو"

دوسری غزل کے حسب ذیل اشعار پیش کر کے صرف ایک جملہ استفہامیہ لکھتے ہیں،

"کہیے خشک نظم نگاروں کا کلام ایسا ہی ہوتا ہے؟"

اشعار یہ ہیں:

"آتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام — گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں — طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چُبھ گئی — مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

اور آگے چلیے

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اترا   پوچھنا کیا تری زیبائی کا

بدگمانی کے لیے غیر کا سایہ پڑنا بھی کافی ہوتا ہے۔ یہاں عین بزمِ رقیب میں رونقِ محفل بنا ہوا دیکھتے ہیں اور کمالِ دلربائی یہ ہے کہ جی پھر بھی نہیں ہٹتا۔ کمال اپنا نہیں، اپنے وفورِ عشق کا نہیں تمام تر انھیں کا ہے۔ انھیں کے حسنِ بے پایاں کا۔

'پوچھنا کیا تری زیبائی کا'

گویا جمال بھی انھیں کا اور کمال بھی انھیں کا۔ غالبؔ کا مشہور مطلع ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہی زمزمہ حالیؔ کی زبان سے سنیے اور واہ واہ کرتے رہ جائیے

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں   ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

تجلیاتِ حسن کہاں نہیں۔ دکھائی نہ دیں تو قصور اپنی نظر کا ہوا یا حُسنِ نامحدود کا؟"

اس موقع پر مجھے فارسی کے ایک دو شعر یاد آگئے

ہر کس نہ شناسندۂ راز است و گرنہ   ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

اور

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم   کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

واعظ، زاہد، ناصح پر طنز کرنا، پگڑی اچھالنا شاعروں کا مسلک رہا ہے۔ حالیؔ نے بھی طنز کیا ہے لیکن متانت و سنجیدگی کے ساتھ، تمسخر و استہزا توان کی فطرت ہی میں نہیں۔ مولانا عبدالماجد نے اس قسم کی شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

"شعر تو یہ کہا ہے اور اپنی ساری متانت و ثقاہت کے باوجود حضرت زاہد کے دامن پر چھینٹے ڈالتے گئے ہیں

جانی نہ قدرِ رحمتِ حق، پارسا نے کچھ   ٹھہرا قصوروار، اگر بے قصور تھا

زاہدوں کی قسمت میں تو مزدہی مزد ہے۔ محض رحمتِ حق کا نزول ظاہر ہے کہ انھیں پر ہوگا جو اپنی سیہ کاریوں کے باعث، حق دار اس رحمت کے ذرا سے بھی نہ ہوں گے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"شوخی اور طراری درحقیقت دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ظرافت کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ اس کے ڈانڈے عریانی و فحاشی سے مل جائیں۔ حالی شریف ہیں اور متین۔ اوّل بھی متین، آخر میں بھی متین اور درمیان میں بھی متین۔ ذہانت، شوخی، ظرافت، طنز، موجود ان کے ہاں سب کچھ۔ لیکن متانت کی شان سب پر غالب۔ گویا حضرت اکبر الہ آبادی کا پورا جواب۔"

اکبر اور حالی کی انھیں خصوصیات کا موازنہ کتنے شگفتہ انداز اور روانی کے ساتھ کر رہے ہیں:

"یہاں ہر منظر پر متانت کا پردہ پڑا ہوا، وہاں ہر چہرہ پر ظرافت کا غازہ لگا ہوا۔ اُن کا یہ رنگ کہ روتے ہوؤں کو بھی گدگداتے جاتے ہیں، ان کا یہ ڈھنگ کہ کسی کو ہنسی آئے بھی تو اس کے منھ پر رومال رکھا لیتے ہیں۔ ایک کے ہاں تمام تر شوخی و رنگینی، دوسرے کے ہاں ایک۔ ذرا اداسی اور غمگینی ایک کے ہاں قہقہوں اور تالیوں کی چاٹ، دوسرے کے ہاں بات بات پر ادب اور قاعدہ کا لحاظ۔ ایک کی مجلس طرب افروز دوسرے کی صحبت سبق آموز۔ ان کے دسترخوان پر شراب و کباب، ان کے دواخانہ میں یخنی اور عرق گلاب۔ باتیں سب عاشقوں والی کہے جاتے ہیں لیکن وہی

'نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے'

زبان سے جو بول ادا ہوتا ہے نیچی نظروں اور شرمیلی نگاہوں کے ساتھ، لغزش مستانہ کے بجائے ہر قدم سلامت روی کی تصویر لیکن کلام میں حلاوت اس درجہ کہ پڑھتے جائیے اور دل ہی دل میں مزے لیتے جائیے۔"

حالی کی متانت اور سنجیدگی ان کے ادب و اخلاق کے اشعار کی دلآویزی پر مولانا عبدالماجد دریابادی کے تبصروں کے چند نمونے میں نے پیش کر دیے۔ یہاں حالی کی کم گوئی اور خاکساری کے متعلق اشعار پر مولانا کی گل افشانی گفتار ملاحظہ ہو:

"کہاں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کا پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

ذرا حالی کی کم گوئی ملاحظہ ہو، کچھ نہ کہنے پر سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ رات کے نہ ملنے کی وجہ ظاہر ہے۔ وعدہ تھا کس سے اور پورا جا کر کہاں ہوا؟ کجا می نماید کجا می زند، کی پرانی داستان کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو کھُل کھیلتا، اور معاملہ کے پہچان جانے کی علامتیں خدا جانے کیا کیا بیان کر جاتا۔ ایک حالی کی متانت ہے کہ صراحت الگ رہی کسی اشارہ کے بھی روادار نہیں وہی نیچی نگاہیں اور زبان پر صرف اس قدر کہ

'پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا'

حالی نے خاکساری اور تعلّی کا مضمون ایک ہی شعر میں ادا کیا ہے۔ مولانا کا نکتہ شناس قلم کس خوبی کے ساتھ اس کی تشریح کر رہا ہے۔

"خاکساری کے مضامین آپ نے بارہا سنے ہوں گے۔ کیسی کیسی نازک خیالیاں اس میں صرف ہو چکی ہیں اور تعلّی تو ہمارے حضرات شعرا کی گویا جاگیر رہی ہے۔ اب ذرا دیکھیے اردو کا واعظ شاعران دونوں اضداد کو کس بلاغت سے جمع کرتا ہے اور ایک مختصر سے شعر کے اندر، کس نادر اور اچھوتے انداز سے تعلّی سے خاکساری پیدا کر رہا ہے اور خاکساری سے تعلّی نکال رہا ہے

خاکساری اپنی کام آئی بہت | ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا"

اسی غزل کے حسب ذیل اشعار پیش کر کے دریافت کرتے ہیں:

"گو جوانی میں تھی کج رائی بہت | پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے | مینھ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت
آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا | دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

"کہیے؟ اب یہی حالی وہی نرے کھرے واعظ رہے؟ وہی خشک اور بے مزہ پھیکے اور بے اثر نظم گو رہے؟"

دیوان حالی کی ورق گردانی کرتے ہوئے مولانا کی نظر اس غزل پر پڑی:

"آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم"

توان کو حیرت زدہ کر دیا۔ غزل کی مقناطیسی کشش یا قصۂ عشق بتاں کی دل کشی سے مولانا کی نظر اس غزل پر جم کے رہ گئی، اس غزل کے چار شعر انتخاب کر کے تحریر فرماتے ہیں:

"معاملہ بندی کی ساری نزاکتوں کے ساتھ ساتھ یہ متانت، یہ احتیاط، یہ ضبط حالی ہی کا حصہ ہے۔ ان اشعار کو اگر حالی کے دیوان سے نکال کر مومن یا شیفتہ کے دیوان میں لگا دیے جائیں تو کسی کو کچھ پتہ بھی نہ چلنے پائے گا۔"

ان اشعار کو معلوم کرنے کے لیے آپ بھی بے چین ہوں گے اس لیے ان کو تحریر کیے دیتا ہوں:

"آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم	سب کچھ کہا مگر نہ کھلے راز داں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم	کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
جنت میں تو نہیں اگر اے زخم تیغ عشق	بدلیں گے تجھ کو زندگی جاوداں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو	کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرز بیاں سے ہم"

اس شک کو دور کرنے کے لیے کہ دیوان سے انھیں اشعار کا انتخاب کیا گیا جن میں رنگ تغزل، لطافت زبان اور طہارت بیان بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس لیے مولانا نے ایک پوری غزل نمونے کے طور پر پیش کی تاکہ انتخاب اشعار میں 'بد دیانتی' کا شبہ نہ رہے:

غزل کا مطلع یہ ہے:

"ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں | اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

(دیوان حالی ردیف 'ن' کی آٹھویں غزل)

غزل نو شعر کی ہے، مراتب کا فرق یقیناً ان کے درمیان ہے۔ فرمائیے! اس میں پست و لغو شعر نکال ڈالنے کے قابل کون سا ہے؟ کلام کی خشکی اگر اسی کا نام ہے تو آخر تری کے نمونے کہاں ملیں گے؟"

حالی کے دیوان میں دو غزلیں ردیف 'ے' کی ایک ہی زمین "گماں رہے، نہاں رہے" میں ہیں۔ ہر ایک میں سات سات اشعار ہیں۔ مولانا نے دونوں غزلوں سے چار اشعار کا انتخاب کیا ہے:

"کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے — بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے
دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا — اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے
یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حسن قبول اگر ایسے کلام کو حاصل ہو جائے تو اس پر حیرت کیوں کی جائے۔ مغز و معنی سے قطع نظر سلاست، شستگی، روانی، بے ساختگی کسی حیثیت سے بھی یہ کلام بلند سے بلند نمونہ سے پست ہے؟ متعدد شعر ایسے صاف اور ڈھلے ہوئے ہیں کہ بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے ہیں اور تحریروں و تقریروں میں کثرت سے استعمال ہونے لگے ہیں۔"

مولانا نے اس خیال کی شدت سے تردید کی کہ حالی قدیم رنگ میں اچھی اچھی غزلیں کچھ نہ کچھ بہر حال نکالتے رہے لیکن جدید رنگ میں ان کی شاعری غارت ہو کے رہ گئی مولانا کے نزدیک :

"یہ قول کسی حد تک تو شاید صحیح ہو لیکن تمام تر صحیح تو یقیناً نہیں۔ ابھی ابھی جو نمونے کلام کے گزر چکے ان میں اگر دس شعر دورِ قدیم کے تھے تو چار دورِ جدید کے بھی۔ دونوں میں کوئی فرق و امتیاز مطلق محسوس نہیں ہوتا۔"

دورِ جدید کی غزلوں کے کچھ اور شعر پیش کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ حالی کے کلام میں متانت ہے خشکی نہیں۔ جیسے :

"جنوں کار فرما ہوا چاہتا ہے — قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے
بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو — وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے
دعا شرطِ الفت ہے لیکن کہاں تک — دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے
غمِ اشک کو تلخ سمجھے تھے ہمدم — سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے
فزوں تر رہے کچھ ان دنوں ذوقِ عصیاں — درِ رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

خشکی اگر متانت بیان ہی کا دوسرا نام ہے تو یقیناً یہ اشعار بھی خشک ہیں۔ لیکن اگر

متانت بیان عیب نہیں ہنر ہے تو خدارا بتائیے کہ خشکی کا اطلاق ایسے کلام پر کس طرح کیا جائے؟

آخر میں ایک اور جدید غزل کے چھ اشعار انتخاب کر کے قدیم و جدید کی بحث ختم کر دی۔ اس غزل کا مقطع مدت تک ادبی دنیا میں موضوع بحث رہا:

"ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے — آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے
اے دل اب آزمائش تقدیر کا ہے وقت — وہ امتحان بُرّش شمشیر کر چکے
کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے — ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے
بھولے رہے تصور مژگاں میں چند روز — دیکھا تو دل کو ہم ہدف تیر کر چکے
دل لے کے ایک میر اپنے فارغ ہوئے ہیں وہ — گویا کہ اک جہان کو تسخیر کر چکے

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے"

مولانا عبدالماجد فرماتے ہیں:

"شوخی کے نمونوں سے یہ کلام کب خالی ہے؟ تیسرے شعر کے اندر لطیف شوخی کی جو کیفیت ہے اُسے لفظوں میں کوئی کیوں کر بیان کر ڈالے؟ بس بات کیا ہے؟ وہی کہ نرم مخملیں پنجہ، آہنی دستانے کے اندر چھپا ہوا۔ شوخی حدود متانت سے قدم باہر نہیں نکال سکتی اور اپنی لطیف ترین صورتوں ہی میں محدود رہ جاتی ہے۔"

مولانا کے اسلوب نگارش کا یہ کمال تھا کہ جس نے انصاف پسند اور ادب نواز حضرات کی غلط فہمیوں اور بد گمانیوں کو دور کیا۔ انھوں نے غزل کے اشعار کے ایسے اور اتنے نمونے پیش کیے اور ان پر اس لیاقت و صلاحیت اور وسعت و جامعیت کے ساتھ نپے تلے الفاظ میں تبصرے کیے کہ ہر دل ان سے متاثر ہوا۔ ان کی مدلل تحریر، زبان و بیان پر ان کی قدرت لفظ و معنی پر ان کا عبور، ان کی تحقیقی و تنقیدی بصیرت، ان سب نے ان کی ہر تخلیق کو شاہکار بنا دیا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کا یہ قول حرف بحرف صحیح ہے کہ:

"سب میں ایک ادبی آن اور حسین اسلوبی شائستگی نظر آتی ہے۔"

مولانا نے اپنے خون جگر سے یہ امتیاز و اعجاز حاصل کیا ہے۔ علامہ اقبال نے سچ کہا ہے:

'معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود'

واعظ شاعر کی غزل گوئی پر مولانا نے سب سے پہلے غالباً مئی ۱۹۱۸ء میں ایک مختصر تنقیدی مضمون لکھا تھا۔ مہدی افادی نے اس کو پڑھنے کے بعد مولانا کو اپنے ایک خط مورخہ ۲۵ رمئی ۱۹۱۸ء میں یہ تحریر کیا کہ:

"حالی کی غزلیت پر میں نے آپ کی تنقید بہت دلچسپی سے پڑھی لیکن تسکین نہیں ہوئی صفحے محدود تھے۔" (مکاتیب مہدی صفحہ ۵۷)

اس کے بعد مولانا نے نہ صرف غزلیات حالی، بلکہ مسدس حالی، مرثیہ حکیم محمود خاں اور کالے گورے کا میڈیکل امتحان نیز بیوہ کی مناجات پر اپنی ادبی آن اور اسلوبی شائستگی کے ساتھ تبصرہ کیا ہوگا؟ مسدس حالی صدی ایڈیشن میں یہ تبصرہ "مسدس ۱۹۳۵ء میں" کے عنوان سے موجود ہے جس میں ملت اسلامیہ کی آج کی پستیوں، گزرے ہوئے کل کی بلندیوں رسول پاک کی زبان مبارک سے توحید کی منادی اور حالی کی نعت گوئی کے منتخب اشعار اور ان پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد دربار رسالت میں حالی کی دردناک فریاد و فغاں کے ۴۳ اشعار میں سے صرف ۱۳۔ اشعار پیش کر کے مسدس پر ان کے مجموعی تاثر کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"کیا یہ کہنے کی، یہ بتانے کی حاجت ہے کہ اب تک کتنے ایڈیشن پر ایڈیشن اس کے نکل چکے کتنی محفلوں میں اس کے بند پڑھے جا چکے۔ وعظ کی کتنی مجلسوں کو یہ گرما چکے۔ ادبی امتحانوں کے نصاب میں یہ داخل ہو چکا۔ کتنے بوڑھوں کی، جوانوں کی، لڑکوں کی زندگی میں انقلابی اثر پیدا کر چکا۔ کتنوں کو رُلا کر یہ رہا، کتنوں کے دل اس نے بڑھائے۔ غرض مقبولیت کے، مرجعیت کے جتنے بھی معیار ہو سکتے ہیں سب کے لحاظ سے آج اسے دیکھ لیجیے، جانچ لیجیے، پرکھ لیجیے۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس آن کا اور اس شان کا، اس جمال کا اور اس کمال کا اردو میں کوئی اور مسدس ہے بھی۔ زندگی اس کلام کو نصیب نہ ہوگی تو اور کس کو ہوگی؟"

اودھ کے قصبات کی ادب پرور آغوش میں ایسی اور اتنی باکمال، عبقری، نابغۂ
اور خلاقِ معانی ہستیاں پروان چڑھیں جن کے کارنامے ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔ ا
مردم خیز خطے پر علامہ اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
ہے جن کے لیے بحرِ پُر آشوب بھی پایاب

مولانا عبدالماجد دریابادی ایسے ہی غواص معانی تھے، جن کی حیثیت بحرالعلوم کی تھی۔
افسوس کہ یہ نکتہ دان لفظ و معانی ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو مادرِ وطن کی آغوش میں ہم
کے لیے سو گیا۔ سال وفات کی تاریخ بھی کتنی معنی خیز نکلی ہے:
"نکتہ دان لفظ و معنی نہ رہا" ۱۹۷۷ء

استفادہ: عبدالماجد دریابادی نمبر، فروغ اردو، نیا دور، صریر خامہ تنقید نمبر، ہندوس
جولائی ۱۹۳۶ء، حالی بحیثیت شاعر، تعارف تاریخ اردو، مسدس حالی صدی ایڈیشن وغیرہ

ڈاکٹر سید فضل امام

عبدالماجد دریابادی بحیثیت تبصرہ نگار

اردو میں باقاعدہ اور باضابطہ تبصرہ نگاری کا آغاز 'مخزن'، 'اردوئے معلیٰ'، 'اودھ پنچ'، 'دلگداز'، اور 'اردو' وغیرہ رسائل وجرائد سے ہوتا ہے۔ ان کے مدیروں نے متوازن اور کارآمد تبصرے کیے اور مبصروں کو تلاش کرکے ان سے متعلق موضوعات پر تبصرے کرائے جس سے تبصرہ نگاری جو صرف ایک رسمی چیز ہوکر رہ گئی تھی اس کی افادیت کا احساس پیدا ہوا اور تبصرہ نگار اپنے منصب اور فرائض سے بھی باخبر ہوا۔ ان تبصروں سے سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ مثبت اور ٹھوس علمی وادبی مباحث کا آغاز ہوا، جو سخت و سست، تلخ و شیریں انداز لیے ہوئے تھے اس نشیب و فراز کے باوجود، ان کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

عصر حاضر میں تبصرہ نگاری کا فن بہت اہمیت کا حامل ہوگیا ہے لیکن تبصرہ نگاری پر بھی تبصرے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تبصرے مخالفانہ اور رقیبانہ انداز لیے ہوئے رہتے ہیں۔ اگر مبصر، مصنف اور شاعر کی مدح وثنا میں رطب اللسان نہیں ہے تو اس کے تبصرے کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھا جائے گا۔ مبصر کو نشانۂ طنز و تشنیع بنایا جاتا ہے اور اسے جدید تجربات سے بیزار یا ناواقف قرار دیا جاتا ہے اس لیے تخلیق کار، مصنف اور مبصر میں ایک طرح سے تصادم اور کشمکش کی کیفیت نظر آنے لگتی ہے اور کہا جانے لگتا ہے کہ مبصرین صرف اپنے قلم کی جولانی دکھانے کے عادی ہیں اور عیب جوئی اور نکتہ چینی ان کا شیوہ ہے۔ مبصرین تخلیقی کرب کو کیا جانیں؟ مگر ایسے بھی مبصرین تھے اور ہیں جو تخلیق کار بھی تھے اور تخلیقی شعور کے مالک بھی تھے اور ہیں۔ مثلاً شبلی، حالی، حسرت موہانی، نیاز فتح پوری،

مولوی عبدالماجد دریابادی ناظر، احتشام حسین، آلِ احمد سرور، اختر اورنیوی، محمد حس
قمر رئیس، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ وغیرہ۔

مولوی عبدالماجد دریابادی ہمارے ان تبصرہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے تبصرہ نگار
کے فن کو ایک مقدس سنجیدگی اور وقار بخشا ہے۔ یوں تو انھوں نے مقدمے، دیباچے اور تنقید
مضامین بھی لکھے ہیں لیکن اُن کے قلم کے جوہر تبصروں میں کھلتے ہیں۔ وہ علوم مشرقیہ کے منتہ
اور علوم مغربیہ سے بخوبی واقف تھے۔ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان ک
تبصروں میں بھی فلسفیانہ افکار ایک متوازن اور دل چسپ انداز لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مولو
عبدالماجد دریابادی انشائیہ نگار اور انشا پرداز بھی ہیں۔ ان کے تبصرے کا اسلوب ایسا ہے
انشائیہ کا گمان ہونے لگتا ہے لیکن انشائیہ نہیں ہے وہ اسی مخصوص اور منفرد انداز سے ایس
گہری اور پتے کی بات کہہ جاتے ہیں کہ دل کشی اور محویت تا دیر قائم رہتی ہے۔ وہ اُن تبصر
نگاروں میں ہیں جو بلا وجہ کی قابلیت نہیں بگھارتے بلکہ اپنے موضوع کے پیش نظر وہ کر تصنیف
اور تخلیق پر تبصرہ کرتے ہیں۔

عبدالماجد دریابادی کی تبصرہ نگاری کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کا بے تکلف
انداز ہے۔ وہ اشعار یا نثر سے جس طرح محظوظ ہوتے ہیں اس کا اظہار اپنے تبصرہ میں کر دی
ہیں وہ فلسفیانہ انداز سے نظر ڈالتے ہیں۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور ذوق نکھرا او
پختہ ہے۔ اردو تبصرہ نگاری ان کے بار گراں سے جھکی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں ان کی تبصر
نگاری کے چند نمونوں کا انتخاب پیش خدمت ہے۔ پورے تبصرے کی گنجائش نہیں۔

سید فضل احمد کریم فضلی کے مجموعۂ کلام "نغمۂ زندگی" پر مولوی عبدالماجد دریابادی کا تبص
پہلی مرتبہ صدق، ۱۳ اپریل ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔ کتاب کی تقطیع، ضخامت، قیمت او
ملنے کے پتے درج کرنے کے بعد گل افشانی تحریر ملاحظہ ہو:

> "کتاب کہیے یا ننھے منے سے قد، ہلکی پھلکی قامت کی مناسبت سے کتابچہ، اردو دیوان ہے ایک آئی۔ سی۔ ایس۔ شاعر کا، اور مجموعہ ہے ایک آکسن کے اردو کلام کا۔ اپنی نوعیت میں شاید پہلی اور انوکھی چیز۔۔۔۔۔ شیوہ طراز شاعر ہے کہ قدم قدم

پر مات دیتا ہے اور بھولا بھالا ناقد ہے کہ مات پر مات کھاتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اصل دیوان غزلیات کا شروع ہوگیا۔ وہی ردیف وار۔ اب کہیں استاد غالب سے مشورے ہو رہے ہیں، کہیں خواجہ حافظ سے سرگوشیاں کہ یہیجیے صفحہ ۸۸ آگیا اور اب دو بدو ہونے لگی فارسی کے استاد منوچہری سے ...... صفحہ ۹۲ پر غزلوں کا جلسہ ختم۔ صفحہ ۹۵ سے نظم خوانی کی محفل آراستہ۔ کہیں رباعیاں، کہیں قومی نظمیں اور سب سے آخر میں نظم "آکسفرڈ" بدر منیر کے وزن پر۔ خدا معلوم اس مثنوی کو مثنوی کہنے میں شاعر نے کیوں تکلف سے کام لیا۔ وہی روانی، وہی شوخ بیانی، وہی رمز وکنائے، وہی حرف وحکایت جو مثنوی کی جان ہوتی ہیں۔ غرض بجز عریانی وفحش نگاری کے اور سب کچھ ..... شاعر نے شہد کی مکھی بن کر، رس خدا معلوم کن کن پھولوں کا چوسا ہے۔ اقبال کا اثر سب سے بڑھ کر نمایاں، شروع میں بھی، آخر میں بھی، وسط میں بھی، لیکن اپنی خودی کو لیے دبے ہوئے۔ اپنی شخصیت سب سے الگ تھلگ کیے ہوئے۔ رنگ میں کسی کے بھی پیرو اور مقلد نہیں۔ سب سے آزاد، بس اپنے اوپر اعتماد۔ یہ ہنر نہیں قدیم الخیال ریویو نگاری کی نظر میں کچھ عیب ہی سا ہے۔" [1]

میں نے پورا تبصرہ نہیں پیش کیا ہے۔ بلکہ بعض حصوں سے صرف نظر کیا ہے۔ صرف انھیں حصوں کو پیش کیا گیا ہے جس میں وہ اپنے مخصوص انداز میں بھرپور تبصرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس تبصرہ سے مولانا کی شعریات اور ادبیات پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ فضلی کی غزل گوئی پر غالب، حافظ اور منوچہری کے اثرات کی طرف مولانا نے واضح اشارے کیے ہیں۔ فضلی کی شاعری پر عالمی ادبیات کے اثرات کی طرف بھی فاضل تبصرہ نگار نے اک نگاہ ڈالی ہے جس میں شہد کی مکھی کی طرح سے رس چوسنے کی بات کہی ہے

---

[1] مقالات ماجد، از، عبدالماجد۔ ناشر شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج آفس، محمد علی روڈ، بمبئی ۳ ص ۳۰۴۔ ۳۰۵ طبع اوّل۔

اس سے بھی بھرپور تبصرہ کی شان نمایاں ہے یعنی تبصرہ نگار جہاں شاعر کی صفت بیان کر رہا ہے وہیں اس کی خوشہ چینی کے رجحان کی بھی نقاب کشائی کر رہا ہے۔ یعنی فضلی نے کہاں کہاں سے خیالات اخذ کیے ہیں۔ مغرب اور مشرق کے اثرات اور پھر اقبال کے خصوصی اثرات کے قبول کرنے کی بھی بات کہی گئی ہے۔ قدیم الخیال مبصر، رنگ شاعری بھی تلاش کرتے تھے لیکن فضلی کی شاعری پر کسی شاعر کا رنگ غالب نہیں ہے۔ یہ قدیم مبصر کے پیش نظر عیب تھا مگر عبدالماجد دریابادی اسے شاعر کی خود اعتمادی قرار دیتے ہیں۔ یہ تبصرہ اپنا خود ایک انداز لیے ہوتے ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں برجستگی اور بے ساختگی کی شان نمایاں ہے۔

ان کا ایک دوسرا تبصرہ تنقیدی مضامین کے مجموعہ "نقد و نظر" از حامد حسن قادری ملاحظہ ہو جو صدق ۴ رجنوری ۱۹۴۲ء کی اشاعت میں ہے۔ تبصرہ کے بعض حصے پیش خدمت ہیں:

"نقد و نظر" پر تبصرہ کرنے کے لیے خود بڑے صاحبِ بصیرت ہونے کی ضرورت ہے لیکن سرے سے آنکھیں چرانا بھی بڑی بے بصری ہے۔۔۔ کتاب شروع سے آخر تک ایک مشرقی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مشرقی طلبار کے فن کے لیے اور مشرقی عام ناظرین کے لیے۔ قادری صاحب یہ نہیں کہ ہومر اور ورجل کے ناموں سے ناآشنا ہوں وہ واقف بائرن اور شیلے سب سے ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان میں سے کسی سے مرعوب نہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اپنے دل و دماغ سے لکھتے ہیں اور اپنوں کے لیے لکھتے ہیں۔۔۔ البتہ وہ ناواقف ایک فن سے ہیں۔ انھیں یہ نہیں آتا کہ اپنے افلاسِ دماغی پر پردہ پُرشوکت اور مرعوب کن ناموں کا ڈالیں۔۔۔ بہ حیثیت مجموعی اتنی سلجھی ہوئی، سنبھلی ہوئی، عمومی ہوئی کتاب فنِ تنقید پر اردو میں عرصہ کے بعد دیکھنے میں آئی، جب طبیعت دوسرے رنگ کی 'صاحبی' اور سرکاری رنگ کی، تنقیدی کتابوں سے اکتا چکی تھی۔"[1]

---

[1] مقالات ماجد۔ ص ۳۰۹۔ ۳۱۰

یہ تبصرہ بھی مولانا عبدالماجد دریابادی کے اچھوتے انداز کا ترجمان ہے اور اس سے ان کا تنقیدی مطمحِ نظر بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اردو شعر و ادب کی تقویم و تنقید کے لیے مشرقی نقادیت کے قائل ہیں۔ ایسا نہیں تھا کہ عبدالماجد دریابادی مغربی ادبیات سے ناواقف ہے لیکن وہ تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ حامد حسن قادری کی یہ خوبی ہے کہ وہ ہومر اور ملٹن کا ذکر کر کے قارئین پر رعب نہیں ڈالنا چاہتے ہیں۔ مغربی ادبیات کے موٹے موٹے ناموں کا شمار کرا کے ناظرین کو مرعوب کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرح سے اپنے افلاسِ دماغی پر پردہ ڈالنے کے مرادف ہے۔ یعنی مولانا کے نزدیک ادبی تنقید کے لیے مشرقی آدابِ تنقید کو برتنا ہی مناسب اور موزوں ہے۔ حالانکہ مولانا فلسفی تھے اور مغرب کے فلسفیانہ افکار و نظریات کا گہرا شعور رکھتے تھے اس کے باوجود وہ ہمیشہ مشرقی معیار و میزان کے حوالے سے اپنی تبصراتی بصیرت کی جلوہ آرائیاں پیش کرتے رہے۔ وہ آج کل کے مبصرین کی طرح اپنی بات کو پُروقار اور اہم بنانے کے لیے انگریزی اور مغربی ادیبوں کے اقوال کا سہارا نہیں لیتے تھے۔ وہ اس طرح کے سہارے کو افلاسِ دماغی سے تعبیر کرتے تھے۔

مغربی اصطلاحات اور مغربی ادبا کے اقوال سے مملو تنقید کو مولانا عبدالماجد دریابادی ”صاحبانہ اور سرکاری رنگ کی“ تنقید کہتے تھے۔ ہمارے آج کل کے اردو مبصرین کی ہر تان ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ پر ٹوٹتی ہے اور ازرا پاؤنڈ سے شروع ہوتی ہے۔ حالانکہ بیشتر ایسے ہیں جن کا منبعِ علم صرف اور صرف انگریزی تک ہی محدود ہے فرانسیسی اور جرمنی کا کتنے مبصرین نے براہِ راست مطالعہ کیا ہے؟ لیکن بقول عبدالماجد دریابادی، اپنی ”قابلیت بگھارنے“، ”مرعوب کرنے کا انداز“ اور اپنے ”افلاسِ دماغی“ پر پردہ ڈالنے کی کوششِ ناکام کا نتیجہ ہیں۔

صاحبِ طرز انشا پرداز، نباضِ طنز و مزاح، پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کے ریڈیائی مضامین کا مجموعہ ”خنداں“ جب شائع ہو کر منصۂ شہود پر آیا تو مولانا دریابادی نے اس پر بھی جو تبصرہ تحریر فرمایا ہے، اس کے بعض حصے ملاحظہ ہوں:

خنداں

"یہ اردو کے مشہور ظریف و شوخ نگار، رشید احمد صدیقی کے چالیس ریڈیائی مضامین کا مجموعہ ہے ۔۔۔۔ رشید صاحب کی پُر لطف طرزِ نگارش اب پڑھے لکھے حلقوں میں قطعاً نہ کسی سفارش کی محتاج ہے نہ تعارف کی۔ ان کا ایک خاص اپنا رنگ ہے۔ دوسروں سے ممتاز اور پختہ کار ہو چکا ہے۔ بغیر کسی کی دل آزاری بلکہ دل شکنی کے، بلا فحش و ابتذال کے شائبے کے، ہجو و سبّابی سے پاک، وہ چھوٹے بڑے، اپنے پرائے، سب کے خاکے اس دل چسپ انداز میں کھینچتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا ہر سطر پر، لطف لیتا جائے، مسکراتا جائے، جھومتا جائے اور کہیں کہیں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

نشریہ تیار کرنے میں مصنف کا قلم آزاد نہیں ہوتا، ریڈیو بہر حال ایک سرکاری محکمہ ہے اور محکمہ کی طرف سے طرح طرح کی قیدیں اور پابندیاں عائد رہتی ہیں۔ ظرافت کی بے تکلفی بھلا ان قیود کا تحمل کہاں کر سکتی ہے، لیکن رشید صاحب کی معجز نگاری نے ان پابندیوں میں بھی اپنے کمال کو برقرار رکھا اور اس ضخیم مجموعے کے ہر ہر صفحے کو زعفران زار بنائے رکھا ہے۔ بھرتی کا صفحہ تو شاید کوئی بھی نہ ملے ۔۔۔۔ کتاب عوام اور کم استعداد سواد خوانوں کے کام کی نہیں۔ یہ عیب ہو یا ہنر، بہر حال واقعہ یہ ہے کہ "رشیدیات" سے لطف اٹھانے کے لیے پڑھنے والے کو اچھا خاصہ پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔"[1]

درج بالا تبصرے میں بھی مولانا کی صاف گوئی اور بے باکی آشکار ہے۔ وہ جہاں محکماتی قید و بند کو تخلیقی فن کے اظہار کے لیے مضرت رساں قرار دیتے ہیں، وہیں ان قدغنوں کے باوجود رشید صاحب کے فن کو سراہتے بھی ہیں۔ ساتھ ہی "رشیدیات" کے مطالعے

---

[1] مقالات ماجد ص ۳۱۲ - ۳۱۳

کے لیے تفحص علمی اور گہرے ادبی شعور کا بھی مطالبہ کرتے ہیں۔

آخر میں جوش ملیح آبادی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ "کلیم" (ماہوار) پر بھی عبدالماجد دریابادی کا تبصرہ ملاحظہ ہو جو "صدق" جلد اول ۱۱ر مارچ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا:

"جوش صاحب اب تک "شاعرِ انقلاب" تھے، اب "کلیم" کے صفحات میں داعیٔ انقلاب کی حیثیت سے نظر آرہے ہیں۔ پہلے ہی نمبر میں "اردو ادبیات میں انقلاب" کی ضرورت پر ایک "پرجوش" مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔۔۔۔۔ لیکن نہ ارشاد ہوا کہ دعوتِ اصلاح اگر تمام تر مضحکہ خیز ہے تو دعوت انقلاب کو سنجیدگی اور حقیقت سے کس قدر تعلق ہے۔

دعوت انقلاب بار بار پڑھنے کے بعد بھی "انقلاب ادبی" کا کوئی نمونہ اس صحیفۂ انقلاب کے اندر نہیں ملتا۔۔۔ یہ جوش و خروش، غیظ و غضب اگر محض تخلص کی مناسبت سے ہے اور یہ گرج اور چمک اور یہ ہوش ربا تجلیاتِ آتشیں، اور سب سے بڑھ کر بقول ایک صاحب کے یہ لن ترانیاں اگر اسم "کلیم" کی شاعرانہ رعایت سے، تو اس حسنِ ادا کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ لیکن اگر ان کے سوا کوئی اور صفت ملحوظ رکھی گئی ہے تو اتنا رسا دماغ کوئی کہاں سے لائے۔۔۔ خود جوش صاحب بھی تو بہت اچھے ادیب بن سکتے ہیں اگر چاہیں"۔ [1]

درج بالا تبصرے کے متعلق اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ جوش اور عبدالماجد دریابادی کے تعلقات خوش گوار نہیں رہے ہیں لیکن مولانا نے جو تبصرہ کا انداز اپنایا ہے وہ علمی شرافت کا نمونہ اور ادبی و صحافی دیانت داری کی دلیل ہے۔

دراصل عبدالماجد دریابادی تنقید و تبصرے کا ایک متوازن اور سنجیدہ لب و لہجے کا تعین کرتے ہیں۔ یہ تبصرے صرف کتابوں پر ہی رسمی تبصرہ نہیں بلکہ یہ بھی

---

[1] بحوالہ مقالات ماجد ص ۳۳۲

بتاتے ہیں کہ شعرا و ادبا سے اختلاف اور شدید اختلاف شریفانہ انداز سے بھی کیا جا
سکتا ہے۔ درج بالا تبصروں کا انتخاب اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ تبصرہ نگاری
فن کو ایک مقدس سنجیدگی اور وقار بخشتے ہیں۔ ان کے مزاج میں انکساری کی شان
تھی۔ وہ کوئی بلند بانگ نعرے یا طمطراقانہ لہجے سے کام نہیں لیتے بلکہ انتہائی ساد
سے غیر رسمی انداز میں اپنی بات کہہ دینے کا موثر ڈھب اپناتے ہیں۔

مولانا دریابادی کے تبصروں میں ایک تخلیقی شان نظر آتی ہے۔ وہ چھوٹے چھو
جملوں میں ایک جہان معنی آباد کر دیتے ہیں۔ ان کی تبصرہ نگاری آج بھی متوازن اور
سنجیدہ انداز و معیار کی دعوت دے رہی ہے۔

شافع قدوائی

"سچّی باتیں"
ایک تجزیاتی مطالعہ

اردو میں کالم نویسی اب تک ایک باقاعدہ اور مستقل صنف کے طور پر رائج نہیں ہوسکی ہے۔ اردو میں کالم سے مراد عام طور پر حالات حاضرہ پر شگفتہ انداز میں تبصرہ ہوتا ہے۔ کالم کا بالواسطہ تعلق طنز و مزاح سے سمجھا جاتا ہے اور ہلکے پھلکے تاثرات کا ذریعہ اظہار گردانا جاتا ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ "اودھ پنچ" نے حالات حاضرہ پر طنز و مزاح کے پیرائے میں تبصرے شائع کرکے کالم نگاری کی راہ ہموار کردی تھی اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں الہلال میں "افکار و حوادث" کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھ کر کالم نگاری کا رشتہ طنز و مزاح سے مستحکم کردیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے مولانا آزاد کا اتباع کرتے ہوئے ۱۹۱۷ء میں "ستارۂ صبح" کے نام سے فکاہیہ کالم لکھا۔ اس کے بعد حسن نظامی اور مولانا محمد علی جوہر نے بھی فکاہیہ کالم لکھے۔ مولانا آزاد مولانا ظفر علی خاں اور حسن ثانی نظامی کے فکاہیہ، طنزیہ اور مزاحیہ کالموں کی مقبولیت کے باعث اردو کالم نگاروں نے سنجیدہ مسائل اور فکری موضوعات پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے طنز و مزاح کو اپنا مقصود جانا اور سیاسی موضوعات پر شگفتہ انداز میں رائے زنی کرتے رہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی جنھوں نے صرف بارہ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۰۴ء میں اودھ اخبار میں ایک مذہبی عنوان پر مضمون لکھ کر اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا، فکری مباحث اور مذہبی و اخلاقی موضوعات کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے اپنے کالم "سچی باتیں"، کی

اساس ان موضوعات پر رکھی۔ مولانا دریابادی نے ۱۹۲۵ء میں ایک ہفتہ وار سچ نکالا جس کے صفحۂ اوّل پر ان کا اداریہ نما کالم "سچی باتیں" شائع ہوتا تھا۔ ہر چند کہ مولانا نے اس کالم میں مقبول عام روش کے مطابق سیاسی موضوعات پر طنزیہ پیرائے میں اظہار خیال بھی کیا مگر انھوں نے "سچی باتوں" کو بنیادی طور پر معاشرتی اصلاح اور اخلاق کی درستی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ "سچی باتیں" مولانا کے مخصوص نصب العین یعنی اخلاقی قدروں کی بازآفرینی اور مذہب کی سربلندی اور احیا کے جذبہ کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ نصف صدی کو محیط، مولانا کی صحافتی زندگی کا بنیادی موضوع روحانی اور اخلاقی اقدار ہیں۔ ان کی تقریباً تمام تحریریں اسی ایک نقطہ کی تشریح و توضیح کرتی ہیں۔ ادبی موضوعات ہوں یا روزمرہ کے واقعات، مولانا دریابادی ہر واقعہ سے عبرت اور سبق آموزی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے تھے اور اپنے کالم میں اسی پہلو کی معنویت کو آشکارا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے مولانا کی تمام تحریریں اسالیب بیان کے تنوع اور موضوعات کی رنگارنگی کے باوجود اپنی غایت کی سطح پر باہم متحد اور مربوط ہیں۔ انھوں نے "سچی باتوں" کے حوالے سے کائناتی مظاہر میں مستور ایک مرکزی حقیقت کی تلاش کو اپنی فکر کا مرکز بنایا تھا۔ مولانا نے سچ کے بعد صدق اور پھر صدق جدید نکالا۔ ان پرچوں میں بھی ان کی تحریروں کا مرکزی حوالہ وہی رہا۔ وہ اپنے جریدے "صدق جدید" کو سیاسی اخبار کی صف میں شامل کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ مولانا دریابادی صدق جدید کے موقف کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "صدق جدید سیاسی پرچہ تو کسی معنی میں ہے ہی نہیں اصلاً ایک دینی، اصلاحی اور اخلاقی صحیفہ ہے۔ اس کی اصل دعوت دینی و اصلاحی دعوت ہے۔ پھر اس کا ایک مخصوص علمی و ادبی معیار ہے اور اس کا خاصہ حصہ کتابوں کے نقد و نظر کے لیے وقف رہتا ہے۔ اس کے بعد اگر کچھ جگہ بچتی ہے تو وہ سیاسی رائے زنی بھی کر دیتا ہے وہ بھی صرف اپنے ملک سے متعلق جس سے وہ سیاسی، آئینی، قانونی، جغرافیائی طور پر وابستہ ہے۔ کسی دوسرے ملک کی سیاست سے چاہے وہ چین و روس ہو یا عرب و پاکستان ہو اسے نفیاً اور اثباتاً اتنا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ کسی ملک پر سیاسی

رائے زنی صرف اسی ملک والوں کا حق ہے۔ اخلاقیات اور ایمانیات کا معاملہ دوسرا ہے اس میدان میں آکر صدق کا تعلق ساری دنیا سے قائم ہو جاتا ہے۔ وہ فسق والحاد پر نکتہ چینی اپنی بساط کے موافق دنیا بھر پر کیا کرتا ہے۔'' ۲۵

مذکورہ بالا اقتباس سے ظاہر ہو گیا کہ مولانا کے نظریۂ صحافت کے اجزائے ترکیبی کیا تھے۔ انھوں نے اپنا نصب العین (MOTTO) بھی اخبار کی پیشانی پر کندہ کر دیا تھا۔ یہ نصب العین قرآن مجید کی ایک آیت ''وَالَّذِیْ جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ'' (اور وہ سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کو سچ مانا وہی پرہیز گار ہیں) سے اخذ کیا گیا تھا۔ مولانا عمر بھر اس پر عمل پیرا رہے اور اپنے ہفتہ وار میں صرف وہ چھاپتے تھے جسے وہ حق سمجھتے تھے۔ قارئین کی فرمائش کبھی ان کے قلم کو موڑ نہیں سکی انھوں نے عصری صحافت کے اس اصول کو بھی پائے حقارت سے ٹھکرا دیا کہ اخبار کی تعداد اشاعت میں اضافہ کی خاطر قارئین کی پسند و ناپسند کا لحاظ رکھا جائے اور انھیں ہر حال میں خوش رکھا جائے۔ مولانا کا کالم ''سچی باتیں'' برصغیر کے ادبی اور صحافتی حلقوں میں بے حد مقبول تھا اور بہت سے روزنامے، ہفت روزہ اور دیگر جرائد اسے اہتمام کے ساتھ شائع کرتے تھے۔ مولانا نے سچی باتوں کے ذریعہ لوگوں کو دعوت فکر دی اور اعلیٰ روحانی، مذہبی اور اخلاقی اقدار کو جو رفتہ رفتہ قصۂ پارینہ بنتی جا رہی تھیں، روزمرہ کی زندگی کا لازمی جزو بنانے کی سعی کی۔ ''سچی باتوں'' کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب، اخلاق، روزمرہ کے سماجی مسائل، فحاشی، بے راہ روی اور تعلیمی نظام کے مسائل پر مولانا نے تفصیلی اظہار خیال کیا۔ مولانا دریابادی کو فنا اور عبرت کے موضوع سے خاص مناسبت تھی اور وہ بعض خبروں، واقعات، حکایات اور قصوں کے حوالے سے دنیا کی ناپائیداری اس کے نقش کو اور گہرا کرتے اور یہ باور کراتے ہیں کہ یہ حیات چند روزہ، وقتی اور لمحاتی ہے اور اسے آنے والی زندگی کا ایک پڑاؤ سمجھنا چاہیے۔ اس سلسلے کی چند مثالیں ملاحظہ کریں:

''(۱) ہندوؤں کی مشہور و قدیم مذہبی کتاب مہابھارت کے شروع ہی میں راجہ یدھشٹر کی زبان سے ایک سوال کے جواب میں یہ قول درج ہے کہ'' دنیا کے عجائبات

میں جو عجوبہ سب سے بڑا بڑھا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے چوطرفہ لوگوں کو مرتے دیکھتا رہتا ہے لیکن اپنے لیے سمجھتا ہی نہیں کہ میں بھی مرنے کی چیز ہوں"

بات کتنی سچی حکیمانہ اور دانش مندانہ ہے۔ اپنی موت کی طرف سے غفلت ایک حد تک تو امر طبعی ہے۔ حب حیات اگر انسان پر غالب نہ ہو تو یہ کارخانۂ عالم آباد ہی کیونکر رہے اس آبادی کا تو مدار ہی اس غفلت بے حسی اور انجام فراموشی پر ہے۔ [سچ ۵۲]

(۲) خبر شائع ہوئی ہے اور اس اہمیت کے ساتھ کہ جیسے ساری دنیا اس کے انتظار میں تھی کہ سکندرِ اعظم کے مقبرہ کا پتہ لگانے کی آخری کوشش بھی ناکام ہو چکی اور صدیوں کی تحقیق و تفتیش اور مختلف مقامات میں سیکڑوں میل کی کھدائی کے بعد بھی ماہرین اثریات یہ پتہ نہ لگا سکے کہ اس شہنشاہ کی تربت ہے کہاں؟ اور یہ سکندر یونانی وہ ہے کہ جسے یورپ دنیا کا فاتح اعظم قرار دیے ہوئے ہے۔ ہمارا اردو کا بھی ایک غریب شاعر تو کچھ ایسا ہی کہہ گیا ہے ؎

نہ گورِ سکندر ہے نہ قبر دارا مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

سکندر کے بخت و اقبال، دولت و حشمت، وسعت و مملکت و سلطنت کو چھوڑیے ان کا تو نام و نشاں بھی ظاہر ہے کہ اب باقی نہیں۔ یہاں ذکر صرف تربت کا ہے۔ وہی اب کس کے علم میں ہے؟ اور بالفرض کسی کے علم میں ہوئی بھی تو آخر حاصل کیا؟ یہ ہے ہماری بڑی سے بڑی کامیابی و کامرانی و بڑی سے بڑی جہاں بانی اور کشورکشائی کی کل بساط۔ [سچ ۵۲]

(۳) شہر کے کسی کباڑیے کی دکان پر آپ کا گذر ہوا ہو گا ضرورۃً نہ سہی تفریحاً یا سرِ رہ گذر پڑ جانے کی حیثیت سے نخاس لکھنؤ کا سارا بازار ہی گویا ایک عظیم الشان کباڑ گھر کا نام ہے۔ پھر آپ ایسی جگہ میں کیا پاتے ہیں، ایک عظیم الشان ڈھیر، ایک انبار عظیم بے کار بے مصرف ردی اور ناقابل استعمال چیزوں کا، ٹوٹے ہوئے گلاس کی چمنیاں، چٹخی ہوئی چائے دانیاں۔ ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، دیمک کھائے ہوئے کوچ و صوفے، بدقلعی لوٹے، زنگ کھائے ہوئے برتن، پھٹے ہوئے پاجامے،

نچے ہوئے کوٹ، بوسیدہ گھڑیاں، بے مرمت سائیکلیں، پرزہ ٹوٹے ہوئے بدرنگ موٹر۔ غرض ساری دنیا کا ملبہ یا کوڑا کرکٹ جمع مگر یہ کوڑے کرکٹ کا انبار ہے یا کیا، سب کی سب ایسی چیزیں جو ابھی کل تک آپ کو کس قدر عزیز تھیں۔ وہی سامان جسے آپ نے کس شوق سے، کس تلاش و محنت سے، کتنا روپیہ خرچ کر کر کے جمع کیا تھا وہی ساز و سامان جس کے پیچھے آپ دیوانہ ہوئے جا رہے تھے۔ کیا دنیا کی بڑی سے بڑی چمکیلی چیزوں کی حیثیت کل اتنی ہی ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی رغبت بھی کچھ دن کے بعد، کچھ وقت گذر جانے کے بعد کہنہ فرسودہ ہو کر آخر بے رغبتی میں تبدیل ہو کر رہتی ہے۔"[۵]

فنا اور عبرت ناکی کے بے شمار واقعات سچ، صدق اور صدق جدید کے صفحات پر بکھرے ے ہوئے ہیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ عہد حاضر کے تمام مسائل خواہ وہ معاشرتی لوٹ کھسوٹ ل میں ظاہر ہوں یا اخلاقی کمزوریوں کے روپ میں یا طلبہ کی شورش کی صورت میں، آخرت فراموشی کا نتیجہ ہیں۔ مغرب سے درآمد شدہ تعلیمی نظام اور معاشرتی اقدار نے کو اس طرف سے بالکل بے پروا کر دیا ہے۔ روحانی اور اخلاقی اقدار پر عدم اطمینان شرتی بگاڑ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مولانا دریابادی اخلاقیات کو قدیم ادبی سرمائے کا ری وصف قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"(۱) طلسمات گل بکاؤلی (صحیح نام مذہب عشق ہے) ایک لچر سی کتاب قصہ کہانی اور دل بہلاوے کی ہے اور افسانہ عشق سراپا فسق کا ہے۔ لیکن اگر کبھی اتفاق سے نظر پڑ جائے تو دیکھیے گا کہ خرافات کے انبار میں پند و موعظت کے کیسے کیسے گوہر نایاب چھپے ہوئے اور پتے جھلک رہے ہیں۔ اور فسانۂ آزاد جو ایک غیر مسلم کے قلم سے چار ضخیم جلدوں میں ہے، بیگماتی زبان میں محض ہنسنے ہنسانے کے لیے لکھا گیا ہے اور جو آج سے قبل کے نوابی لکھنؤ کی ہو بہو و من و عن تصویر ہے وہ بھی شروع سے آخر تک محض گدگدیوں سے بھرپور نہیں بلکہ کہیں کہیں چٹکیاں بھی رکھتی ہے اور کہیں کہیں سسکیاں بھی۔ دونوں کے بھی ۲۵ سال کے بعد جو امراؤ جان ادا چھپ کر سامنے

آئی وہ کہنے کو ایک نستعلیق خواندہ بیسوا کی آپ بیتی ہے جو خباثت کی ترغیب و تشویق سے یکسر خالی اور آرٹ کے حق میں فخر و پندار کا نہیں، حسرت و ندامت کا جذبہ پیدا کرنے والی یہاں تک کہ جب، آپ کتاب بند کریں گے تو عجب نہیں کہ حاسہ شرافت کو ایک نئی جلا اشراقیت سے جگمگاتے ہوئے پائیں۔ ۵۵

(۲) گلستاں، بوستاں، پند نامہ سعدی (کریما) وغیرہ کو چھوڑیے کہ وہ تھیں ہی نیم مذہبی، نیم اخلاقی کتابیں عبرت و یادِ آخرت کا درس دینے والی۔ شعر و افسانہ کو لیجیے جو اس دورِ جدید کے آغاز سے قبل رائج تھا اور جو اصلاً غفلت و خدا فراموشی ہی کی طرف لے جانے والا ہوتا ہے اس میں بھی کہیں کہیں پیوند ذکرِ آخرت کا لگا ہوا ضرور نظر آتا تھا۔ (یہاں تک کہ مثنوی زہر عشق جیسی بدنام کتاب میں بھی) مسلمانوں سے قطع نظر ہندوؤں کی کتابیں بھی اسی خصوصیت سے خالی نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن اب اے۔ بی۔ سی۔ ڈی سے لے کر درس و تعلیم کی انتہائی ڈگریوں تک کہیں کوئی تذکرے اس قسم کے آنے پاتے ہیں۔ اور سبق سارے کے سارے وہ جو پڑھنے والے کے دل میں حُبِ حیات اور اسی مادی دنیا سے دل کے لگاؤ اور طبیعت کے اٹکاؤ کو اور تیز سے تیز تر کرتے جائیں ظاہر ہے کہ انسان کا نفس جو خود ہی اس غفلت اور آخرت فراموشی کا مریض تھا اس قسم کے مسلسل تعلیمی ماحول کے بعد اس باب میں کتنا سخت اور پختہ ہو جائے گا اور اپنے انجام و مواخذے کی طرف سے یکسر بے فکری کا جو اثر قلب و ذہن پر محسوس کرے گا وہ احساس ذمہ داری سے کچھ بھی متعین ہو سکتا ہے۔ ۵۵

(۳) یہ ہر جہتی اور ہمہ وقتی دھوکا دھڑی، چھین جھپٹ، لوٹ کھسوٹ نتیجہ ہیں اس تعلیم کا اور اس نظام تمدن کا جس میں مطالبہ حقوق ہی سب کچھ ہے اور ادائے فرائض کچھ بھی نہیں۔ جس میں یہی موجودہ مادی ناسوتی زندگی سب کچھ ہے اور اس کے بعد کی کسی پائیدار، پاداشی اور اخروی زندگی کا کوئی تخیل ہی سرے سے موجود نہیں۔ یورپ نے ڈسپلن، سوشل ڈیوٹی وغیرہ کے نام سے پھر بھی کچھ بت تراش لیے ہیں جو فی الجملہ کام دے جاتے ہیں اور اجتماعی زندگی کے شیرازہ کو بالکل پراگندہ

ہو جانے سے کسی حد تک روکے ہوئے ہیں۔ یہاں خیر سے اس قسم کا بھی کوئی لولا لنگڑا سہارا موجود نہیں۔ اس لیے قدرۃً ایک انارکی (لاحکومتی) ہی برپا ہے اور بندے بندوں ہی کے ہاتھوں زندگی سے عاجز ہو رہے ہیں۔ اخلاقی قدروں کی حکومت جب تک سرے سے قائم نہ ہوگی، نفس بشری کو قابو میں رکھنے کی کوئی دوسری مستقل صورت نہیں۔ اور اخلاق کی حکومت جب ہی ممکن ہے جب دلوں میں خوف خدا اور اندیشۂ آخرت کی روح بیدار ہو جائے۔"۵۸

گو کہ صدق بقول مدیر ایک دعوتی صحیفہ تھا مگر "سچی باتوں" میں مذہبی اور اخلاقی موضوعات کے علاوہ روزمرہ کے مسائل مثلاً رشوت خوری، طلبہ کی شورش، شراب نوشی اور جوے کے مضر اثرات پر بھی اظہارِ خیال کیا جاتا تھا۔ مولانا دریابادی نے اپنے کالم میں روزمرہ کے واقعات کی عکاسی کبھی تو تمثیلی پیرائے میں کی اور کبھی اسے مختصر سے قصہ کے طور پر پیش کیا مگر ان کا بنیادی مقصد واقعہ کی تہہ میں کارفرما رجحانات کو نشان زد کرنا تھا۔ مثلاً:

"(۱) کراچی کی خبر ہے کہ مغربی پاکستان کے محکمہ انسداد رشوت ستانی نے جن سرکاری افسران کے خلاف رشوت ستانی کی تحقیقات شروع کی ہے ان کی تعداد ایک ہزار سے بھی اوپر ہے۔ ان ملزموں میں جو اونچے گزیٹیڈ عہدے دار شامل ہیں، ٹارٹ آفیسر، سپرینٹنڈنگ انجینیر، سول سرجن، ڈپٹی کمشنر، سشن جج وغیرہ ان کی تعداد ۱۰۷ ہے۔ اور یہ اعداد ابھی تو صرف ان کے ہیں جن کا پتہ کسی نہ کسی طرح سے خفیہ پولیس کو مل گیا اور جن کو گرفت میں لانے کے لیے قانونی ثبوت کسی درجہ میں مل گیا ہے۔ پاکستان اور اسی طرح ہندوستان بھی، دونوں اپنی جگہ ٹھنڈے دل اور پوری سنجیدگی سے سوچیں کہ اتنی بڑی تعداد رشوت خوروں کی خصوصاً اعلیٰ افسروں کی صف، کبھی انگریزوں کے دور میں بھی رہی ہے۔ کیا اپنی حکومت اور آزادی مل جانے کے معنی یہی ہوئے کہ ہر طرح کی اخلاقی پابندیوں سے اپنے کو مستثنیٰ سمجھ لیا جائے اور اپنے ہی بھائیوں کو لوٹنے کے لیے اپنے کو ہر طرح تیار کر لیا جائے۔ ۵۹

(۲) افسانہ وناول کی نہیں واقعات کی اس جیتی جاگتی دنیا کا ذکر ہے کہ اس

مارچ کی ۹ تاریخ کو لاہور کے ایک مجسٹریٹ نے ۲۱ سال کی عمر کے ایک جوان کو آٹھ مختلف جرموں میں قید بامشقت کی سزا مجموعی طور پر ۳۲ سال کی دی ہے البتہ چونکہ تین جرموں کی سزا ساتھ ساتھ چلے گی اس لیے مجرم کو جیل سے رہائی ۲۰ سال کے بعد ہی مل جائے گی۔ ۳۲ کے مقابلے میں یہ ۲۰ یقیناً بہت کم ہیں پھر کیا کم ہیں۔ کسی کی اتنی سزایابی کو سُن کر خوش نہ ہوئیے اور عبرت حاصل کیجیے اور سوچ میں پڑ جائیے کہ ہم آپ سب مجرم بننے سے کتنے قریب ہر لحظہ اور ہر گھڑی رہتے ہیں۔ یہ رسوائے خلق مجرم کوئی پیدائشی چور اچکا نہیں۔ شریف و معزز ہی نہیں جیک آباد (سندھ) کے ایک رئیس و متمول گھرانے کا فرزند غلام نبی نام رکھتا تھا۔ سنیما کے شوق اور ایک صاحب کی ترغیب میں آ کر سب سے پہلے ہاتھ کی صفائی اپنے والد ماجد ہی پر دکھائی اور ان کا ایک ہزار روپیہ سرقہ کیا۔ جسارت بڑھی اور وطن سے باہر بمبئی، لاہور، لکھنؤ وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے دہلی میں جرم پر جرم میں اضافہ ہوتا رہا اور چوری کے ساتھ ساتھ قسم قسم کے جرم شریک ہونے لگے۔ دہلی میں جرائم کا کاروبار ایک لاکھ کی آمدنی تک پہنچا لیکن کچھ راز فاش ہی ہو گئے۔ ہوٹل میں تعارف ایک رئیس زادہ کی حیثیت سے ایک اونچے انگریز کی لڑکی سے ہو گیا۔ باضابطہ شادی ہوئی اور قیام اب بمبئی میں رہنے لگا۔ ۸۵ ہزار کی رقم گھوڑ دوڑ کے جوئے سے حاصل ہوئی اور دہلی کی ایک عدالت سے سزا تین سال کی ہوئی، چند ہی روز بعد ملک کی تقسیم ہوئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۰ء میں گرفتاری کے بعد از سرِ نو مقدمے چلے اور اتنی سزا پانے کے بعد ۲۱ مقدمے پھر بھی فیصل ہونا باقی رہ گئے۔ ذرا ذرا سی بد پرہیزی اور بے احتیاطی کیسے کیسے تندرست اور قوی ہیکل جوانوں کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ ۵۱ء

(۳) اسٹیٹسمین میں شائع ہوا ہے کہ طالب علموں کے لیے رعایتی شرح ٹکٹ کا جو طریقہ ریلوے نے اختیار کیا تھا وہ اب اس کے لیے وبالِ جان بنتا جا رہا ہے۔ طلبہ سے زیادہ فرضی طلبہ کی درخواستیں ہر سال سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں پرنسپلوں کی تصدیق کے ساتھ وصول ہوتی رہتی ہیں۔ اور بعد کو کھلتا ہے

کہ فلاں اور فلاں درخواستیں طالب علموں کی نہیں دوسروں کی تھیں۔ چنانچہ حال میں پوری بارات کی بارات اسی طلبہ والے رعایتی ٹکٹ پر سفر کرتے ہوئے پکڑی گئی اور ریلوے کو اچھا خاصہ نقصان اس دھوکے دھڑی سے اٹھانا پڑ رہا ہے۔ لیکن یہ نقصان اسی ایک شق تک کیا محدود ہے۔ بے شمار بے ٹکٹ سفر کرنے والے، خواہ مخواہ زنجیر گھسیٹ کر ریل کو رکوانے والے، ڈبوں سے گدے اٹھالے جانے والے، انھیں کاٹ دینے والے شیشے اور آئینے توڑ ڈالنے والے۔ پنکھے اور روشنی کے بٹن اور گھنڈیاں چرا کر لے جانے والے وغیرہ وغیرہ یہ حضرات کچھ کم ہیں۔ اور یہ ساری مثالیں تو زندگی کے صرف ایک شعبہ اور سرکار کے ایک محکمہ سے متعلق معلوم ہوئیں۔ ڈاک خانہ، تار گھر، پولیس، جیل، اسپتال، اسکول، کالج، کچہریاں ابھی خدا معلوم کتنے سرکاری محکمے ہیں اور نیم سرکاری شعبے زندگی کے، ان کے بھی علاوہ۔ گویا جان و مال کے کل نقصانات کا اندازہ اگر کرنا ہے تو ان اعداد کو ضرب دہائیوں سے نہیں بلکہ سیکڑوں سے دینا ہوگی۔

یہ سب نتیجے کاہے کے ہیں۔ یہ ہر جہتی اور ہمہ وقتی دھوکا دھڑی، چھین جھپٹ، لوٹ کھسوٹ نتیجہ اس تعلیم اور اس نظام تمدن کا ہے۔" [11]

مولانا کی گہری مذہبیت نے انھیں امن اور آشتی کا جویا اور بے تعصبی اور حق گوئی کا [خوگر] بنا دیا تھا۔ مولانا کے مسلک میں ادعائیت بمنزلہ گمراہی تھی اور وہ ہمیشہ جادۂ اعتدال [اختیار] کرتے۔ مولانا نے اپنے عہد کے مسائل سے روگردانی نہیں کی اور دو قومی نظریے اور تقسیم [کے مس]ئلہ پر بھی متعدد مرتبہ اظہار خیال کیا۔ ان کے نزدیک مسلمان ہونے اور ہندوستانی [ہونے] میں کوئی تضاد یا تناقض نہیں وہ وطن سے غداری کو مسلمان کے حق میں گالی سمجھتے تھے

"(۱) ملک کے مسلم وفاداروں بلکہ جانثاروں کی فہرست کوئی مختصر سی مختصر بھی تیار کی جائے تو اس میں ایک نام ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا ضرور ہوگا۔ ہندو ووٹ کی اکثریت نے انھیں ملک کا بڑے سے بڑا اعزاز دلوایا اور کرسی صدارت تک پہنچایا۔ جن سنگھ تک ان کے حق میں کلمۂ خیر سے باز نہ رہ سکی۔ ان کی وفاداری کی قسم کھانے میں کسی سے

پیچھے نہ رہی۔ اچھا تو اس معلوم و معروف حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ کرلیجیے کہ ان کے ایک بھائی حقیقی اور عزیز بھائی پاکستانی تھے اور بڑے اونچے پاکستانی مرکزی حکومت میں وزیر تک رہے اور عین اس وقت کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ یہ تضاد و تناقض کیا۔ یہ مشرق کے ساتھ مغرب کا جمگھٹا کیسا یہ آدھی رات کو سورج کا طلوع کیسا؟

اچھا نہ کیجیے، حیرت میں نہ ذرا پڑیے، مثال انوکھی نہیں نرالی نہیں۔ آج ہندوستان میں لاکھوں بلکہ شاید کروروں ڈاکٹر ذاکر موجود ہیں ایک طرف اپنے ملک و وطن کے سو فی صدی وفادار اور دوسری طرف پاکستان کے ساتھ خصوصیت و یگانگت کے رشتوں میں جڑے ہوئے۔ بیوی یہاں تو میاں وہاں، باپ ادھر تو بیٹا ادھر، ایک بھائی ہندوستان کا رعایا تو دوسرا بھائی پاکستان کا نمک خوار۔

بارہا عرض کیا جا چکا اور آج ایک بار پھر عرض ہے کہ اسلام کی برادری مقامی نہیں آفاقی ہے، وطنی نہیں، نسلی نہیں عالمی ہے۔ ہندی مسلمان دینی روحانی ملی بھائی ہے افغانی مسلمان کا، جاوی مسلمان کا، مصری مسلمان کا، ترکی مسلمان کا، بخاری مسلمان کا، اسپینی مسلمان کا عزیزانہ بلکہ برادرانہ جذبات رکھنے والا اخلاص و وفاداری سے معمور لیکن دوسری طرف اپنے ہی دین و مذہب کے حکم کی تعمیل میں وطنی، قانونی، آئینی و جغرافیائی تقاضوں کو یاد رکھنے والا، پاس عہد و وفا پر ایمان رکھنے والا، غداری سے دور اور سازش و چالبازی سے نفور۔ غداری دوسروں کے حق میں محض ایک سیاسی جرم ہے اور مسلمان کے حق میں ایک مذہبی گالی۔ ۲۱؎

سچی باتوں کے علاوہ مولانا دریابادی نے اپنے شذروں (EDITORIAL NOTES) میں بھی دو قومی نظریہ کے مضمرات پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً:

"مسلمان جہاں کہیں بھی رہتا ہے اس ملک کا ہر ایک جزو بن کر رہتا ہے اس کے آئین کا احترام کرتا ہے اس کے قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اس ملک کی بدخواہی میں شریک نہیں ہوتا وہاں کے رسم و رواج کی، عرف عام کی پیروی کرتا ہے اور اس

عبدالماجد دریابادی نمبر ۶۰

لحاظ سے اس ملک کا جزو اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کوئی غیر مسلم ہو سکتا ہے۔ چین کا مسلمان یقیناً چینی اور امریکا کا مسلمان یقیناً امریکی ہے جس طرح دوسرے چینی اور امریکی ہوتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگ محض چینی یا امریکی ہوں گے۔ مسلمان اس کے برعکس اپنے ملی تشخص کو کسی حال میں فنا نہ ہونے دے گا وہ محض چینی یا امریکی نہیں بلکہ چینی مسلمان اور امریکی مسلمان بن کر رہے گا۔ اس کا دین، اس کی تہذیب، اس کی معاشرت، اس کی سیاست ہر شعبۂ زندگی میں دخیل ہے۔ اس لیے مسلمان اپنے وطنیت کے تقاضوں کے ساتھ اپنے دینی و ملی فرائض کا بھی پورا لحاظ رکھے گا اور یوں کہنا چاہیے کہ مسلمان قائل صرف دو قومی نظریہ کا نہیں بلکہ صد قومی نظریہ کا رہتا ہے۔" ۱۳

جیساکہ عرض کیا گیا کہ مولانا کا مسلک بنیادی طور پر رواداری، صلح، امن اور آشتی عبارت تھا چنانچہ وہ تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں گہرے تعلقات اور باہمی دوستانہ ہم کے صدق دل سے خواہاں تھے۔ ان کے نزدیک تقسیم اگر ہو ہی گئی ہے تو اسے قبول ینا چاہیے تاہم اس کے مضر اثرات سے بچا جائے:

"تقسیم یا بٹوارے کے معنی آخر عداوت کہاں سے فرض کر لیے گئے۔ بھائی بھائی میں مکان کے، جائداد کے بٹوارے آئے دن ہوا ہی کرتے ہیں اور اس کے بعد دونوں بھائی خوش خوش اور مطمئن اپنے اپنے گھر میں رہنے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ہمدرد، ہوا خواہ۔ شامت تو بس ہم ہی لوگوں پر مسلط ہوئی تھی کہ دونوں میں سے کسی ملک کو بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہیں۔ سیلون اور برما ایک نہیں دو، دو ملک بھی تو آخر ہندوستان ہی سے الگ ہوئے ہیں۔ اور وہ بھی اس زمانہ میں۔ دوستی و اتحاد کے لیے انجمنیں قائم ہوتی ہیں اور فوراً ہی بیٹھ جاتی ہیں۔ تحریکیں اٹھتی ہیں اور فوراً بجھ بھی جاتی ہیں۔ اور پھر جب خبریں اس قسم کی نظر سے گزرتی ہیں کہ لاہور میں ایک نیا علی گڑھ بسانے کی تجویز منظور ہوئی، کراچی میں ایک لکھنؤ کالونی قائم ہوئی ہے تو دل کیسا کیسا تڑپ کر رہتا ہے۔" ۱۴

مولانا دریابادی نے مسئلہ کشمیر کو موضوع گفتگو بنایا اور شاستری جی کے انتقال کے بعد اپنے کالم میں راج گوپال اچاریہ کے ایک مضمون کی تلخیص کے حوالے سے اپنے نظریہ کو واضح کیا،

"ملک و وطن کو جو حادثۂ عظیم شاستری جی کے یک بیک دنیا سے اٹھ جانے سے پہنچا ہے اس کی مصلحتیں تو ضرور خالق کائنات کے علم میں ہوں گی لیکن سوال یہ ہے کہ ہم بندوں کو اس صدمۂ عظیم سے کیونکر نپٹنا اور اس کی یادگار کیا قائم کرنا ہے! ٹکٹ پر کسی محبوب سردار کی تصویر چھاپ دینا یا سکّوں پر ان کی تصویر کندہ کرا دینا یا ان کی مورت بنا کر سڑکوں پر نصب کر دینا اس قسم کی جتنی چلی ہوئی چیزیں ہیں تمام تر سطحی اور کھوکھلی ہیں۔ ان کے نہ کوئی معنی ہیں اور نہ ان سے مقصدِ یادگار کسی طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کی مستقل، دیرپا، مفید و حقیقی یادگار کی ایک ہی شکل ہے اور وہ ہے ان کی زندگی کی آخری اور سب سے بڑی کوشش معاہدۂ تاشقند کو عملی شکل دینا اور اسی کو اپنا مستقل نصب العین بنا لینا۔ کشمیر کے مسئلہ میں اتنی اہمیت تو فریقین کی ضد نے پیدا کر دی۔ دونوں نے اسی کو دانت سے پکڑ کر اس کے نام کو دہرانا شروع کر دیا جیسے ہند و پاکستان کے درمیان مصالحت کی جان یہی ہو اور سارا غصہ گرمی اسی پر صرف ہونے لگا ورنہ حقیقتاً اسے ہرگز اہمیت کا یہ درجہ حاصل نہیں۔ حقیقی حل صرف ایک ہے وہ یہ کہ یہاں کے ۴۷ کرور اور وہاں کے ۹ کرور کی معاشی زندگی متحد و مشترک ہو جائے۔ اور جب تک یہی معاشی اتحاد نہ پیدا ہو گا ہم دونوں زبان سے آزادی کا جتنا چاہیں غل مچاتے رہیں ہم بدستور کسی نہ کسی بیرونی حکومت کی دست گیری کے برابر محتاج رہیں گے۔"[۵۱]

مولانا کے گہرے تاریخی شعور اور وسعت مطالعہ نے "سچی باتوں" کی انفرادیت اور مقبولیت کے نقش کو اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ مولانا دریابادی تاریخی حقائق سے عبرت و سبق کا درس لینے کی تلقین کرتے تھے جیسا کہ عرض کیا جا چکا کہ مولانا کی گہری مذہبیت نے انھیں مذہبی تعصب سے پاک کر دیا تھا لہٰذا اگر برادران وطن میں انھیں اچھائی کا کوئی

نظر آتا تو سچی باتوں میں اس کا برملا ذکر کرتے اور اس سے سبق لینے کا درس دیتے مثلاً:

"ڈاکٹر کاٹجو موجودہ وزیر اعلا مدھیہ پردیش، معلوم ہے کہ ایک زمانے میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ایک کامیاب ترین ایڈوکیٹ بھی رہ چکے ہیں۔ ایک اپنے تازہ مضمون (مندرجہ لیڈر) میں اپنی پچھلی زندگی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"جب میں سہارن پور اس مقدمہ کی پیشی پر پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ فریق ثانی کی طرف سے بحث کرنے والے میرے عزیز ترین دوست تھے لیکن پیشہ کی زندگی میں برابر میرے مخالف ہی۔ ہم دونوں عدالتوں میں ایک دوسرے سے زور آزمائی ہی کرتے نظر آتے تھے۔ نہ صرف ہائی کورٹ میں بلکہ کم و بیش ہر صوبہ میں ایسا قابل فاضل اپنے فن میں کامل کم ہی میرے دیکھنے میں آیا ہے"

ہے کوئی درس ان ٹھیٹھ دنیا داروں سے ہمارے دینداروں کے لیے ہمارے عالموں فاضلوں سے بھی ممکن ہے کہ کسی دوسرے عالم فاضل کا، جن سے کسی بھی مسئلہ میں اختلاف ہوا ہو، ذکر محبت کے ساتھ یا تعظیم و احترام کے لہجے میں کریں اور اگر کہیں وہ بد نصیب کسی دوسرے فرقہ یا مسلک کا ہے جب تو خیر کچھ پوچھیے ہی نہیں"۔ ١٦ے

مولانا دریابادی سچی باتوں میں اکابرین کے اقوال اور حکایتیں کثرت سے لکھتے اور ان کا بنیادی مقصد جذبہ ہم آہنگی کو فروغ دینا ہوتا تھا۔ لکھنؤ کے شیعہ سنی مناقشہ سے ان کو سخت ذہنی اذیت اور کوفت رہتی تھی اور وہ علمائے سلف کے طور و طریقوں اور اعمال و افعال کا ذکر کر کے ان دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً:

"قاضی نور اللہ شوستری کو جو مرتبہ و منزلت شیعی دنیا میں حاصل ہے اس سے کون ناواقف ہے، حد یہ ہے کہ شہید ثالث مانے جاتے ہیں، یعنی گویا حضرت حسن و حضرت حسین کے بعد انھیں کا مرتبہ ہے اور آگرہ میں ان کا مزار شاید شیعان ہند کا سب سے بڑا مرکز اور مرجع ہے۔ ساتھ ہی اہلِ سنّت میں مُلّا عبد القادر

بدایونی جو مرتبہ وحیثیت رکھتے ہیں اس سے بھی تعلیم یافتہ طبقہ میں کون ناواقف ہے۔ دورِ اکبری کے مشہور مورخ ہونے کے ساتھ ہی اپنے دینی غلو، تقشف اور تصلب کے لیے شہرت پائے ہوئے۔ غرض ایک کٹر اپنے عقیدے میں تو دوسرا متشدد اپنے مذہب میں۔ ملا صاحب کی مشہور کتاب منتخب التواریخ تین جلدوں میں ہے جس کی تیسری جلد اکبر کے زمانے کے اکابر و مشاہیر پر ہے اس میں ملاّ صاحب کے قلم سے قاضی صاحب کے لیے جو نکلا ہو کم ہی ہے۔ سب وشتم لعن و طعن سب ہی کچھ ہوگا۔ لیکن دیکھیے سارے قیاس و اندازے کے برخلاف واقعۃً ملا صاحب کے قلم سے کیا نکلتا ہے۔ ترجمہ: قاضی نوراللہ شوستری اگرچہ مذہب شیعی رکھتے ہیں لیکن عدل و انصاف، نیک نفسی، حیاداری، پاکبازی کی صفات سے متصف ہیں اور ان میں شریفوں کی خوبیاں جمع ہیں۔ حلم و علم، تیز فہمی، طباعی صفائی قلب و ذکاوت کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی اچھی اچھی کتابیں ہیں۔ اور اس طرح کی سطریں دور تک لکھتے چلے گئے ہیں۔ کوئی شیعہ دوست اس سے زیادہ اور کیا لکھے گا ایک دوسرے کو نواصب اور روافض کے لقب سے نوازنے والے اور خشونت و تندمزاجی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے والے اپنے مباحثہ و مناظرہ کو دینی تحقیق کا درجہ دینے والے کیا اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کر سکتے۔؟

بادی النظر میں سچی باتوں کے مشمولات سے جو بیشتر اخلاقی، مذہبی، ملی اور روحانی اقدار سے متعلق ہوتے تھے، یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ مولانا کی تحریریں جذباتی وفور کی زائیدہ ہوتی تھیں خصوصاً جب موضوع کی نوعیت مذہبی ہو تاہم صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ مولانا نے اکثر مذہبی موضوعات کے مضمرات کو تمثیل کے پیرائے میں واضح کیا اور اپنے زاویۂ نظر کی تشریح کی۔ اس نوع کی تحریروں پر جذباتی تحریر کا لیبل چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے مولانا مخالف تھے تاہم انھوں نے تبدیلی کی مخالفت میں کوئی زوردار جذباتی تقریر کو صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں کیا بلکہ ایک تمثیل کے حوالے سے رائے عامہ کی اہمیت اجاگر کی کہ جمہوریت میں رائے عامہ سب سے قابل احترام سمجھی جاتی ہے:

"کوئی شخص اگر کسی کے بچہ کو خواہ مخواہ پیٹنا شروع کردے اور ٹوکنے پر جواب میں یہ کہے کہ میں نے تو خود اس بچے کے باپ کو اسے پیٹتے ہوئے دیکھا ہے تو جب باپ اسے مار لیتا ہے تو میں کیوں نہ اس کی خبر لوں تو فرمائیے آپ اس جواب کی معقولیت اور اس شخص کے دماغ سے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ یہ تو ہوئی ایک تمثیل۔ اب مثال واقعی سنیے کہ "ترقی پسند" و "تہذیب پرور" سرکاری و غیر سرکاری حلقوں سے یہ صدا بلند ہونا شروع ہوئی ہے کہ فلاں فلاں مسلم ملکوں میں جب شریعت کی کتر بیونت کانٹ چھانٹ کے بعد ایک نیا مسلم قانون بن گیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایسا ہی ایک قانون ہندوستان کے مسلمان بھی اپنے لیے نہ منظور کرائیں اور طلاق، ترکہ، تعداد ازدواج کے شرعی ضابطوں میں فلاں فلاں ترمیمیں زمانۂ حال اور جدید فیشن کے مطابق اپنے ذاتی و خانگی معاملات نافذ کرالیں؟ کیا فرق ہے اس فرضی تمثیل اور اس واقعی مثال میں؟ کسی مسلم ملک نے اگر ایسی جسارت کی ہو تو وہ خود مسلمانوں کی ہی رائے ہے۔ رائے لاکھ غلط اور مہمل ہو لیکن بہر حال کہی تو وہ مسلمانوں ہی کی رائے جائے گی۔ یہاں مسلم رائے دینے والا کون سا سرکاری ادارہ موجود ہے۔ یہاں کی مرکزی پارلیمنٹ سے لے کر ریاستی اسمبلیوں اور کونسلوں تک میں کسی کے فیصلہ کو کسی درجہ میں بھی مسلم فیصلہ کہا جائے گا؟ مسلمان اول تو ان قانون ساز اداروں میں ہیں کتنے اور پھر جیسے ہیں بھی ظاہر ہے۔ یہاں کے کسی فیصلہ پر بھی اطلاق کس معنی، کس حد تک بھی مسلم فیصلہ کا ہو سکتا ہے"۔[۵۸]

مولانا کا کالم "سچی باتیں" ایک مرکزی موضوع کا تابع ہونے کے باوجود مواد کے تنوع اور اسلوب بیان کی دل کشی اور ادبی چاشنی کے باعث برصغیر کے علمی حلقوں میں بڑی دل چسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ مولانا دریابادی نے اپنے کالم میں صرف مذہبی موضوعات کی تعبیر و تشریح نہیں بلکہ اکثر حکایتوں کے توسط سے کسی مقتدر شخصیت کے تعارف کا فریضہ بھی انجام دیا۔ انھوں نے بزرگان دین کی خشکی اور مزاج کی درشتی سے متعلق مشہور عام غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا نیز اپنے کالموں میں بعض ایسے حقائق اور واقعات کا بھی ذکر کیا جن سے

متعلقہ شخص کے شخصی خصائص اور زیادہ نمایاں ہو گئے۔ مولانا دریا بادی اپنے مرشد حضرت تھانوی کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ملک کے ایک مشہور ترین شیخ طریقت اور نامور ترین عالم شریعت کا لطیفہ

اپنے مخلص اور مشہور دنداں ساز ڈاکٹر سے

"آپ کو تو سب دانت ہی دکھاتے ہیں"

وہ ڈاکٹر بھی آخر خادم کس مخدوم کے تھے، لطائف حکمت و معرفت کے ساتھ شوخی و برجستگی کا درس بھی انھیں سے پائے ہوئے جواب میں عرض کرتے ہیں

"مگر حضرت تو سب کو آنکھیں دکھاتے ہیں"

یہ لطیفہ گوئی غالب کے معیار کی ہے یا نہیں۔ ان لطیفہ گو بزرگ عالم العلماء شیخ المشائخ کا نام آپ سنیں گے؟ بغیر بتائے کسی کا ذہن بھی نہ جائے گا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ! جی ہاں مولانا ہی۔ عام تخیل بزرگان دین کا جو دلوں میں بیٹھا ہوا ہے اس کے لحاظ سے تو ایسا فقرہ کبھی کسی عالم دین یا شیخ طریقت کی زبان سے ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کو تو زاہد خشک ہونا چاہیے۔ تبسم اور شوخی کی ہوا بھی اسے نہ لگنا چاہیے اور پھر مولانا تھانوی جو اپنی خشکی و خشونت کے لیے مخالفین معاندین کے پروپیگنڈے سے نہیں زیادہ تر اپنے دوستوں اور مہربانوں کے ہاتھوں اور زیادہ بدنام ہوئے۔

وہ شہرت عام والے خشک و خش حضرت تھانوی کوئی اور ہوں گے ہم نیاز مندوں کے برسوں تک دیکھے بھالے ہوئے حضرت، جو تھے، وہ تو یہی تھے جن کی ایک جھلک ابھی آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ بے تکلف، شگفتہ مزاج، خندہ رو، بات بات میں لطیفہ پیدا کرنے والے اور بذلہ سنجی کرنے والے۔ مزاج میں حرارت و حدت بھی بے شبہ تھی لیکن اس کے موقعے دوسرے ہوتے تھے یہ نہیں کہ چہرہ ہر وقت روتا بسورتا ہوا ہو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لانا گناہ سمجھیں۔ عادۃً اور عموماً چہرہ ہر وقت شگفتہ رہتا تھا اور ایسے ایسے فقرے روزمرہ ہوتے رہتے۔ کوئی صاحب

اگر اسی طرح کے نوادر جمع کریں تو ایک خاصی ضخیم لطائف اشرفی تیار ہو سکتی ہے
بس حضرت اس شعبہ میں جس ایک چیز کی احتیاط رکھتے تھے (اور وہ سب کے
لیے قابل احتیاط ہے) وہ صرف تضحیک ہے، ایسا کوئی فقرہ زبان پر نہیں لاتے تھے
جس سے دوسرے کو شرمندگی ہو، دل شکنی ہو۔" ۱۹ء

مولانا ایک صاحب طرز ادیب تھے اور ان کے مخصوص ادبی اسلوب کی سچی باتوں پر گہری چھاپ نظر آتی تھی۔ اسلوب سے قطع نظر مولانا نے موضوع کی سطح پر بھی ادبی مباحث سے اپنی توجہ مرکوز کی اور اپنے مشہور کالم میں بعض ادبی مسائل پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا۔ اردو شاعری پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ تمام تر بدیسی ہے اور اس میں ہندوستانی عناصر بہت کم ہیں۔ مولانا سچی باتوں میں اس نقطۂ نظر کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بت، بت کدہ، دیر، صنم، خانہ، کفر، کافر، زنار، قشقہ، برہمن یہ سب الفاظ آپ نے اپنی شاعری میں، اردو فارسی شاعری میں کثرت اور بڑی کثرت سے پڑھے ہیں یا نہیں۔ ان کا استعمال محل مدح میں ہوتا ہے یا محل ذم میں؟ دینی و مذہبی اعتبار سے ان لفظوں کو آپ کی نظر میں جتنا مکروہ و مبغوض ہونا چاہیے ظاہر ہے لیکن سوال یہاں مذہبیات سے نہیں ادبیات سے متعلق ہے۔ شعر غزل میں آپ نے ان چیزوں کو اونچی سے اونچی جگہ دے رکھی ہے یا نہیں۔ شاعر صاحب ذاتی حیثیت سے لاکھ پختہ مسلمان ہوں، متقی ہوں، عابد و زاہد ہوں، لیکن شعر کے کوچے میں جب قدم رکھیں گے تو عزت و رفعت، احترام و عقیدت کے لباس پہنا پہنا کر ان لفظوں سے اپنی محفل آراستہ کریں گے یا نہیں؟ امیر خسرو دہلوی سے لے کر امیر مینائی لکھنوی تک کون اس سے بچا ہے کس نے تخیل کی دنیا میں پائے صنم پر سجدے نہیں کیے۔ کس نے بتوں کی پوجا نہیں کی ہے، کس نے اذان دینے کے بجائے ناقوس نہیں بجایا ہے اور کہا یہ جا رہا ہے کہ اردو شاعری تمام تر مسلمانوں کی شاعری ہے ہندو تصورات کو ہندو تخیلات کو کبھی اس میں منھ نہیں لگایا گیا ہے۔

مستی، کاجل، پان، کڑے، انگیا، مہندی، برسات، ساون، کوئل، پپیہا، ان سب کو ترکیبوں میں لانا ان سے مضمون پیدا کرنا اردو شاعری کا جزو شروع سے بنا چلا آرہا ہے یا نہیں۔ یہ چیزیں کیا مسلمان عرب سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ سارے تخیلات اس ملک کی پیداوار ہیں یا نہیں۔ حد یہ ہے کہ مرثیہ کی شاعری اور نعتیہ شاعری، جو تمام تر مذہبی شاعری کی قسمیں ہیں وہ تک ہندوانہ اور ہندیانہ تشبیہوں اور ترکیبوں سے خالی نہیں۔" ۲۵

سچی باتوں کے موضوعات کے اس مختصر سے جائزے سے واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا دریابادی نے اردو میں کالم کا تعلق طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ فکری مباحث سے بھی قائم کیا۔ مولانا دریابادی نے مذہبی، اخلاقی اور روحانی موضوعات کے علاوہ روزمرہ کے مسائل مثلاً رشوت خوری، شراب نوشی، قمار بازی، ہڑتال، بدنظمی، گرانی اور طلبہ کی بدامنی پر بھی اظہار خیال کیا نیز ادبی موضوعات اور سماجی مسائل کی عکاسی بھی کی۔ مزید برآں رواداری، امن صلح اور آشتی کا درس بھی دیا۔ اردو کے کسی دوسرے کالم نگار کے یہاں موضوعاتی تنوع کا اس قدر احساس نہیں ہوتا۔

مذکورہ موضوعاتی تجزیے سے قطع نظر اگر سچی باتوں کے اسلوب کا تجزیہ کیا جائے تو منکشف ہوگا کہ مولانا دریابادی کے کالم کا مزاج مختلف اسالیب کے امتزاج سے مرتب ہوتا ہے۔ مولانا دریابادی کے اسلوب کا مابہ الامتیاز عنصر طنز (IRONY) ہے جو اکثر صورتوں میں طنز کی زہرناکی کے بجائے قاری کو المیاتی احساس سے دوچار کراتا ہے۔ مولانا نے سچی باتوں میں طنز، استہزا، تمسخر، مایوسی، حسرت، تاسف اور غصہ کے اسالیب آزمائے مولانا کا اسلوب بنیادی طور پر خطیبانہ ہے جو بیشتر سوالات کی آویزش سے متشکل ہوتا ہے۔ انھوں نے تحریر کو زیادہ موثر بنانے اور قاری کو قائل کرنے کے لیے ایک خطیبانہ حربے RHETORICAL QUESTIONS سے خاصا استفادہ کیا اور اپنے کالم میں دیکھیے، ملاحظہ کریں، سنیے، سبق لیجیے، سنتے ہیں آپ، جی ہاں، ہے کوئی وغیرہ پر مشتمل خطابیہ جملے لکھ کر اپنی تحریر میں گفتگو کی سی برجستگی پیدا کر دی تھی۔ مولانا کے اسلوبی خصائص میں طنز اور استفہامیہ

لہجہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

مولانا دریابادی صحافت میں متانت وسنجیدگی کے حد درجہ قائل تھے اور وہ "سنسنی خیزی" کے ہمیشہ مخالف رہے۔ وہ صحافیوں کی غیر ذمہ دارانہ روش اور خبر لکھنے میں تصدیق کا لحاظ کیے بغیر عجلت سے بہت نالاں رہتے تھے۔ انھوں نے صحافیوں کی اسی عام روش کو ایک قصہ کے حوالے سے "سچی باتوں" میں لکھا۔ ذرا مولانا کا استہزائیہ اسلوب ملاحظہ کریں:

"زیادہ نہیں ابھی کوئی تین ہی ہفتہ کی بات ہوگی کہ ایک روز صبح انگریزی اور اردو روزناموں میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک خبر جلی اور نمایاں سرخیوں کے ساتھ درج ہے کہ ضلع بڑوچ (مغربی ہند) کے فلاں گاؤں کے سرپنچ کی بیوی کے سات بچے پیدا ہوئے۔ جڑیوں سے بڑھ کر تین ہی بچوں کی پیدائش کی خبر سنسنی خیزی میں کیا کم تھی چہ جائیکہ سات سات بچوں کی یقین نہ آیا لیکن بہرحال اخبار میں چھپی ہوئی خبر تھی۔ یقین کیسے نہ آتا۔ ابتدائً خبر بڑوچ کے کسی غیر معروف مقامی پرچہ میں نکلی بس وہیں سے بمبئی کی نامور نیوز ایجنسیاں اسے لے اڑیں اور بمبئی دلی کے روزناموں نے اسے آل انڈیا نہیں آل ورلڈ اہمیت دے دی اور ملک گیر شہرت آفاق گیر ہوگئی۔ یورپ اور امریکا سے حکم نامے دہلی کے وقائع نگاروں کے نام پہنچے کہ معًا بروچ پہنچو اور زچہ اور بچوں کے فوٹو ریڈیو تار سے روانہ کرو۔

ٹیلی ویژن کے چار کارکن کیمرے لے لے کر موٹر سے ہوا ہوئے۔ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ کچھ ہی دور چل کر موٹر بے کار ہوگئی۔ اس کی پروا کرنے والا کون تھا ہوائی اڈہ قریب ہی تھا اس پر احمد آباد کے لیے اڑے۔ احمد آباد پہنچے تو یہ زمین آسمان نکلی۔ برساتی موسم اتنا خراب کہ احمد آباد اُترنا ممکن ہی نہ ہوا۔ جہاز کا رخ بمبئی کی طرف پھیرا یہاں سے جب دم لینے کے لیے ہوٹل پہنچے تو عین اسی وقت پولیس ہوٹل پر چھاپہ مار رہی تھی کہ یہاں خفیہ مے نوشی ہوتی ہے۔ میرے شیر کیا ایسی ایسی رکاوٹوں سے کچھ دبنے والے اپنی ہار ماننے والے تھے۔ معًا پہلی

ٹرین سے بھاگم بھاگ بر وچ پہنچے۔ اور اب حقیقت خشک و بے مزہ یہ جا کر کھلی کہ سات بچے ایک جھول میں فلاں اور فلاں وقت پیدا نہیں ہوئے بلکہ سرپنچ صاحب کی دھرم پتنی صاحبہ اب تک سات اولادیں پیدا کر چکی ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

جو دوسروں کو جل دینے کے عادی تھے، وہ خود کیسا غچہ کھا گئے۔" [15]

استہزائیہ اسلوب کے بعد اب مولانا کے شہرۂ آفاق طنزیہ اسلوب کا ایک تراشہ ملاحظہ کریں:

"ماسٹروں کے پٹنے ٹیچروں کے ٹھکنے کا، استادوں کے زخمی ہو کر اسپتالوں میں داخل ہونے کا موسم آ گیا۔ جی ہاں! جس طرح موسم ایک جاڑے کا ہوتا ہے ایک گرمی کا، ایک برسات کا اور جس طرح ایک زمانہ ہوتا ہے فصل کے بونے اور بیج پڑنے کا اور ایک اس کے پکنے اور تیار ہونے کا۔ اور جس طرح فصلیں ہوتی ہیں۔ ملیریا کی، نزلہ کی اور بیماریوں کی۔ اسی طرح اور اسی قطعیت اور پابندی کے ساتھ۔ اب چند سال سے ایک مستقل موسم اس کا بھی قائم ہو گیا ہے جب ہر اخبار میں یہ خبریں نظر آنے لگتی ہیں:

"فلاں ماسٹر کو اسکول سے واپسی کے راستہ میں لڑکوں نے ٹھونک دیا۔

فلاں استاد پر نقل کرنے والے طالب علم کا شدید حملہ۔

فلاں نگراں کی عین امتحان کے ہال میں طلبہ نے مرمت کر دی۔

فلاں کالج میں نگرانوں کی حفاظت کے لیے پولیس کا دستہ طلب کرنا پڑا۔

لڑکوں نے کہہ دیا کہ نقل کرنا ہمارا حق ہے۔ کوئی قانون اسے روک نہیں سکتا

پرچہ کے جوابات امتحان گاہ کے دروازہ پر لاؤڈ اسپیکر سے پکار کر سنانے شروع کر دیے۔"

اور یہ موسم ہمارے ملک میں عموماً مارچ اپریل کا ہوتا ہے۔ جب امتحانات اوپر سے لے کر نیچے تک اور یونیورسٹیوں سے لے کر اسکولوں تک ہوتے رہتے ہیں۔

اور یہی موسم امتحانوں کے شامت زدہ نگرانوں اور نگراں کاروں کی شامت کا ہوتا ہے۔ کسی کے ہاتھ پیر ٹوٹتے ہیں، کسی کی ہڈیوں پسلیوں پر آئی گئی ہوتی ہے اور کسی کا سر کھل جاتا ہے۔ کوئی ہفتوں اسپتال میں پڑا رہتا ہے، کوئی مہینوں گھر ہی پر مرہم پٹی کراتا رہتا ہے۔ کسی کی خاطر پتھروں اور گھونسوں سے کی جاتی ہے، کسی کی لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے۔ اور کسی کسی کی جوتوں اور چپلوں سے۔ اور پولیس اور مجسٹریٹ اور تعلیمات کے حاکم اعلیٰ سارا تماشہ بے بسی کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں کہ یہ دور ہے آزادی کا اور صاحبزادوں کی یہ ساری سعادت مندیاں عین علامت و دلیل ہیں ترقیوں کی۔ اچھا ہے صدیوں تک استادوں' ماسٹروں' مولوی، پنڈتوں نے حکومت قمچی اور ڈنڈے اور بید کے زور سے کرلی۔ اب خود تو اپنے برخورداروں کے ہاتھوں مزہ چکھیں کہ پٹنے اور مار کھانے اور ہاتھ پیر تڑانے کی سیر بھی کیسی رہتی ہے خصوصاً ادھیڑ سن یا بڑھاپے میں۔" ۲۲

مولانا نے طنز، تمسخر اور استہزا کے ساتھ غم، غصہ اور خوف کے اسالیب بھی آزمائے اور رعایت لفظی، تلمیح، استعارہ، کنایہ، ضلع جگت اور اشعار نیز مصرعوں کے برمحل استعمال سے اپنے اسلوب کی انفرادیت کا تعین کیا۔

مولانا دریابادی کے کالم کا اہم ترین وصف ادبی اور علمی اسلوب بیان ہے۔ مولانا نے اپنی تخلیقی فطانت اور علمیت کے وسیلۂ اظہار کے طور پر ایک صحافتی صنف کالم کو اختیار کیا اور مواد اور اسلوب دونوں سطحوں پر اس صنف کے منظر نامے کو وسیع کیا۔ مولانا دریابادی نے ادبی جمود اور تعطل کے دور میں "کالم" کو مکالمہ کا بنیادی ذریعہ بنایا اور اسی کی وساطت سے معاشرتی اصلاح کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کی۔ مولانا کے کالم "سچی باتیں" کا حوالہ موضوعاتی تنوع اور اسلوب بیان کی ندرت کے باعث اردو کالم نویسی کی روایت میں ناگزیر رہے گا۔

حواشی

۱۔ نقوش آپ بیتی نمبر صفحہ ۱۰۷۹
۲۔ صدق جدید ۸ر اگست ۱۹۵۸ء
۳۔ صدق جدید ۹ر مئی ۱۹۵۸ء
۴۔ " " ۲۶ر اکتوبر ۱۹۵۱ء
۵۔ " " ۹ر نومبر ۱۹۵۱ء
۶۔ " " ۲۷ر ستمبر ۱۹۷۱ء
۷۔ " " ۹ر مئی ۱۹۵۸ء
۸۔ " " ۳۰ر مئی ۱۹۵۸ء
۹۔ " " ۷ر مارچ ۱۹۵۸ء
۱۰۔ " " ۲۳ر مارچ ۱۹۵۱ء
۱۱۔ " " ۳۰ر مئی ۱۹۵۸ء
۱۲۔ " " ۲۰ر اگست ۱۹۷۱ء
۱۳۔ " " ۱۵ر اگست ۱۹۵۸ء
۱۴۔ " " ۱۹ر اکتوبر ۱۹۵۱ء
۱۵۔ " " ۴ر فروری ۱۹۶۶ء
۱۶۔ " " ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۸ء
۱۷۔ " " ۱۰ر ستمبر ۱۹۷۱ء
۱۸۔ " " ۱۶ر مارچ ۱۹۶۶ء
۱۹۔ " " ۲۳ر مارچ ۱۹۵۱ء
۲۰۔ " " ۱۱ر مارچ ۱۹۵۱ء
۲۱۔ " " ۲ر مئی ۱۹۵۸ء
۲۲۔ " " ۱۲ر اگست ۱۹۶۶ء

نصرت علی صدیقی

مولانا عبدالماجد دریابادی
ایک صحافی کی حیثیت سے

مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے پہلی بار لکھنؤ کے ہفتہ وار سچ
میں اگست ۱۹۲۵ء سے آنا شروع ہوا۔ یہ پرچہ جنوری ۱۹۲۵ء سے جاری ہوا تھا۔ مولانا دریابادی
سچ کے بانیوں میں مولانا ظفر الملک علوی اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کے ساتھ شامل تھے مشورں
میں کچھ عرصے تک مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی بھی شریک رہے مگر پھر وہ کلکتہ چلے گئے۔ سچ
نکالنے کا فیصلہ جیسا کہ مولانا عبدالماجد نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے ان لوگوں نے مولانا ظفر الملک
کے ماہ نامہ الناظر کے دفتر میں بیٹھ کر کیا تھا اور ان کے درمیان طے پایا تھا کہ پرچے کے مہتمم مولانا
ظفر الملک رہیں گے اور ایڈیٹری میں بھی انہی کا نام رہے گا۔ مولانا دریابادی کی حیثیت شریک
مدیر کی تھی۔ پہلے پرچہ میں تینوں آدمیوں کے نام سے مضامین شائع ہوئے۔ تینوں کہنہ مشق
تھے۔ اور جہاں تک مولانا عبدالماجد دریابادی کا تعلق ہے ان کی مشق ۱۹۰۴ء سے جاری
تھی جب انھوں نے علی گڑھ کے روشن خیالوں کے جواب میں ایک مضمون لکھا اور اسے کسی
دوسرے کے نام سے لکھنؤ کے اودھ اخبار میں شائع کرا دیا۔ اپنا نام اس ڈر سے پوشیدہ
رکھا تھا کہ کہیں والد صاحب یہ کہہ کر ڈانٹنے نہ لگیں کہ کورس کی طرف سے بے توجہی برت رہے ہو۔
اس وقت وہ صرف ۱۲ برس کے تھے۔ بہ قول ان کے "پہلے مضمون کا نکلنا تھا کہ جھجک مٹ
گئی اور بہاؤ کھل گیا۔" اودھ اخبار کے علاوہ ریاض الاخبار، ماہنامہ عصر جدید اور الندوہ،
ہفتہ وار البشیر، ماہنامہ الناظر لکھنؤ اور ادیب الہ آباد نیز دوسرے اخباروں اور رسالوں میں

ان کے مضامین اور تبصرے شائع ہونے لگے ۔ کچھ مضامین ملک کے باہر بھی چھپے ۔ مثلاً کیمبر
کے اردو ماہ نامے نوائے کیمبرج میں ۔ پہلے اپنا نام چھپائے رہے پھر اپنا نام چھپوانے لگے شرو
میں جیسا کہ انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے طریقہ یہ تھا کہ "کہیں سے کچھ لیا اور کہیں سے کچھ، او
کاٹ چھانٹ کر ایک مضمون تیار کر ڈالا۔" بہت سے مضمون نگار ایسا کرتے ہیں مگر اس کا اقبال
نہیں کرتے ۔ مولانا دریابادی نے اپنی صفائی سے زیادہ اُن کی صفائی پیش کرتے ہوئے آپ بیتی
میں لکھا ہے کہ:

"چوری نہ سہی، رہزنی نہ سہی لیکن یہ بہر حال قلمی چابک دستی اور صنعت گری بھی تو ایک فن ہے اور اس فن کے سبق میں نے اسی سن میں پڑھ لیے ۔"

لیکن قلمی چابک دستی کے علاوہ انھوں نے اپنی ذہانت اور مطالعے کی عادت سے بھی
فائدہ اٹھایا۔ اس عادت نے طالب علمی کے ابتدائی زمانے ہی سے ایک علت کی شکل اختیار کر لی
تھی اور اسی لیے اپنی مضمون نگاری کے ابتدائی دور ہی میں انھوں نے شبلی کی کتاب الکلام پر
ان سے عقیدت کے باوجود کوئی سوا سو صفحے کی تنقید لکھ ڈالی جو مولانا ظفر الملک نے اپنے ماہ نامہ
'الناظر' میں چھاپ بھی دی ۔ اپنے اس مضمون کو مولانا نے آپ بیتی میں "ملحدانہ" کہا ہے ۔ شاید اسی
لیے مضمون نگار" ایک طالب علم" ہی رہا ۔ اور الناظر نے اس وجہ سے چھاپ دیا کہ وہ شبلی سے کد
رکھتا تھا ۔ لکھنؤ سے نکلنے والے روز نامہ ہمدم کے مضمون نگاروں میں مولانا عبد الماجد دریابادی
شروع ہی سے شامل تھے ۔ اور اس پرچے کے ایڈیٹر سید جالب دہلوی جیسے نامور صحافی تھے ۔
برج نرائن چکبست کے ماہ نامے صبح امید اور سید سلیمان ندوی کی ادارت والے معارف
میں بھی مولانا کے مضامین چھپنے لگے ۔ معارف سے باضابطہ تعلق ۱۹۱۹ء میں قائم ہو گیا تھا اور
کچھ نقد معاوضہ بھی ملنے لگا تھا ۔ لیکن معاوضے کی ابتدا الناظر اور ادیب سے ہوئی تھی ۔ شرح
ایک روپیہ فی صفحہ تھی جو مولانا کے خیال میں اس وقت کے معیار کے حساب سے خاصی اونچی تھی ۔
وہ مولانا محمد علی کے روز نامہ ہمدرد میں بھی لکھتے تھے ۔ اور جب ۱۹۲۴ء میں یہ پرچہ دوبارہ
نکلا تو انھیں صلاح مشورے کے لیے دہلی بلا یا گیا ۔ چند روز ٹھہر کر واپس آ گئے پھر دریاباد سے
اس کے لیے مضامین اور نوٹ وغیرہ لکھ لکھ کر بھیجتے رہے ۔ ۱۹۲۹ء میں جب مولانا محمد علی

ذیابیطس کے علاج کے لیے یورپ جانے لگے تو ہمدرد کے انتظامی معاملات مولانا ظفر الملک کے اور ادارتی معاملات کی نگرانی مولانا عبدالماجد کے سپرد کر گئے۔ یہ دونوں آدمی برابر دہلی آتے جاتے رہے اور لکھنؤ سے 'سچ' بھی نکالتے رہے۔

مولانا نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ ان ہی کی تجویز پر مولانا ظفر الملک نے ان کی زیر نگرانی لکھنؤ سے ۱۹۱۹ء میں ہفتہ وار حقیقت نکالا اور ان کے ایک عزیز اور شاگرد جلیس انیس احمد عباسی کو ایڈیٹر مقرر کر دیا مگر مدتوں اس کی ادارت کا بڑا حصہ مولانا دریابادی ہی پس پردہ انجام دیتے رہے۔ البتہ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی مداخلت ایڈیٹر صاحب کو گراں گزر رہی ہے تو ۱۹۲۰ء میں وہ خود ہی خوش اسلوبی سے کنارہ کش ہو گئے۔

سچ میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کا ساتھ ۱۹۲۶ء میں ان کی وفات نے توڑ دیا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی پہلے ہی کلکتہ کے ہو رہے تھے اور وسط ۱۹۲۵ء کے جس زمانے میں پرچے کی مالی دشواریاں بڑھیں اسی زمانے میں مولانا ظفر الملک ایڈیٹری سے الگ ہو گئے۔ البتہ وہ مہتمم بنے رہے۔ مولانا عبدالماجد کا کہنا ہے کہ وہ ایڈیٹری کا کام تمام تر اعزازی طور پر کر رہے تھے اور پرچے کی آمدنی مولانا ظفر الملک کو جاتی تھی۔ جب تک پرچہ نکلتا رہا دونوں مل کر کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۴ مئی ۱۹۳۰ء کو مولانا ظفر الملک لکھنؤ میں خلاف اجازت قومی جلوس نکالنے کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے اور اسی روز ۶ ماہ کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔ پھر جولائی کا پرچہ طبع ہو کر شائع ہونے ہی کو تھا کہ اخبار کے ناشر اور الناظر پریس کے مہتمم سید محمد صدیق صاحب سے کوئی وجہ بتائے بغیر اور پرچے کے ایڈیٹر سے کسی معاملے میں کوئی بازپرس کیے بغیر صوبائی حکومت نے پریس آرڈیننس کے تحت ایک ایک ہزار روپے کی دو ضمانتیں طلب کر لیں اور زر ضمانت جمع کرنے کے لیے صرف دو روز کی مہلت دی گئی۔ نومبر میں 'سچ' اور مہتمم سچ نے تقریباً ساتھ ہی ساتھ قید فرنگ سے رہائی پائی۔ مگر دو ہی برس بعد پھر قرآن مجید کے انگریزی ترجمے اور تفسیر میں مصروفیت کی وجہ سے اور اس کام کے لیے درکار یکسوئی کے تقاضے کی بنا پر مولانا عبدالماجد نے پرچے کے التوا کا اعلان کر دیا۔ دو برس بعد جب انھوں نے پرچہ دوبارہ نکالنا چاہا تو ان کا بیان ہے کہ ظفر الملک صاحب نے پرچے کو اپنی ملکیت قرار دیا اور اس کا نام تک مولانا عبدالماجد کو دینے

کے لیے راضی نہیں ہوئے۔ فرنگی محل کے بزرگ مولانا عنایت اللہ کو حکم بنایا گیا اور بہ ظاہر ان شہادتوں کی بنا پر جو 'سچ' کے صفحات پر موجود تھیں حکم کا فیصلہ مولانا ظفر الملک کے حق میں گیا۔ 'سچ' کے جانشین کے لیے مولانا عنایت اللہ نے 'صدق' کا نام تجویز کیا اور اس کی طباعت اور اہتمام کے لیے حق اخبار اور پریس کے مالک عبدالرؤف عباسی صاحب سے یہ طے پایا گیا وہ مولانا کو پرچے کے نفع میں دس فیصدی حصہ دیں گے۔ صدق کا پہلا پرچہ مئی ۱۹۳۵ء میں نکلا اور گاڑی لشتم پشتم ۱۴ برس تک چلنے کے بعد ستمبر ۱۹۵۰ء میں پھر ٹھپ ہوگئی۔ مولانا پرچے کی طرف سے مایوس اور دل شکستہ ہو چکے تھے مگر بعض عزیزوں، ہمدردوں اور نیازمندوں نے ہمت دلائی اور انتظام و اہتمام کی ذمہ داری لینے پر آمادہ ہو گئے تو مولانا بھی پرچہ نکالنے پر راضی ہو گئے مگر جس طرح 'سچ' کا دوبارہ اجرا ناممکن ہو گیا تھا صدق کا دوبارہ اجرا بھی ناممکن ہو گیا۔ صدق مرحوم کے مہتمم صاحب نے بھی پرچے کے پرانے نام کو اپنی ملکیت قرار دیا اور نیا پرچہ نئے انتظام میں "صدق جدید" کے نام سے دسمبر ۱۹۵۰ء میں نکل آیا جو مولانا کی رحلت کے بعد بھی کچھ عرصے تک جاری رہا۔

ملکیت کے جھگڑوں بکھیڑوں کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ مولانا میں انتظامی صلاحیت نہ ہونے کے برابر تھی اور انتظامی نقائص کی نشان دہی اُن کے پرچوں کی ظاہرا شکل صورت سے بھی ہوتی تھی۔ کتابت خراب، چھپائی خراب اور معمولی سے معمولی کاغذ کے ۲۰ سینٹی میٹر چوڑے اور ۳۳ سینٹی میٹر لمبے آٹھ صفحے کے پرچے کی قیمت پہلے ڈیڑھ آنے تھی اور تیسرے جنم میں بیس نئے پیسے یعنی سالانہ دس روپے۔ لیکن اس بدصورت گدڑی میں انمول لعل و جواہر لپٹے ہوئے ملتے تھے جن کو قدرداں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ سچ میں کچھ نوٹ مولانا ظفر الملک بھی لکھتے لیکن زیادہ تر تحریریں مولانا عبدالماجد ہی کی ہوتی تھیں۔ تینوں پرچے ان ہی کے برتے پر نکلتے تھے۔ اسی لیے ایک بار وہ بیمار پڑ گئے تو سچ نہیں نکل سکا۔ لعل و جواہر بلاشبہ تمام تر ان ہی کی ملکیت تھے۔

ہندو مسلم اتحاد

جس لائحہ عمل کا سچ کے پہلے پرچے میں اعلان کیا گیا تھا اسی ڈگر پر صدق بھی چلا اور

صدق جدید تھی۔ پہلا اور اصلی کام اسلامی شریعت کی روشنی میں مسلمانوں کی زندگی کی اصلاح تھی۔ دوسرا کام آزادیٔ ملک قرار پایا اور "غاصب و ظالم حکومت سے آزادی کے لیے ہر ممکن کوشش" کو "مسلمانوں کے لیے ایک فرض ایمان" کہا گیا۔ سچ نے اپنے لیے تیسرا کام یہ رکھا کہ "جہاں تک اس کے بس میں ہے مسلمانوں اور ہندوستان کے غیر مسلموں کے درمیان اچھے اور خوش گوار برتاؤ کو ترقی دے اور اس وقت بدقسمتی سے جو فساد کی رو دوڑی ہوئی ہے اسے مٹائے" اس لیے کہ "جب آزادیٔ ملک کی کوشش میں دوسری قوموں کا ساتھ ہونا ضروری ہے تو اپنے مذہبی حقوق کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ ہمسایہ قوموں کے ساتھ میل جول اور اچھے برتاؤ کا قائم رکھنا ایک مذہبی فرض ہو جاتا ہے۔"

سچ نے اپنے پہلے پرچے کے جس مضمون میں اپنے کاموں کا تعین کیا وہ مولانا عبدالماجد ہی کا لکھا ہوا تھا۔ یہ مضمون بامقصد صحافت کا ایک نمونہ تھا اور یہ تعین اس اعتبار سے بروقت تھا کہ لوگ مذہب کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹتے جا رہے تھے، آزادی کے لیے چلائی جانے والی تحریک خلافت دم توڑ چکی تھی اور ہندو مسلم اختلافات نے چند مہینے پہلے لکھنؤ میں سر پھٹول کی صورت اختیار کر لی تھی جس کے اثرات پوری طرح ختم نہیں ہوئے تھے۔ سچ نے وجود میں آتے ہی اپنا سہ رخی جہاد شروع کر دیا۔ اس کے اولین مخاطب قدرتی طور پر مسلمان ہی تھے لیکن اس نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ کرنے کی نہیں دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی۔ مولانا عبدالماجد نے لکھا:

> "جس طرح مذہب اسلام میں کوئی ایسی بات ذرہ بھر بھی نہیں موجود ہے جو دوسروں کے لیے اشتعال انگیز ہو اسی طرح ہندوؤں کا مذہب بھی ایسے امور سے پاک ہے جو مسلمانوں کا ان سے مقابلہ و تصادم لازم کر دیں۔ ایسی صورت میں اگر دونوں فریق آپس میں لڑ بیٹھتے ہیں اور اس کا ذمہ دار اپنے مذہبی اختلافات کو ٹھہراتے ہیں تو ظاہر ہے کہ مذہب کو ذمہ دار ٹھہرانا کسی معنی میں بھی درست نہ ہوگا۔ نفاق و جنگ کی ذمہ داری اُن چیزوں پر آتی ہے جو مذہب سے بالکل الگ ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان چیزوں پر جنھیں غلطی سے کسی فریق نے یا دونوں فریقوں نے اپنے مذہب کا

جزو سمجھ لیا ہے۔"

ایسی ناسمجھیوں کا نتیجہ فسادات کی شکل میں رونما ہوتا رہتا ہے اور مولانا عبدالماجد نے فسادات کے "موسم" کی بابت اپنے پرچے مورخہ ۱۹ رجون ۱۹۲۵ء میں لکھا:

"اب ہمارے سب بھائیوں کو خوب سوچ لینا چاہیے کہ دل کی ستھرائی اور پرہیزگاری کا ثبوت ہم کس طریقے پر دے سکتے ہیں، آیا اپنے ہم جنسوں کو سمجھا بجھا کر ان سے صلح و آشتی کا رشتہ قائم رکھنے سے یا ان کی نادانی و جہالت کے مقابلے میں خود بھی نادان و جاہل بن جانے سے۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں قلم اور منھ میں زبان ہے انھیں اپنی ذمہ داری کو خاص طور پر محسوس کرنا چاہیے اور اپنے دل میں فیصلہ کر لینا چاہیے کہ مخالفین کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے خدا اور بندوں کے نزدیک کون سی روش زیادہ پسندیدہ اور کامیاب ہو سکتی ہے۔ آیا شیریں کلامی اختیار کرنا اور ان کا دل اپنے ہاتھ میں لینا؟ یا تلخ گفتاری سے کام لینا اور ان کی ضد کو اور بڑھانا؟"

اسی سچ کو سچ اخبار نے بار بار دوہرایا، مثالوں سے سمجھایا اور دلیلوں سے ثابت کیا۔ مولانا نے ہندو مسلم نااتفاقی کو از روئے قرآن نامناسب قرار دیا اور مادی سائنس کے ماہرین تنازع للبقا یعنی STRUGGLE FOR EXISTENCE کا جو نظریہ پیش کرتے ہیں اس کے جواب میں اتحاد للبقا کا اسلامی نظریہ پیش کیا اور کہا کہ خدا کے جوڑے ہوئے رشتوں کو توڑنا اور کاٹنا، یہی سب سے بڑی گمراہی اور قانون الٰہی میں سب سے بڑی نافرمانی ہے۔

(سچ، ۲۷ر فروری ۱۹۲۵ء)

تحریک خلافت سے تعلق کی وجہ سے مولانا عبدالماجد کو مسلم ملکوں کے معاملات سے بھی دل چسپی پیدا ہوئی اور سچ کے صفحات میں نجد و حجاز کی کش مکش کا تذکرہ بھی آیا مگر مولانا نے ہندوستان کے مسلمانوں سے کہا کہ وہ دوسرے مسلم ملکوں کی آزادی اور خوش حالی کے لیے اگر کوئی موثر کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اپنے ملک میں آباد دوسرے فرقوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کو آزاد کرا لیں۔ اس نقطہ نظر نے مولانا کی صحافت کو وسیع النظر بنا دیا۔

"اسلام اور رواداری" سچ کا ایک مستقل عنوان تھا جس کے تحت رسولؐ کی سیرتِ صحابہ
ام کی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کے ایسے معاملات اور واقعات کو اجاگر کیا جاتا جو انسانی بھائی
رہ کو اسلامی طرزِ زندگی کا ایک بنیادی جز ثابت کرتے۔ اس ضمن میں جو کچھ لکھا گیا اس کی
رورت اور افادیت جتنی ۱۹۲۵ء میں تھی اتنی ہی آج ۱۹۹۰ء میں ہے۔ ان پھولوں کی خوشبو
رتازگی ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔

...دابہار باتیں

اور وہ باتیں ہمیشہ یاد رکھنے والی ہیں جو مولانا عبدالماجد کے اخباروں نے آزادی
ی تحریک کو تقویت پہنچانے اور اس تحریک کے مخالفوں کو جواب دینے کے لیے لکھیں۔ عدم
شدد کی افادیت ثابت کرنے کے لیے انھوں نے قرآن کو سند بنایا اور چرخے کی حمایت میں
یک پورے صفحے کا مضمون لکھا جس میں احادیث کے حوالے سے بتایا گیا کہ چرخہ رسول اللہ صلعم
و مرغوب تھا اور ام المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ کا یہ قول نقل کیا گیا کہ چرخہ شیطان کو بھگاتا ہے
ور رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ جس عورت کے سوت کی بیڑی زیادہ لمبی ہوگی وہی عورت
زیادہ ثواب والی ہوگی۔

نمک ستیہ گرہ میں جس قانون کو توڑا جا رہا تھا اس کی مخالفت میں بھی مولانا نے احادیث
کا حوالہ دیا اور جب ایک سرکار پرست کے مکان پر کچھ مسلمان دوکان داروں نے جلسہ کر کے سرکار
سے کہا کہ وہ ستیہ گرہیوں کو ان کی دوکان داری میں خلل ڈالنے سے روکے تو مولانا نے ان کو
سرزنش کرتے ہوئے لکھا:

"اپنی اس بے غیرتی اور خود غرضی کا مظاہرہ کرنے سے قبل آن حضرات نے
صاف صاف اس کا اعلان کیوں نہ فرما دیا کہ ہمیں اسلام کے فرائض و حقوق، دین
کے نفع نقصان سے کیا غرض۔ ہمارا دین اور ہمارا ایمان تو نفع کے پیسے ہیں اور بس!
اس اعلان کے بعد کم از کم ملتِ اسلامیہ تو اس ننگ کے داغ سے محفوظ رہتی۔"

(سچ ۱۶ رمئی ۱۹۳۰ء)

تحریکِ آزادی کے زمانے کی بعض بحثیں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں برابر اٹھتی رہتی ہیں
مولانا عبدالماجد نے ایک بامقصد صحافی کی حیثیت سے ان معاملوں پر جو کچھ لکھا وہ سدا
ہے ۔ مثال کے طور پر 'پہلے مسلمان یا پہلے ہندوستانی' والی بحث کو لے لیجیے ۔ اس کے مت
مولانا نے ۵ / جون ۱۹۲۵ء کے سچ میں لکھا :

"مسلمان سے یہ سوال کرنا کہ وہ پہلے مسلمان ہے یا ہندوستانی ، سرے سے بے معنی ہے ۔ مسلمان پہلے بھی مسلمان ہے ، آخر میں بھی مسلمان ہے ، درمیان میں بھی مسلمان ہے ۔ کوئی وقت اور کوئی حالت اُس کے لیے مسلمان نہ رہنے کی ممکن ہی نہیں ۔ وہ وطن کی خدمت اس لیے ہرگز نہیں کرتا کہ اسے ایک خدمت اپنے مذہب کی کرنا ہے اور دوسری وطن کی ، بلکہ اس لیے کہ وطن کی آزادی میں کوشش کرنا عین خدمت مذہب ، عین فریضۂ اسلامی ، عین حکمِ الٰہی کی تعمیل ہے ۔" (سچ ۵ / جون ۲۵ء)

اسی مسئلے اور اپنے مسلک کی مزید وضاحت انھوں نے ۱۰ / جولائی کے پرچے میں اس طرح

"انسان کی اصلی حیثیت زمین وجود پر قدم رکھنے کے بعد ایک اور صرف ایک ہوتی ہے ۔ یعنی وہ بندہ ہوتا ہے ۔ اُس کی پیدائش کی غرض و غایت محض بندگی ہے ۔ دنیا میں اس کے تعلقات جو کچھ ہوتے ہیں وہ سب اسی اصل کی شاخیں ، اسی متن کی شرحیں ، اسی اجمال کی تفصیلات ہوتے ہیں ۔ بجائے خود کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے ۔ اسلام اسی بندگی کی دعوت دینے آیا ہے ۔ اس نے جب انسان کو اچھا بندہ بنا دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے ایک ہی وقت میں اچھے فرزند ، اچھا ہمسایہ ، اچھا شہری ، اچھا طالب علم ، اچھا حاکم ، اچھا محکوم ، اچھا بزرگ ، اچھا خرد ، اچھا آقا ، اچھا غلام ، اچھا تاجر ، اچھا کاشت کار ، اچھا پیشہ ور غرض اس کی بے شمار اضافی حیثیت میں اسے ہر طرح اچھا ہی بنا دیا ۔ جب نسبت حقیقی درست ہو گئی تو اضافی نسبتوں کی تفصیل بیان کرنا بالکل غیر ضروری ہو گیا ۔ جب کسی شخص کی بابت یہ کہہ دیا گیا کہ وہ تندرست ہے تو کیا یہ سب کچھ بیان کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ اسے طاعون نہیں ، وہ دق کا مریض نہیں ، وہ فالج کا شکار نہیں ، وہ

ہیضہ میں مبتلا نہیں۔"

تحریک پاکستان

مولانا عبدالماجد کی سیاست اور صحافت کے رُخ میں قیام پاکستان کی تحریک کے آگے بڑھنے پر کچھ تبدیلی آگئی۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اس تحریک میں مذہب کا سہارا لیا گیا اور مذہب کو مولانا بھی اپنی صحافت میں شروع ہی سے ایک بنیادی محوری حیثیت دے رہے تھے۔ اسی لیے ان کے دل و دماغ میں اس تحریک کے لیے ایک نرم گوشہ اور ان کی صحافت میں اس کے لیے ایک تائیدی انداز پیدا ہو گیا۔ لیکن پاکستان کے شب و روز دیکھ کر انھوں نے قیام پاکستان کے کوئی ۲۲ برس بعد "بنیاد پاکستان" کے ایک "محاسبہ" میں لکھا کہ:

"مطالبہ پاکستان کی بنیاد اگر دینی ہوتی تو ظاہر ہے کہ بیعت کسی مشہور مولوی مولانا کے ہاتھ پر کی جاتی اور خود جناح صاحب کے عقائد پر ہر طرف سے نکتہ چینی اور خُردہ گیری شروع ہو جاتی۔ اور مولوی صاحبان ان کی وضع ظاہری پر فتویٰ دینے سے کسی طرح باز نہ آتے ۔۔۔۔ (لیکن) جب تحریک پھیلی اور اس کے قدم جم لیے تو عام مسلمانوں میں اپنی سادہ دلی سے قدرتاً یہ خیال پیدا ہوا کہ جب حکومت اپنی ہوگی تو لازمی طور پر قانون اسلام رائج ہوگا اور اس فریب نفس میں مبتلا ہو جانے والے بے شمار حامی مسلمانوں میں ان سطور کا راقم اور صدق کا مدیر بھی تھا۔ علما میں مخلصین اور تہجد گزاروں کی ایک بڑی تعداد بے شبہ تھی۔ لیکن وہ بے چارے موجودہ سیاست کی باریکیوں اور پیچیدہ گتھیوں کو کیا سمجھتے، ان کے ذہن میں حکومت کا تمامتر وہی سادہ نقشہ تھا جو کروسیڈز (حروب کلیبہ) کے زمانے میں آج سے سیکڑوں سال قبل تھا جب مسلموں غیر مسلموں میں جنگ، جہاں کہیں بھی ہو، بڑی آسانی سے جہاد دینی کی شکل اختیار کر لیتی ۔۔۔۔ اخوت اسلامی سب سے زیادہ جاذب نظر اور سب سے بڑھ کر موثر و کارگر کلمہ نظر آرہا تھا۔ اور کسی کا ادھر ذہن بھی جا سکتا ہے کہ مشرقی بنگال، اور سندھ و بلوچستان کے درمیان آب و ہوا کا شدید اختلاف، زبانوں کا کامل اختلاف، لباس و وضع کے

عام ثقافتی اختلاف کبھی کبھی اشتراک کلمہ کے ہوتے ہوئے حائل راہ بن سکتا ہے!"

مولانا نے لکھا ہے کہ:

"مطالبہ پاکستان کی قریب ترین مثال علی گڑھ کالج کی ہے۔ سر سید نے جب اس کی تحریک اٹھائی تو ان کا مقصود اصلاً اور براہِ راست قوم مسلم کی دنیوی فلاح تھی۔ فلاح دین بھی مقصود تھی لیکن ضمناً و تبعاً۔ فلاح دین کو بطور اصل مقصد کے رکھنے والا کوئی ولولہ نہ تھا۔" (صدق جدید ۲۱ مارچ ۱۹۶۹ء)

اسی طرح بقول مولانا دریابادی پاکستان کا اصل مقصد بھی دنیوی حکومت حاصل کرنا تھا۔

ان باتوں میں مولانا کی صحافتی دیانت اور حقیقت پسندی نمایاں طور پر جھلکتی ہے لیکن کیے کی لاج نے اور واپسی والے راستے کی دشواری نے اور غالباً رسوائی اور بدنامی کے ڈر نے انھیں حیلہ جوئی اور تاویل گری پر مجبور کر دیا۔

پاکستان میں جب جنرل ایوب خاں نے ۱۹۶۹ء والا مارشل لا نافذ کیا تو "مارشل لا کی بابرکت دیوی" کا خیر مقدم کرتے ہوئے مولانا نے اس بات پر اطمینان ظاہر کیا کہ مغربی پاکستان میں جو کارخانے مدت سے بند تھے چالو ہو گئے، راولپنڈی کے سرکاری دفتر برسوں کے بعد صبح ٹھیک سات بجے کھل گئے۔

"مشرقی پاکستان آج پورے پانچ مہینے کے بعد امن و سکون کے معنی سے آشنا ہوا۔ جناب بھاشانی صاحب جو کل تک جان ہتھیلی پر رکھے نظر آتے تھے معلوم ہوا کہ وہ ڈھاکے سے ۵۰ میل کسی مقام میں تشریف فرما ہیں۔ سبحان اللہ نعرۂ شہادت اور رجز و مبارزت کے خوابوں کی یہ خوب تعبیر نکل آئی، دم بھر میں اور آناً فاناً! جناب ایوب خاں خدا معلوم اس کے لیے اپنے ہزاروں مخلصوں کی جانیں ضائع جانے کا راستہ کیوں دیکھا کیے

سخن حق ہمہ پیمانہ ذوق تحسین

یہ معلوم ہوتا کہ مارشل لا بھی کسی قسم کی دیوی جی ہیں تو انھیں اول ہی دن سے بڑی خاطروں، بڑی التجاؤں کے ساتھ بلا بھیجا جاتا! اور اب جب ان کے قدم میمنت لزوم

کی یہ برکتیں ظہور میں آچکی ہیں تو انھیں رخصت کرنے میں ہرگز جلدی نہ کی جائے۔"

(صدق جدید ۱۱/ اپریل ۱۹۶۹ء)

سیکولرازم اور جمہوریت

مولانا دریابادی نے پاکستان کے سیاسی اور حکومتی نظام کے اسلامی بن جانے کا خواب تو دیکھا تھا مگر اس خواب کے صحیح ثابت ہونے کی طرف سے جلد ہی مایوس ہو گئے۔ انھیں پاکستان کے پوری طرح سیکولر بن جانے کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ البتہ وہ ہندوستان میں سیکولرازم سے انحراف کی گرفت برابر کرتے رہے اور سیکولرازم کے مظاہر کی تعریف بھی کرتے رہے۔

اس ضمن میں انھوں نے گاندھی جی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر بھگوان داس، راج گوپال چاری، جے پرکاش نرائن جیسے افراد، ان کے اعمال اور تعلیمات کا ذکر بار بار کیا اور جب حیدرآباد کے کسی ریڈی صاحب کی بیٹی کی شادی کا رقعہ اردو الفاظ اور مسلم طرز میں لکھا ہوا ملا تو یہ یاد دلاتے ہوئے کہ یہ زمانہ "نظام عالی مقام" کا نہیں بلکہ مئی ۱۹۷۲ء کا ہے' مولانا نے لکھا:

"قومی یک جہتی کا لفظ اخباروں میں بار بار نظر آتا رہا ہو گا۔ عملی نمونہ اس شان کے ساتھ آج پہلی بار دیکھنے میں آیا۔"

معاملہ ضمنی اور سطحی ہے اور اس میں طنز کا عنصر بھی شامل ہے لیکن اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی کتنی زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اپنے اخبار کے صفحات محدود ہونے کے باوجود ان باتوں کا نوٹس کس فراخ دلی سے لیتے تھے جس طرح انھوں نے راجستھان میں ایک مسلمان کانگریسی کے وزیر اعلا منتخب کر لیے جانے پر لکھا کہ:

"سیکولرازم کو اگر محض کاغذی نہیں عملی بن کر رہنا ہے تو یہ تقرر اس کی طرف ایک صحیح قدم ہے۔" (صدق جدید ۲۳/ جولائی ۱۹۷۱ء)

اسی طرح سرکاری تقریبات میں ایک ہی طریقے کی مذہبی رسوم کو انھوں نے سیکولرازم کے منافی قرار دیا۔

سیاست مولانا عبدالماجد دریابادی کا اصل میدان نہیں تھا۔ انھوں نے صحافت مذہبی قسم کی مضمون نگاری سے شروع کی تھی۔ سماجی معاملات کی طرح سیاسی معاملات کو بھی وہ مذہب کی عینک لگاکر دیکھتے تھے۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ تھا کہ وہ ایک مرحلے پر اسلام کی راہ سے ہٹ کر الحاد کی راہ پر لگ گئے تھے اور جب صحیح راستے پر واپس آئے تو ان کی مذہبیت بہت تیز ہو گئی۔ مذہبی علوم کا مطالعہ بھی انھوں نے بہت بڑے پیمانے پر کیا تھا جس کا ثبوت ان کی اردو اور انگریزی تفسیر قرآن ہے۔ ان کی مذہبیت کی جھلک ان کی صحافت میں بھی موجود ہے، اور ان کی تحریروں میں قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام کے برمحل اور وزن دار حوالے بہ کثرت ملتے ہیں۔ لیکن ان کو جمہوریت اور سوشلزم جیسی تحریکوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا اور یہ کمی بھی ان کی صحافت میں جھلکتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ جمہوریت کے مروجہ تصور کے خلاف تھے کیونکہ بہ قول ان کے رسول اللہؐ کے زمانے میں اور خلافت راشدہ کے دور میں نہ جمہوریت تھی، نہ اس کے الکشن، ووٹ اسمبلی، پارلیمنٹ والے اور دوسرے لوازمات۔ (صدق جدید ۲۳ و ۳۰ جولائی ۱۹۶۹ء)

سوشلزم کے متعلق بھی مولانا کا نقطۂ نظر غیر واضح اور سطحی تھا۔ کم سے کم ان کے طنزیہ تبصروں سے یہی تاثر ملتا ہے۔ دہلی کی اس خبر پر کہ بلڈ بینک کی معرفت خون کی خرید فروخت نے ایک منافع بخش کاروبار کی صورت اختیار کرلی ہے، مولانا لکھتے ہیں:

> "مبارک ہو کہ سوشلسٹ ہند نے کیسا ذریعہ غریبوں کی پرورش کا اس خون فروشی سے نکال لیا۔ ایسا نسخہ جو نہ اشوک اعظم کو سوجھ سکا نہ اکبر کو، نہ برطانیہ کے کسی وائسرائے کو۔ ملک کے ترقی یافتہ ہونے میں کیا اب بھی کوئی شبہ باقی رہ سکتا ہے۔" (صدق جدید ۲۳ جولائی ۱۹۷۱ء)

پرانی قدریں، نئی روشنی

نئے سیاسی اور معاشی نظریوں کے علاوہ نئی روشنی کے مظاہر اور جدید تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے بھی مولانا عبدالماجد گھبراتے تھے۔ اور ان کی گہری اسلام پرستی اور وطن دوستی

کی طرح یہ گھبراہٹ بھی ان کی صحافتی تحریروں میں موجود ہے جو ان کی ادبیت کی وجہ سے خامی کے بجائے خوبی بن گئی ہے۔ جب وہ دیکھتے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے ادارے اپنی پرانی لیک سے ہٹ رہے ہیں اور وہاں کے طلبا، اساتذہ اور منتظمین کے حرکات و سکنات میں نئی روشنی کی جھلک اور نئے تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش دکھائی دے رہی ہے تو مولانا تلملا اٹھتے۔ اور پرانی قدروں کے دفاع کے لیے تیکھی طنزیہ تحریروں کے تیر چلانے لگتے۔ علی گڑھ سے کسی نے انھیں خبر دی کہ ایس ایس ہال میں کوہ نور نامی ایک فلم دکھائی گئی جسے لڑکوں اور لڑکیوں کے مخلوط مجمع نے دیکھا اور یہ کہ ناچ رنگ کے جیسے اب کلچرل پروگرام کے تحت عام ہوتے جا رہے ہیں۔ اس پر مولانا نے لکھا:

"جی ہاں کلچرل پروگرام کی وسیع چادر کے اندر تو ہر ناگفتہ بہ گفتنی ہو کر رہ سکتا ہے! مزید حیرت و افسوس اس پر کہ جس ہوسٹل کا ذکر ہے اُس کے پرووسٹ تو ایک مومن دل و دماغ کے استاد خلیق احمد نظامی ہیں! اور پھر طلبا کی عام مذہبی و اخلاقی حالت کی بہتری کا اندازہ تو حال میں منعقد شدہ مذہبی سیمینار سے ہو سکتا ہے۔ نیز اس میں یونین کے صدر کی تقریر سے۔" (صدق جدید ۴؍ اپریل ۱۹۶۹ء)

اسی طرح ماہ نامہ جامعہ سے ملنے والی اس اطلاع پر کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنی طرف سے غالبؔ کی چار تصویریں تیار کرا کے بمبئی، کلکتہ، پٹیالہ اور مدراس کی یونی ورسٹیوں کو بہ طور تحفہ بھیج رہی ہے اور خود جامعہ کے احاطے میں غالب کا مجسمہ زیر تکمیل ہے مولانا اس طرح تبصرہ فرماتے ہیں:

"درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تبصرہ کس دل سے کیا جائے اور اس کے لیے الفاظ کہاں سے لائے جائیں۔ صنعت آزری کا یہ تحفہ وہ جامعہ پیش کرے گی جو اب بھی باضابطہ 'ملیہ' اور 'اسلامیہ' ہے۔ وہ جامعہ جو یادگار شیخ الہند اور محمد علی کے جذبہ دینی کی ہے۔ جس کا مقصد اصلاً دین ہی کی خدمت تھا جس کے بانیوں میں سے ایک کی وفات کو ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں۔ مجید خواجہ مرحوم پر اس وقت برزخ میں جو کچھ گزر رہی ہو گی، کاش اس کو کسی

صورت سے دنیا میں ظاہر کر دینا ممکن ہوتا۔" (صدق جدید ۴؍اپریل ۱۹۶۹ء)

ایسے ہی معاملات اور مسائل کے تذکروں اور ان پر طنز بھرے تبصروں سے مولانا کے پرچے بھرے پڑے ہیں۔ ان کی دردمندی اور ان کے خلوص میں کلام نہیں لیکن وہ ہندوستان اور دنیا کے مسلمانوں اور مسلم اداروں میں جس جگہ پر رو کے رکھنا چاہتے تھے وہاں سے زمانے کے تقاضوں نے ان لوگوں اور اداروں کو آگے کی طرف ڈھکیل دیا۔

عرفِ عام میں جس چیز کو ترقی کہا جاتا ہے مولانا نے اسے "ترقی معکوس" قرار دیا اور لندن کے اخبارات کی ان خبروں کا ذکر کر کے کہ:

"حرمین شریفین کے درمیان اب سات سو موٹریں دوڑنے لگی ہیں، اونٹوں کے بجائے اب حاجیوں کا سفر زیادہ تر موٹروں پر ہونے لگا ہے، سلطان ابن سعود کا قصر معلّی اب بجلی کے قمقموں سے جگمگانے لگا ہے۔ جدہ میں سر گلبرٹ کلیٹن کی خوب خاطر داریاں ہو رہی ہیں۔"

مولانا نے ۱۳؍جولائی ۱۹۲۸ء کے سچ میں لکھا:

"اس قسم کی خبروں سے ان تہذیب نواز و ترقی پرور اخبارات کے صفحات بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ گویا کوشش یہ ہے اور مسرت اس کی ہے کہ مکہ اور مدینہ (زاد اللہ شرفہما) جلد سے جلد اگر لنڈن و پیرس نہیں تو کم از کم کلکتہ و بمبئی، دہلی و شملہ تو بن ہی جائیں! ان 'ترقیوں' پر مسرت اگر فلبی و کلیٹن کو نہیں تو کیا صحابہ کرام و انبیائے مرسلین کی ارواح طیبہ کو ہوگی؟ اور ان 'کارناموں' کا فخر و مسرت کے ساتھ تذکرہ اگر ٹائمس و مارننگ پوسٹ کے صفحات میں نہیں تو کیا بخاری و مسلم کے مجلدات میں ملے گا، جہاں دورِ فتن اور قربِ قیامت کی ایک ایک علامت بیان کر کے ان سے ڈرایا گیا ہے۔"

کچھ اسی قسم کا طنز مولانا نے چند مہینے بعد اس بات پر کیا کہ:

"عالم اسلامی کے انتہائی مغربی گوشہ شمالی افریقہ کا تاریک علاقہ مراقش بھی بالآخر تمدن و تہذیب کے انوار سے دمک اٹھنے والا ہے۔"

فرماتے ہیں کہ شمالی افریقہ کے ملکوں میں ریلوں کی آمد کے بعد

"اب صاحب کا بوٹ ہوگا اور کالے حبشیوں کے سر.... بوتلیں کھلیں گی: بوتلوں کے کاگ کھلیں گے..... ناچ گھر قائم ہوں گے..... ناچنے والوں اور برہنہ ہو ہو کر تھرکنے والیوں کی سرپرستی "آرٹ" کا کمال قرار پائے گی۔ مسجدیں ویران ہوں گی اور جیل خانوں اور پاگل خانوں کی آبادیاں بڑھیں گی۔ زہد و قناعت و ایثار پر مضحکہ ہوگا اور چالاکیوں اور خود غرضیوں کو دانش مندیوں سے تعبیر کیا جائے گا۔"

اسی انداز کی بیس بائیس سطروں کے بعد مولانا نے تبصرہ کیا ہے:

"غرض افریقہ کی تاریکی فرنگیت کی روشنی سے جگمگا اٹھے گی۔ اور جس ملک کو اب تک ایک الہ دین کے چراغ پر ناز تھا وہاں خدا معلوم کتنے برقی لیمپ دم بھر میں روشن ہو جائیں گے۔ اس روشنی سے تو شاید وہ تاریکی ہی ہزار درجہ بہتر تھی اور اس ظلمت پر بجلی اور بھاپ (الکٹرسٹی اور اسٹیم) کا اندھیرا نور ہزاروں بار قربان تھا"

مولانا نے اپنا نوٹ اکبر کے اس شعر پر ختم کیا ہے:

لکھے گا کلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری میں　　　اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

برطانیہ کے ایک اخبار نے امراضِ چشم کے ایک معالج کے حوالے سے لکھا کہ:

"ہر چوتھے مرد اور ہر چھٹی عورت کی آنکھوں پر عینک لگی ہوئی ہے۔ فطرت نے آنکھ کے لیے کام کی جو مقدار رکھی تھی جب اس سے تگنا بلکہ چوگنا کام لیا جائے اور ہر لمحے آنکھ کو تیز سے تیز روشنی کو دیکھتے رہنا اور تیز سے تیز سواریوں کے لیے گردش کرتے رہنا پڑے تو یہی ہونا تھا۔"

مولانا یہ عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں:

"کیا نئی روشنی کا یہی فیض ہے کہ دل کی آنکھوں کی طرح جسم کی آنکھیں بھی بے نور ہو جائیں؟ اور چشمِ بصیرت کے ساتھ چشمِ بصارت بھی کور ہو کر رہ جائے لیکن حیرت ہے کہ عینک کے کثرتِ استعمال کو ضعفِ بصر کی دلیل کیوں سمجھا گیا۔ عینکوں کے یہ کثرت کارخانے قائم ہونے، نئی نئی قسم کی عینکیں ایجاد ہونے اور

عینک سازی و عینک فروشی کی ترقیوں کو تو عین ترقیِ تمدن کی دلیل قرار دیتا تھا، جس طرح اسپتالوں اور عدالتوں کی کثرت کو وسعتِ تمدن و ترقیِ تہذیب کی علامت قرار دیا جا رہا ہے۔" (سچ ۲۸ دسمبر ۱۹۲۶ء)

جادو اور چٹکی

مولانا دریابادی کی صحافت پر مذہبیت کی چھاپ ہونے کے باوجود ادبیت اس کی ایک بہت بڑی اور قابلِ قدر اور قابلِ تقلید خصوصیت ہے۔ زبان پر ان کو قدرت حاصل تھی اور طنز کے تو وہ بادشاہ تھے۔ معمولی معمولی چیزوں کو الفاظ کے جادو سے دیو قامت بنا دیتے اور چھوٹی چھوٹی سرخیوں اور مختصر تبصروں کے چبھتے ہوئے جملوں سے بڑے بڑے بُت گرا دیتے اور سنگین فتنوں کی کاٹ کر دیتے۔ لکھنؤ کے ماہ نامہ نگار کی خلاف مذہب تحریروں کے لیے فتنہ نگار کا لفظ ان ہی کی ایجاد ہے اور جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی کے عنوان یادوں کی برات میں جتنی کشش تھی اس سے کہیں زیادہ کراہیت اس کتاب پر مولانا دریابادی کے تبصرے کے عنوان نے پیدا کر دی۔ عنوان تھا: "ایک زنٹیے کی خود گزشت"۔ تفصیلی تبصرے کے علاوہ ایک ادارتی نوٹ میں اسی کتاب کے متعلق ایک دوسرے اخبار کی ۷ اسطریں نقل کرنے کے بعد مولانا نے جو تین سطریں لکھ دیں وہ پوری کتاب پر بھاری ہیں:

"دیو پری کا افسانہ لکھنے والوں نے بھی ایسی زہریلی کذب بیانی اپنی کتابوں میں اتنی بے تحاشہ کیوں کبھی کی ہوگی جیسی اس عالی مقام شاعر نے اپنی نثر میں کر ڈالی"۔
(صدق جدید ۱۷ اگست ۱۹۷۳ء)

مولانا کے بعض طنزیہ تبصرے محض چڑانے والے ہوتے تھے۔ اُن کو چٹکی لینے کے مترادف بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

"جنگلی جانوروں کے انڈین بورڈ نے ۱۰ر جولائی ۱۹۶۹ء کو وزیر سیاحت ڈاکٹر کرن سنگھ کے زیر صدارت طے کیا کہ ہندستان کا قومی جانور شیر کے بجائے شیر ببر کو بنا چاہیے اور اس کو قومی پرندمور کا ہم پلہ قرار دیا جائے"۔

نا نے اس خبر پر خوب خامہ فرسائی کی ہے :

"حیرت ہے کہ اس فیصلے پر ملک کے سبزی خور خاموشی کے ساتھ رضامند ہو گئے اور یہ صدائے احتجاج کسی سبھا کی طرف سے بلند نہ ہوئی کہ ہمارا دیش تو سبزی خوروں کا دیش ہے۔ اس اہمسا کے دیش میں ایسے جانور کی عظمت و توقیر بلکہ نیم تقدس کے کیا معنی، جو خصوصی شہرت اپنی گوشت خوری کی رکھتا ہے اور جس کی طبعی غذا گوشت ہی ہے! دیش کی سبزی خور اکثریت کی یہ کھلی ہوئی اہانت نہیں تو اور کیا ہے؟"

ایسی ہی چٹکی مولانا عبدالماجد دریابادی نے دہلی کے سیتا کباب بیچنے کی دوکان کے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد والے حالات، کبابوں کی فروخت اور گاہکوں کے بیان میں لی ہے۔

اسی ضمن کی ایک اور تحریر :

"ایک اور دو بھی نہیں پوری سات سات گئو ماتاؤں کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا اور ظاہر ہے کہ اتنا بڑا پاپ کوئی بدبخت اقلیت والا ہی کر سکتا تھا۔ پولیس کی مشینری قوت اور تیزی کے ساتھ حرکت میں آئی اور دو ملزم عالم باغ پولیس نے رنگے ہاتھوں یعنی ایک بھینس کو زہریلی پوری کھلانے کی عین حالت میں گرفتار کر لیے۔ اور ان دو نے باقی اپنے پانچ ساتھیوں کے نام بتا کر کہا کہ ہم لوگوں کا پیشہ ہی مویشیوں کو زہر سے مار کر اُن کی ہڈی اور چمڑے سے نفع کمانا ہے ..... دونوں ملزموں کے نام سننے کے لیے آپ بے تاب ہوں گے۔ ایک کا نام ہے ... لال اور دوسرے کا گوڑ و چمار۔ دونوں ہندو اچھوت۔ دوسروں کو بدنام کرنے والے خود اس دنیا میں کس کس طرح رسوا ہو کر رہتے ہیں۔"

ر اس نوٹ کا عنوان تھا :

"دامن یار خدا ڈھانپ لے پردہ تیرا" (صدق جدید ۱۱ اپریل ۱۹۶۹ء)

ممکن ہے اس طرح کی تحریروں سے مولانا عبدالماجد کا مقصد کسی کو تکلیف پہنچانا اور خود لطف اٹھانا نہیں بلکہ اپنے پڑھنے والوں کی تفریح کا سامان کرنا ہو۔ لیکن جب ایسی باتیں ایک حد سے آگے نکل جاتی ہیں تو تفریح کا سامان بدذوقی کا باعث بن جاتا ہے۔

نشتر اور خنجر

طنز کبھی جادوگر کے کرتب کو باعث کشش اور دل چسپ بنا دیتا ہے۔ کبھی سرجن
نشتر کا کام کرتا ہے جس سے مریض کی شفا مقصود ہوتی ہے اور کبھی خنجر کا کام بھی کرتا ہے جو
کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے طنز کو ہر طرح سے استعما
ہے۔ انداز ماہرانہ اور شاطرانہ ہے مگر بعض موقعوں پر سوقیانہ اور معاندانہ بھی ہوگیا ہے۔ وہ
پرچے صدق جدید میں مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال کے بعد مسلسل خنجر چلاتے ر
اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان لوگوں کی صف میں شامل ہو گئے جو سیاسی اغراض یا حسد
بنا پر ان بزرگوں کی زندگی میں بھی ان کی کردار کشی کر رہے تھے۔

ایک اخبار نے اُن کی اس روش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

"مولانا آزاد نے بھی مدیر صدق کی کچھ ذاتی خدمت کی تھی اور ذاکر صاحب نے بھی کی تھی اگرچہ وہ ذرا مختلف قسم کی تھی۔ ان باتوں کی وجہ سے مدیر صاحب نے ان کی زندگی میں ان پر کچھ زیادہ حملے نہیں کیے۔"

مولانا نے اپنے اوپر کیے جانے والے اس وار کی کاٹ کے لیے صحافتی مہارت سے کام لیا اور
عطائے تو بہ لقائے تو والی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے فرمایا:

"تو گویا ان دونوں مرحومین کی "ذاتی خدمتیں" ایک طرح کی رشوتیں یا خاموش رہنے کی قیمتیں ہوتی تھیں!"

مخالف کی بات کو اس طرح مروڑ کر مولانا نے مزید لکھا:

"کیا خوب قدر ہو رہی ہے ان کے ظرف کی۔ اللہ نہ کرے کسی کو ایسے نادان دوست نصیب ہوں۔" (صدق جدید ۲۵ جولائی ۱۹۶۹ء)

مذکورہ بالا اخبار سے مولانا کی نوک جھونک برابر چلتی رہتی تھی اور ذاتی قسم کے حملے دونو
طرف سے ہوتے رہتے تھے۔ اس اخبار کے تبصرے میں مولانا کو اس طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ
مرحومین نے ان پر بعض احسانات بھی کیے تھے۔ اور مولانا نے اپنے جواب میں نہ صرف اس اخبار

بلکہ مرحومین پر بھی ایک مزید وار کر دیا۔

صدق جدید کے اسی پرچے میں دہلی کے ایک صاحب محمد مظہرالدین صدیقی کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو مولانا کا "ادنیٰ مخلص شیدائی" کہا اور بڑے ادب کے ساتھ اپنے ذاتی مشاہدات اور معلومات کی بنیاد پر مولانا کو ذاکر صاحب کی اسلام پرستی، مسلم دوستی، عبادت، ریاضت، قناعت، ان کی میت کی حالت، نماز جنازہ اور تدفین کی کیفیت اور دعائے مغفرت کرنے والوں کی کثرت کی طرف توجہ دلائی اور عرض کیا کہ ذاکر صاحب کے انتقال کے بعد صدق جدید کے کچھ مراسلات اور شذرات نے مولانا کے متعدد نیازمندوں کو الجھن میں ڈال دیا ہے۔ مولانا دریابادی نے مراسلے کو "شرافت اور متانت تحریر کا ایک نمونہ" تو قرار دیا مگر ذاکر صاحب کے خلاف اپنی کہی ہوئی اور دوسروں کے منھ سے سنی ہوئی باتوں کو ایک مرتبہ پھر دوہرا دیا۔ ان باتوں میں متعدد افواہیں ذاکر صاحب کے مذہبی شعائر سے متعلق تھیں اور مولانا نے ان کو بھی کسی ثبوت کے بغیر نقل کر دیا۔ انھوں نے مراسلے سے متعلق اپنے نوٹ میں یہ اعتراف تو کیا کہ مرحوم میں "یقیناً بعض انسانی خوبیاں آخر تک باقی رہی تھیں"، لیکن مراسلہ نگار کی بیان کی ہوئی 'اسلامی' خوبیوں کا ذکر نہیں کیا اور انسانی خوبیوں کو بھی ضمنی اور فروعی قرار دیا اور اپنے نیازمند مراسلہ نگار کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا کہ "اسلامی آداب کا ابتدائی مسئلہ ہے کہ مرے ہوئے کو برا نہ کہو، بلکہ کلمۂ خیر سے یاد کرو۔"

اس معاملے میں مولانا کا رویہ صحافتی آداب کے بھی منافی تھا۔ اس لیے کہ انھوں نے بے بنیاد افواہوں کا ذکر ایسے انداز میں کیا کہ پڑھنے والے ان کو مسلمہ حقیقتیں سمجھ لیں اور اگرچہ اپنے بیان کی تردید میں عینی شاہدوں کا ایک آدھ مراسلہ بھی چھاپ دیا مگر اپنی ایسی باتوں کو جو آنکھوں دیکھی نہیں تھیں برابر دوہراتے رہے۔ صحافت کا یہ انداز قانون کی گرفت میں تو نہیں آتا مگر صحافتی اخلاقیات کی کسوٹی پر پورا بھی نہیں اترتا۔

مغضوب اور ممدوح

طنز اور طعن و تشنیع کا خنجر مولانا عبدالماجد نے اپنے مغضوب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم پر

حملے کے لیے جیسی صحافتی مہارت سے کام لیا ویسی ہی مہارت سے اس حربے کو انھوں نے ممدوح مولانا محمد علی مرحوم کے دفاع کے لیے اُس وقت استعمال کیا جب مولانا اس دارِ فانی سے رخصت نہیں ہوئے تھے۔

ذاکر صاحب پر مولانا کا ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ انھوں نے ملک کی صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے معًا بعد دو غیر مسلم مذہبی پیشواؤں کے پاس جاکر آشیرواد کی درخواست کی۔ محمد علی سے متعلق معاملہ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۹۲۸ء کا ہے۔ ان دنوں خواجہ حسن نظامی کے نام سے ایک پوسٹر شائع ہوا کہ "مولانا محمد علی نے مالوی جی کو جو سجدہ کیا اس پر شرعی فتویٰ کیا ہے ؟" مولانا عبدالماجد نے اپنے پرچے ہفتہ وار سچ میں جو صدق کا پیش رو تھا لکھا:

"بعض اخبارات میں صرف اس قدر چھپا تھا کہ مالوی جی نے جب مسلمانوں کے ساتھ رواداری اور ہمدردی برتنے پر ایک پُر زور و موثر تقریر کی تو مولانا محمد علی نے ان جیسے مخالف کی زبان سے ہمدردی اسلام میں ایسی زبردست تقریر سُن کر بے اختیار ان کے قدم لے لیے۔ عقلاً اور مصالح سیاسی کے اعتبار سے یہ فعل کہاں تک درست تھا، یہ ایک بالکل جداگانہ سوال ہے۔ یہاں سوال اس کا نہیں، یہاں پوچھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ آیا کسی کے پیروں پر جُھک جانا اور اُسے سجدہ کرنا شرعی حیثیت سے مترادف ہیں ؟ اور مشائخ چشت کے ملفوظات میں روئے بر زمین آوردا اور روئے برزمین نہاد کے الفاظ بہ کثرت آتے ہیں۔ اس کے اور سجدہ کرنے کے ایک ہی معنی ہیں ؟ . . . کیا جناب خواجہ صاحب اب غیر اللہ کے لیے سجدہ تعظیم کے قائل نہیں رہے ؟ اور کیا مخلوق کے لیے جواز سجدہ تعظیم پر ایک خاصی متوسط ضخامت کا جو ماہوار رسالہ اُن کی طرف سے شائع ہوا تھا وہ اب مسترد ہو گیا ؟"

مولانا دریابادی نے خواجہ حسن نظامی سے ایک اور سوال یہ کیا تھا کہ آیا "اتنی بھی احتیاط ضروری نہیں کہ پہلے نفس واقعہ کی تصدیق کر لی جائے ؟" یہ سوالات اور ایسے ہی دوسرے سوالات ذاکر صاحب کے متعلق مولانا کے صحافتی ارشادات کے سلسلے میں بھی پیدا ہوتے ہیں

رتب اور اب کا موازنہ صحافت میں معیوب نہیں مستحسن ہے۔ خود مولانا دریابادی اس
ملے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان کی یادداشت غضب کی تھی۔

مولانا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ دنیا کے ملک، ان ملکوں کے باشندے اور ان
شندوں میں شامل مسلمان اور مسلم ادارے ان اصولوں اور طریقوں پر نہیں چل رہے تھے جو
لانا کے نزدیک پسندیدہ تھے۔ اس لیے ان کی مایوسی بڑھتی جارہی تھی اور ان کا غصہ تیز
ے تیز تر ہوتا جارہا تھا۔ عمر اور جسمانی ضعف کے ساتھ غصے کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس
ے صدق جدید کے آخری چند برسوں کا طنز، پچ کے اولین دور کے طنز سے کہیں زیادہ تلخ اور تیکھا
ے۔ البتہ ادبیت کی چاشنی جو مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر کی ایک نمایاں خصوصیت
ی ان کی بات کے کڑوے پن کو بعض اوقات دبا دیتی تھی لیکن کبھی کبھی دل کی بات قلم سے نکل
اتی تھی اور دوسروں کی دل آزاری کا باعث بن جاتی تھی۔

رضوان احمد

مولانا عبدالماجد دریابادی کی صحافت

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم ومغفور

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

ایک جید عالم، مفسر قرآن، دیدہ ور مورخ، صاحب طرز ادیب، بے لاگ ناقد، بے مثل نثار مفکر، مصلح قوم اور سب سے بڑھ کر بے باک، بے لاگ اور بے بدل صحافی۔ 'سچ' سے 'صدق' اور صدق سے صدق جدید تک صحافت کے خارزار پر ان کا سفر ۵۴ برسوں پر محیط ہے۔ اور میں ایک طفل مکتب ہوں، اُن پر قلم اٹھانا گویا چھوٹا منھ بڑی بات ہے۔ مگر یہ جرأت میں اس لیے کر ہوں کہ مجھے ان کی ہم وطنی کا شرف حاصل ہے۔ میں بھی فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا تعلق بھی اس زرخیز زمین سے ہے جہاں ایسے ایسے لعل وگہر پیدا ہوئے تھے۔ اور مجھے اس پر بھی فخر ہے کہ میں نے کئی بار مولانا کی زیارت کی تھی ان کو دیکھا تھا البتہ سمجھ سکنے کا دعویٰ تو میں نہیں کرسکتا۔ غالباً انھیں کے لیے شاعر نے کہا تھا، جسے ادنیٰ تصرف کے ساتھ پیش کرتا ہوں:

مت سہل انھیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

یا پھر موزوں ترین الفاظ میں ان کو جو خراج عقیدت ایک اور جید صحافی جمیل مہدی مرحوم نے پیش کیا تھا:

"مولانا عبدالماجد دریابادی اگر ہندوستان کے بجائے کہیں اور پیدا ہوتے توان کا نام ابن جوزی ہوتا۔ انگلینڈ میں پیدا ہوتے تو کانن وائل اور ہندوؤں میں پیدا ہوتے وویکانند ہو جاتے۔ ابتدا سے لے کر ان کی زندگی خط مستقیم کے ذریعہ ناپی نہیں جاسکتی اس میں کتنے ہی موڑ ہیں کتنے ہی پیچ وخم ہیں۔ آرتھر کانن

ڈائل شرلوک ہومز تحقیق کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا مولانا عبدالماجد نے اخلاق کا ایک ایسا مجسمہ تراش کر زندگی کے ایک ایک کنارے اور گوشے پر استادہ کردیا ہے۔"

(فروغ اردو ماجد نمبر)

اودھ کے تہذیبی قصبہ دریاباد کی اس مشت خاک نے کم و بیش چھ دہائیوں تک اردو اور صحافت کی بے لوث خدمت کی۔ انگریزی میں جو کچھ لکھا وہ اس کے علاوہ ہے۔ 'سچ'، 'صدق'، یا 'صدق جدید' اخبار نہیں تھے مشن تھے۔ اسم بامسمّٰی تھے۔ مولانا نے مشن ۵۲ برسوں تک جاری رکھا۔ کسی ایسے اردو اخبار کو ۵۲ برسوں تک جاری رکھنا معجزے سے کم نہیں جس کی پشت پر نہ کوئی سرمایہ دار ہو نہ صنعت کار نہ سیٹھ نہ ساہوکار لے دے کر صرف خریدار جن کی تعداد بھی محدود۔ کیوں کہ سچ سننے اور پسند کرنے والے ہی کتنے ہیں۔ صحافت میں سچ کو سچ کہنا ہی سب سے مشکل کام ہے۔ دن کو دن رات کو رات ہی کہنا کٹھن ہے۔ سفید کو سفید اور سیاہ کو سیاہ ہی کہنا محال ہے۔ اور جس نے یہ کام نصف صدی تک کیا ہو اس نے اپنے آپ کو کس قدر لہولہان کیا ہوگا کس قدر زخم کھانے پڑے ہوں گے اس کا احساس وہی کر سکتا ہے جو ان پرخار راہوں پر چلا ہو۔ وہ صحافت کی بساط کے کھلاڑی نہیں تھے وہ بساط اُلٹ دینے والے کھلاڑی تھے۔

ان کی صحافت کا ایک قاعدہ تھا ایک ضابطہ تھا جسے انھوں نے روز اول سے مرتب کیا تھا مگر اس کی اشاعت تین دہائیاں گزرنے کے بعد کی تو اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں رہا ہوگا کہ جو خلوص سے اس پرخار راستے میں قدم رکھے وہ اس کی پیروی بھی کرے۔ وہ اپنے جانشینوں کے سامنے ایک 'ضابطۂ اخلاق' رکھنا چاہتے تھے۔ اس ضابطے کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ آج جب صحافت شتر بے مہار ہوگئی ہے یہ ضابطہ زیادہ بامعنی ہے۔ اس پر کوئی عمل کرے یا نہیں اس کی اہمیت و معنویت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے:

"ہفتہ وار صحافت کے آداب"

۱۔ مقصود خدمت دین و ملت رکھیے۔ عام خدمت خلق بھی اس کے تحت آتی ہے۔

۲۔ وطن کا بھی بڑا حق ہے، جس طرح پڑوسی کے، استاد کے اور اہلِ خاندان کے ہوتے ہیں۔ البتہ مسلمان پرستار، وطن کا نہیں ہو سکتا۔ عبودیت کا یہ خصوصی تعلق تو صرف ذاتِ حق کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے مخلوق میں سے کسی کے حصہ میں نہیں آسکتا۔

۳۔ خبر برائے خبر کا روزناموں میں جو بھی درجہ ہو ہفت روزہ میں تو یہ تقریباً مہمل چیز ہوگی۔ ہفت روزہ میں اپنے تبصرے سے یا کم از کم سرخی سے ہر خبر کو با مقصد بنا کر پیش کیجیے۔

۴۔ پبلک کے جذبات کی محض نمائندگی پر ہرگز اکتفا نہ کیجیے۔ پبلک کے مذاق اور جذبات کی اصلاح کی کوشش جاری رکھیے۔

۵۔ اپنی مقبولیت اور مرجعیت کا خیال کسے نہیں ہوتا؟ ایک حد تک یہ خیال قدرتی ہے لیکن اس جذبے کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھیے اور اپنے اوپر غالب ہرگز نہ آنے دیجیے

۶۔ صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں ایک قسم کی عبادت ہے بس اسی کو نصب العین بنا کر ہمیشہ اپنے سامنے رکھیے۔

۷۔ دوسروں کا احتساب ہر پبلک معاملے میں ضرور کیجیے لیکن اپنے آپ کو احتساب سے بالا خیال نہ کیجیے۔ احتسابِ نفس پر سب کو مقدم رکھیے۔

۸۔ بلا وجہ معقول کسی کی دل آزاری کیا دل شکنی کو بھی گوارا نہ کیجیے اور مروت کے بھی حدود قائم کر لیجیے۔ ان سے آگے قدم نہ رکھیے۔

۹۔ ملک کی اکثریت کا اور حکومتِ وقت کے قانون کا لحاظ ضرور رکھیے حتی الامکان راہ سلامت روی کی اختیار کیجیے لیکن مرعوبیت اور احساس کمتری تک ہرگز نہ پہنچ جائیے۔ صلح جوئی دوسری چیز ہے اور بزدلی اور خوشامد بالکل دوسری۔

۱۰۔ بلا وجہ کسی سے نہ الجھیے نہ خواہ مخواہ تکرار پیدا کیجیے۔ لیکن دوسری طرف دیکھیے اور گریے بھی نہیں۔

۱۱۔ پبلک تنقید آزادی سے کیجیے لیکن ذاتیات پر اتر آنے سے اپنے آپ کو اہتمام

سے بچائیے۔ کسی کے نسب پر وطن پر یا شکل و صورت پر طنز کرنا، سب ذاتیات کی ہی شکلیں ہیں۔

۱۲۔ مزاح، شگفتگی، خوش طبعی علامت شرافت نفسی کی اور تفریح، تفضیح، تضحیک اور پھکڑ بازی علامتیں دنارت اور سفلہ پن کی اس فرق عظیم کو ہمیشہ نظر میں رکھیے۔

۱۳۔ آپ بھی بہر حال انسان ہیں اور سارے بشری جذبات رکھنے والے۔ غصہ سے آپ بھی بھڑک اٹھتے ہیں ایسے موقعے پر نفس کو قابو میں رکھنا ہی آپ کی بلند کرداری کی دلیل ہوگی۔

۱۴۔ دیانت کے امتحان بھی اس راہ میں سخت سخت آتے رہتے ہیں اپنے کو بچانے کا اہتمام سامنے رکھیے۔

۱۵۔ غلطی کا امکان ہر بشر کی طرح آپ کے لیے بھی ہے۔ غلطی کا علم ہو جانے پر اس کے اعتراف سے، اسے واپس لینے سے، اس پر معذرت کرنے سے شرمائیے اور جھجکیے نہیں۔

۱۶۔ جس طرح زبان سے نکلی ہوئی ایک ایک بات قابلِ گرفت ہوتی ہے اسی طرح قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بھی جرح کی زد میں آسکتا ہے۔ خیال کریے اور ڈرتے رہیے، اس وقت جب سارا دفتر آپ کے سامنے ہوگا اور آخری اور حقیقی عدالت میں اس کے ایک ایک لفظ پر سوال ہو رہا ہوگا۔"

(صدق جدید شمارہ ۱۸، جلد ۱۸)

اس کے علاوہ ایک اور موقع پر اپنے موقف کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"صدق کا مسلک اور مزاج اچھا ہے یا برا جیسا کچھ بھی ہے واضح و ظاہر ہے اور حیرت ہے کہ کوئی شخص اس کے چند پرچے بھی پڑھے اور غلط فہمی میں مبتلا رہ جائے۔ وہ سیاسی پرچہ تو کسی معنی میں ہے ہی نہیں۔ اصلاً ایک دینی، اصلاحی، اخلاقی صحیفہ ہے۔ اس کی اصل دعوت ایک دینی اور اصلاحی دعوت ہے پر اس کا ایک مخصوص علمی و ادبی معیار ہے اور اس کا خاص حصہ کتابوں کے نقد و نظر کے لیے

وقف ہوتا ہے۔ اس سب کے بعد اگر کچھ جگہ بچتی ہے تو وہ سیاسی رائے کا اظہار بھی کر دیتا ہے وہ بھی صرف اپنے ملک سے متعلق جس سے وہ سیاسی اور آئینی اور جغرافیائی طور پر وابستہ ہے۔"

یہ ایک طرح سے صدق کا منشور ہے جس پر مولانا روزِ اوّل تا آخر سختی سے کاربند رہے، مگر تین دہائیاں گذر جانے کے بعد اس کی اشاعت کا مقصد یقیناً یہی تھا کہ آنے والی نسلیں بھی اسے مشعل راہ بنائیں حالانکہ انھیں احساس تھا کہ اردو صحافت کا مستقبل تابناک نہیں ہے۔ صحافت سے مراد یقیناً اخبار کی ترقی نہیں ہے کیوں کہ اردو اخبارات کی تعداد میں بھی روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی تعداد اشاعت میں بھی ان کو سرکاری اور غیر سرکاری اشتہارات بھی مل رہے ہیں۔ حکومت بھی ہمت افزائی اور سرپرستی کر رہی ہے مگر اس سے جہاں اخبارات کی ترقی ہو رہی ہے وہیں صحافت کا زوال ہو رہا ہے۔ مولانا کو اس بات کا خدشہ تھا کہ اردو صحافت پر بیغمبری وقت آسکتا ہے۔ قلم کے خریدار بھی صف بہ صف کھڑے ہو سکتے ہیں اس کا اظہار انھوں نے واضح طور پر کر دیا ہے۔

ان کا اخبار 'سچ'، 'صدق' اور 'صدق جدید' ہمیشہ ہی ایک چھوٹا سا اخبار تھا جس میں صوری لحاظ سے قطعی کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ ان کے پاس اتنے وسائل ہی نہیں تھے کہ وہ اسے صوری طور پر بھی سنوار سکیں۔ وہ تو بس اپنی تحریروں کی چنگاریاں اور بجلیاں ہی بھر کر اپنے قارئین کے سامنے پیش کر سکتے تھے۔ کڑوی کسیلی سچی باتیں جو بہتوں کو ناگوار گزرتی تھیں، کتنوں کے لیے ہی مشعلِ راہ تھیں۔

مولانا کی سب سے بڑی خوبی تو یہی تھی کہ جو ضابطہ اخلاق انھوں نے بنایا اس سے کبھی سر مو انحراف نہیں کیا۔ طنز کے تیروں کے شکار اکثر ان کے اپنے ہی ہوتے تھے۔ مگر اس معاملے میں وہ کسی رو رعایت کے قائل نہیں تھے۔

مولانا دریابادی جس زمانے میں صحافت کے میدان میں آئے تو ان کے معاصرین ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی، مہاشے کرشن، منشی دیا نرائن نگم، لالہ خوشحال چند خورسند، عبدالمجید سالک جیسے

صاحب طرز اور نامور صحافی میدان میں تھے۔ ایک طرف مولانا آزاد کی مسجع و مقفیٰ، باوقار اور پرشکوہ نثر تھی تو دوسری جانب کوثر و تسنیم میں ڈھلی مولانا حسرت موہانی کی زبان، مولانا ظفر علی خاں کی پرشور چیختی اور دہاڑتی ہوئی صحافتی زبان۔ مگر مولانا نے ان سب سے اپنی طرز الگ نکالی۔ سادہ، پرکار، سلیس اور عام فہم۔ ان کے پاس قارئین کے لیے پیام تھا اور اس کے لیے یہی اسلوب موزوں ترین ہو سکتا تھا۔ وہ عام انسان تک پہنچنا چاہتے تھے ان کے ذہن کو جھنجھوڑنا چاہتے تھے مگر وہ ابتلا کا دور تھا۔ اس وقت صحافت ایک خارزار تھی جس کے تصور سے ہی لوگ لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ بقول جمیل مہدی:

"انھوں نے قلم جس وقت ہاتھ میں لیا تھا قلم کی عظمت اور عصمت کی بڑی نگہداشت کی جاتی تھی۔ قلم اگر تلوار سے تیز نہ ہو نیزہ سے زیادہ آب دار اور تیر سے زیادہ خونچکاں نہ ہو تو اس کو ہاتھ میں لینے کی ہمت کسی کو نہیں ہوتی تھی۔ خوف سے لرز جانے اور دولت سے بک جانے والے قلم کے مقابلے میں لوگوں کو بالاخانوں پر رکھے ہوئے حقوں کا نیچہ تھام لینا زیادہ عزت کا کام معلوم ہوتا تھا۔ صرف وہ لوگ اس قلم کے میدان میں اترتے تھے جو خدمت اور بندگی کے اظہار کے لیے عبادت کو ناکافی سمجھتے تھے۔ قلم کی عظمت اور ناقابل تسخیر قوت کا اعتراف ہر زمانے میں کیا جاتا تھا لیکن اس کا اظہار اس وقت ہوا جب مولانا محمد علی مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہاتھوں نے اس کے ذریعہ اس گرجتے ہوئے طوفان سے ہندوستان کو بھر دیا جس کی بازگشت آج بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طور پر سنائی دے جاتی ہے۔" (فروغ اردو ماجد نمبر)

مولانا دریابادی نے اپنی صحافت کے لیے نہ گرجتا اور چنگھاڑتا ہوا اسلوب چنا نہ پُرشور الفاظ کی باڑھ لگائی نہ شعر و شاعری سے نثر کو بوجھل کیا نہ شوکت الفاظ کا سہارا لیا۔ موضوعات ان کے بھی تقریباً وہی ہیں، عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں لہجہ ان کا بھی احتجاجی ہے مگر انھوں نے نہایت ہی سادہ اور سلیس زبان میں اپنی باتیں کہی ہیں طنز ایسا ہے کہ شکار تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہے، نشتریت ایسی کہ اس کی چبھن عرصے تک محسوس ہوتی رہتی ہے۔ یہی

مختصر مختصر جملوں کی سادگی ان کا سب سے نمایاں وصف ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جملے سادہ و
اشعار کی طرح دل سے نکل کر سیدھے دل میں جا کر رکتے ہیں، خلش پیدا کرتے ہیں، سوچنے پ
کر دیتے ہیں۔ ان کے صحافتی اسلوب پر احمد جمال پاشا کہتے ہیں:

"اس نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نثر نگار کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلتی ہے۔ یہ جدھر اور جیسے چاہیں موڑ دیتے ہیں۔ اس نثر میں شگفتگی اور شادابی ہے۔ بشاشت اور خوش فکری ہے۔ سادگی اور روانی ہے۔ یہ اکثر دل میں جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے دھماکے دل و دماغ میں محسوس ہوتے ہیں۔ اس میں کسک، اثر اور دھمک ہے۔ یہ بالکل ان کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو جہاں چاہیں خوش یا اداس کر دیں، سوچنے اور سر دھننے پر مجبور کر دیں۔"

اور پھر آگے چل کر وہ کہتے ہیں:

"اگر تحریر صحافتی ہو تو پھر اس میں لہجہ احتجاجی بلند اور شوخ ہوتا ہے۔ لہجے میں طنز اور طراری ہوتی ہے یا محاسبے والا انداز ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کا لہجہ بلند بانگ پر شکوہ یا پھر یاسیت اور کرب میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اس لہجے میں درد و الم اور فکرِ جنوں کی آمیزش ہوتی ہے۔" (فروغ اردو ماجد نمبر)

ان کا یہ اسلوب انوکھا ہے جس کے وہ موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ انھوں نے جو اسٹائ
ایجاد کیا وہ انھیں پر ختم ہو گیا کیوں کہ اس کی پیروی کرنا آسان نہیں تھا۔ یہ اسلوب ان کی شنا
بھی ہے۔ تحریر پر نام درج ہو یا نہیں چند جملے پڑھنے کے بعد ہی آپ سمجھ جائیں گے کہ ی
کس کی تحریر ہے۔ ان کی 'سچی باتیں' اور 'شذرات' تو کثرت سے ہند و پاک کے اخبارات او
رسائل میں نقل کیے جاتے تھے۔ اس لیے محدود اشاعت کا اخبار ہونے کے باوجود صدق
کا پیام بہت دور تک پہنچتا تھا۔

ان کے اسلوب میں ٹھہراؤ ہے، یکسانیت ہے۔ مسئلہ جذباتی ہو ہیجانی یا ہنگامی مو
کی تہ تک ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں۔ کبھی نہ خود جذبات کی رو میں بہتے ہیں نہ اپنے
قارئین کو بہانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہ خود گمراہ ہوتے ہیں نہ دوسروں کو کرتے ہیں۔

کی رائے راسخ ہوتی ہے، پختہ ہوتی ہے، کھری ہوتی ہے اور وقت کی کسوٹی پر کھری اترتی ہے
مسائل کو فکر کی بھٹی میں تپا کر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور نتائج نکالتے ہیں۔ ان کی تحریر
ر و فکر میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے جس میں سطحیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ ماضی پرست
رور ہیں مگر ان کا مقصد عظمتِ رفتہ کی تلاش ہے، کھوئی ہوئی اعلیٰ قدروں کی جستجو ہے۔ وہ
رف حقیقت کی تلاش ہی نہیں کرتے حقیقتوں کی حقیقت کی بھی تلاش کرتے ہیں۔ اسی لیے
اجد احمد فاروقی کہتے ہیں:

"ان کے وجود سے ہندوستانی مسلمانوں کا وجود تھا اور ان کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی۔" (یادگاری مجلہ)

مولانا دریابادی کے رویہ کا پتہ ان کے عنوانات سے ہی لگ جاتا ہے۔ ان کے عنوانات
چونکانے والے ہوتے ہیں۔ "سچی باتیں" "فتح سنگھ کی فتح" "کاغذی سیکولرزم" "حدیث کی
ندامت" "بلندیوں کی پستیاں" "عزت مآب سے تمسخر" "چھاگلا ازم" "ایسے ویسے کیسے کیسے
ہو گئے" "مہا خوشامد" "تیز مرچ کی چائے" "بھیڑیے پاسبان کے روپ میں"۔

ان کی ہر تحریر ایک پیام پر ختم ہوتی ہے۔ ہر تحریر کا اختتام ایک درس پر ہوتا ہے ایک
سبق ملتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو کچھ دینا چاہتے ہیں۔ ان کے یہاں طنز ہے مگر تیکھا، مزاح ہے مگر
ہلکا جس میں پھکڑپن کا شائبہ تک نہیں کاٹ ہے بالکل سیدھی، چنگاریاں ہیں جو شعلہ نہیں بنتیں،
بجلیاں ہیں جو کوند کر رہ جاتی ہیں۔

ایک ان کے مخصوص رنگ کی مختصر تحریر ملاحظہ فرمایئے:

"نئی دہلی۔ ۱۸ مارچ۔ صدر جمہوریہ نے آج اپنا خطبۂ افتتاحی پارلیامنٹ کے سامنے شستہ انگریزی میں سنایا اس کا ہندی ترجمہ نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے کیا ڈاکٹر صاحب کا تعارف ناتمام رہا اس لیے ان کے ہندی ترجمہ میں کچھ لطف نہیں آیا۔ پورا تعارف یوں کرانا تھا۔ سابق صدر انجمن ترقی اردو اور اب ان کی زبان سے ہندی ترجمہ لطف دے گیا۔"

ایک ذرا سی رائے زنی سے کیسی زبردست چٹکی لی ہے انھوں نے۔ اس میں مولانا کا قلم کارٹونسٹ

کی پنسل سے زیادہ نوک دار اور آرٹسٹ کے رنگ سے زیادہ شوخ و شنگ ہے۔ مگر اپنی انف
روایات کی گمشدگی اور اس کے اتلاف پر ان کو جو قلق ہے اس کا کرب ان تحریروں میں محسوس
کیا جا سکتا ہے:

"بھانڈ اور بیسوا تو آج بھی وہی ہیں لیکن اس بے پناہ اور بے وفا حربہ کا توڑ
کس کے پاس ہے کہ اب طائفہ کا نام کلچرل وفد ہے۔ ناچ مجرے کے بجائے اصطلاح
ثقافتی شو کی چل پڑی ہے۔" (صدق جدید ۱۴-۲۰)

"ہرجائی پن کا نام کسی زمانے میں منافقت رہا ہوگا اور کسی زمانے میں اس کا
شمار عیوب میں ہوتا ہوگا۔ اب وہ عین ہنرمندی ہے اور بہترین سیاست کاری
یا ڈپلومیسی۔" (صدق جدید ۱۲-۲۰)

"ہندوستان کے اونچ نیچ چھوت چھات کے گورکھ دھندے کو تو گاندھی جی
اپنے خون کے قطروں سے بھی حل نہ کر سکے۔" (صدق جدید ۱۶-۲۸)

وہ گم شدہ قدروں کے مرثیہ خوان بھی ہیں مگر حکیمانہ باتیں کہنے کا اسلوب اور ہے، سنجیدہ
باتوں کے کہنے کا انداز دوسرا ہے۔ اس میں درد ہے کرب ہے، آہ ہے اور کسک ہے:

"دین کو اگر دنیا سے بالکل الگ فرض کر لیا جائے تو اس کے کوئی معنی باقی
نہیں رہ جاتے۔ لوگوں سے اچھا برتاؤ رکھو۔ ماں باپ کی خدمت کرتے رہو اللہ
کو ایک ہی خالق و مربی سمجھو، یہ سب طریقے دنیا ہی کو برتنے کے تو ہوئے۔ دین
نام ہی دنیا کے صحیح استعمال کا ہے۔" (صدق جدید جلد ۱۷۔ شمارہ ۱۳)

"انقلاب جب آتا ہے تو محض سیاسی حدود تک محدود نہیں رہتا اور طرز حکمرانی
کے تغیر پر قناعت نہیں کرتا۔ اس کے لیے ناگزیر سا ہے کہ وہ زندگی کے سوشل
(معاشری) پہلوؤں کو بھی اپنے لپیٹ میں لے اور اس کے بعد یہ کہ قوم کے اخلاقی دینی
روحانی نظام پر بھی ہاتھ ڈالے اور بہت سی قدروں کو پامال کر کے رکھ دے۔"

(صدق جدید جلد ۱۳۔ شمارہ ۲)

اپنی ۸۰ ویں سال گرہ پر "سچی باتیں" کے تحت ۱۰ مارچ ۱۹۷۶ء کے صدق جدید میں

لکھتے ہیں :

"ڈاکٹروں کی تحقیق ہے کہ ۸۰ سال کے سن میں دماغ کا ۱/۱۰ حصہ تحلیل ہو جاتا ہے۔ خیر وہ دماغ جب سالم تھا تب ہی کیا تھا اور جب وہ اتنا ناقص ہو چکا ہے تو اس کا پوچھنا ہی کیا۔ سالم و ناقص ہر صورت میں اس کی رہنمائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔"

اور آگے فرماتے ہیں :

"اس دن خوشی مناتے ہیں۔ عظمت کے جام پر جام لنڈھاتے ہیں گویا جو سال اس پر گذر چکا ہے اس پر نہ تو کوئی باز پرس ہوگی اور نہ کوئی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ مومن کا شیوہ تو اس کے برعکس ہے۔ وہی دن ہے سہم جانے کا اور سزا پانے کا۔ سال میں جتنے دن گزارے ان میں سے ایک ایک گھنٹہ کیا معنی ہر ہر منٹ بلکہ ایک ایک سکنڈ کا جواب دینا ہوگا۔ عمر کی زیادتی یوم الحساب کی درازی کو بڑھانے والی ہے۔ مبارک ہے وہ بندہ جسے یوم حساب سے قبل ناسوت کی زندگی ہی میں احتساب نفس کی توفیق ہو جائے ہر روز نہ سہی کم سے کم سال میں ایک بار تو ہو۔"

(صدق جدید ۱۰ / مارچ ۱۹۷۶ء)

مٹتی ہوئی قدروں کا المیہ ان کے یہاں بڑا کربناک ہے :

"ہمارے قصبوں میں سادگی اور قناعت، رواداری اور یگانگت کی حکومت تھی اور بازار میں سکے حیا و غیرت کے چلتے تھے۔ ذوق میں لطافت و نفاست کی دولت بھی بھرپور تھی۔ بڑی بات یہ ہے کہ اپنے مذہب پر پوری طرح قائم رہ کر بھی طبیعت تعصب سے آشنا رہتی۔ ہندو مسلمان آپس میں رشتے قائم کرکے ایک کو چچا اور دادا دوسرے کو بھتیجا اور بابا کے نام سے پکارتے اور دوسروں کی بہو بیٹیوں کو اپنی بہو بیٹیاں سمجھتے۔ صحیح سیکولرازم وہی تھی جو ان قصبوں میں راج کر رہی تھی۔ رودولی اور خیرآباد دونوں اس کے مثالی نمونے تھے اسی قصباتی تہذیب وتمدن کے۔

اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر۔"

(اگست ۱۹۷۰ء کا ایک نشریہ)

میں نے شروع میں ہی اعتراف کر لیا تھا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی ایک بحرِ ذخار ہیں اور میں ایک قطرہ بے مقدار وہ ایک ادارہ ہیں اور میں ایک طفلِ مکتب۔ ایک مختصر مضمون میں ان کی صحافتی تحریروں کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے البتہ میں پھر آخر میں مرحوم جمیل مہدی کے الفاظ کا سہارا لے رہا ہوں:

"انھوں نے جو کچھ لکھا اور جتنا لکھا اسے دیکھنے اور پرکھنے کے لیے ایک مخصوص پیمانہ بھی انھوں نے ایجاد کر لیا تھا ان کی تحریر پر دینی نقطۂ نظر اور سب محرکات کے مقابلے میں حاوی تھا۔ اور وہ معاملات اور مسائل کو جس عینک سے دیکھتے تھے اس کا رنگ مذہبی شیفتگی اور وابستگی کی شراب سے لالہ گوں تھا۔ ہندوستان میں اسلام کا تحفظ اور دفاع ان کے قلم، ان کے دماغ، ان کے دل اور ان کی مصروفیتوں کے لیے سب سے بڑے نصب العین کا درجہ رکھتا تھا۔ ان کی جرأت آموز تحریروں نے نہ معلوم کتنے لوگوں کے ذہن ودماغ کو صاف کیا اور وقت وزمانہ کے رجحان و رفتار سے پیدا ہونے والے احساس کمتری سے نجات دلائی۔ ان کی یہی خدمت بلاشبہ اتنی اہم اور عظیم خدمت ہے جس سے سبکدوشی ممکن نہیں۔" (یادگاری مجلہ ۱۹۷۸ء)

مولانا دریابادی ۱۵ر مارچ ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔ آئندہ سال گزار کر ان کا صدی سال پیدائش شروع ہوگا۔ یوپی اردو اکادمی مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے مولانا دریابادی کی حیات اور خدمات پر اولین سمینار کا انعقاد کیا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ صدی سال پیدائش کے دوران دوسری ریاستی اکادمیاں علمی وادبی اور صحافتی ادارے سمینار اور جلسوں کا انعقاد کر کے مولانا کی خدمات کو اجاگر کریں۔ ان کا صدی سال پیدائش شایانِ شان طور پر منایا جائے اور مستقل یادگار بھی قائم کی جائے۔

کٹر سلیم قدوائی

مولانا عبدالماجد دریابادی اور تحریک خلافت

مفسر قرآن، صاحب طرز ادیب، بلند پایہ صحافی اور عہد ساز مدیر مولانا عبدالماجد یابادی اگرچہ سیاست کے مردِ میدان نہیں تھے لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سیاست سے لاتعلق رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی بھرپور زندگی کا ایک دور جو کہ مختصر تھا ایسا بھی ا ہے جب انھوں نے عملی سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔ اسی کا ذکر انھوں نے عملی سیاست ی" کے ۲۳ ویں باب میں سیاسی زندگی کے عنوان سے کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے وہ محمد علی ذاتی ڈائری کی دو جلدوں میں بھی مصنف کی سیاسی سرگرمیوں کی جھلکیاں جا بجا آتی ہیں۔ اس مختصر مقالہ میں اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کون سے رکات اور عوامل تھے جنھوں نے مولانا کو سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کیا اور وہ کون سی صیات تھیں جنھوں نے ان کو متاثر کیا یعنی وہ کون سی تحریکات تھیں جن میں انھوں نے لچسپی لی؟ اس مقالہ میں ان تمام سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا دریابادی ایک غیر معمولی حساس انسان تھے۔ انھوں نے جس دور میں ہوش نبھالا وہ ایک نہایت ہنگامی اور پرآشوب دور تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انسان استبداد استعماریت، جاگیرداری اور غلامی کی تاریکی سے نکل کر آزادی، انصاف، مساوات اور خودگری روش میں داخل ہونے والا تھا۔ پرانے معتقدات اور اقدار زندگی کی جگہ جدید خیالات و فکار وجود میں آرہے تھے۔ نئی نئی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں جنم لے رہی رہی تھیں۔ ان

میں انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ اور تحریک خلافت خاص طور سے قابل ذکر ہیں
کے افق پر نئے نئے لیڈر ابھر کر سامنے آرہے تھے۔ ان میں مہاتما گاندھی، علی برادران، حک
خاں، سی آر داس، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد وغیرہ قابل ذ
ایسے حالات اور ماحول میں مولانا دریابادی جیسے دانشور جن کی قدیم وجدید دونوں ع
گہری نظر تھی اپنے دور کے مختلف سماجی اور سیاسی مسائل اور تحریکات سے کس طرح خ
مکمل طور پر علیحدہ رکھ سکتے تھے۔ چونکہ فطری طور پر ان کا مزاج سیاسی نہیں تھا اس
انھوں نے سیاست کے بارہ میں نہایت محتاط رویہ اختیار کیا اور جہاں تک ممکن ہوسک
اس سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وقت اور حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ
رفتہ سیاست کی طرف مائل ہونے لگے۔ یہ تبدیلی کب اور کیسے رونما ہوئی؟ اس کا جوا
مولانا نے اپنی سوانح میں یوں دیا ہے :

”جب اپنے ہوش کی آنکھیں کھلیں تو مسلمانوں کی مسلم پالیسی سرکار انگریزی کی تائید اور وفاداری کی پائی۔ میٹرک پاس کرنے (جون ۱۹۰۸ء) تک اپنا بھی یہی رنگ ماحول کی تقلید میں رہا۔ کالج میں آنے اور لکھنؤ میں قیام کے بعد جب ”آزادی“ کی ہوا لگی تو اپنے خیالات بھی بدلنے اور کانگریس کی طرف مائل ہونے لگے۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں خوب دھوم دھام سے ہوا۔ اس میں شریک ہوا مگر محض تماشائی کی حیثیت سے۔ صرف جلسہ کی سیر اور بہار دیکھنے۔“

ایک حساس انسان ہونے کی حیثیت سے مولانا اپنے گرد و پیش کی دنیا سے نہ تو ب
سکتے تھے اور نہ ہی مختلف واقعات اور حادثات کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں جب
حکومت نے مسز اینی بسنٹ کو گرفتار کیا تو اس پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے مولان
اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے :

”۱۹۱۷ء میں جب حکومت نے مسز بسنیٹ جیسی آفاقی شخصیت رکھنے والی کو تحریک ہوم رول کے سلسلہ میں گرفتار و نظر بند کر دیا تو اس دھماکہ سے سارا ملک دہل گیا اور مجھ پر بھی ایک جوش کا عالم طاری ہو گیا۔“

اسی طرح سے جب تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں مولانا کے محبوب لیڈر مولانا محمد علی کو گرفتار کیا گیا تو مولانا کے جیل جانے کی خبر سنتے ہی انھوں نے پلنگ پر لیٹنا چھوڑ دیا کہ مولانا کو جیل میں [illegible] ملتا ہوگا۔

تحریک خلافت اور ترک موالات کا جب زور بندھا اور ہر روز ہر جگہ جلسے ہونے لگے اور جلوس نکلنے لگے تو مولانا بھی ان جلسوں۔ جلوسوں میں شریک ہونے لگے لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ ان کی حقیقت محض دور کے تماشائی کی سی تھی جیسا کہ ذاتی ڈائری جلد اول کے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:

"عملی سیاست سے میں علی العموم کنارہ کش ہی رہا ہوں۔ ۱۹۲۴ء کے آخر تک میں کسی سیاسی کمیٹی کا ممبر نہ تھا۔ محض ایک تماشائی کی حیثیت رکھتا تھا۔"

اسی دور کی سیاسی شخصیات میں مولانا سب سے زیادہ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت سے متاثر ہوئے۔ ان کو محمد علی کے فہم و اخلاص دونوں پر سو فیصدی اعتماد تھا۔ محمد علی سے عقیدت اور محبت کا اظہار مولانا کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو ذاتی ڈائری جلد اول سے:

"فروری ۱۹۲۱ء کا اخیر تھا جب لکھنؤ میں صوبہ خلافت کا جلسہ رفاہِ عام کے احاطہ میں دھوم دھام سے منعقد ہوا۔ خلافت کا معمولی سے معمولی جلسہ بھی اس وقت انتہائی گرم جوشی کے ساتھ ہوتا تھا اور پھر اس کی صدارت کے لیے تو محمد علی آرہے تھے۔ اس نام کی کشش نے اور چار چاند لگا دیے۔ یہ عین وہ زمانہ تھا کہ میں لکھنؤ کے ہمہ وقتی ہنگاموں سے اکتا کر اور تنگ آکر لکھنؤ سے ۴۰، ۴۲ میل دور اپنے آبائی وطن قصبہ دریاباد ضلع بارہ بنکی کو منتقل ہو آیا تھا۔ لیکن محمد علی کا نام سن کر کیسے نہ آتا۔ بہ قول شخصے سر کے بھل آیا۔"

ایک دوسرا اقتباس آپ بیتی سے ملاحظہ ہو:

"مولانا محمد علی کی زندگی بھر انھیں کو اپنا سیاسی پیشوا سمجھتا رہا۔ ان کے فہم و اخلاص دونوں پر سو فیصدی اعتماد تھا۔ ان کے بعد سے کوئی لیڈر اس پایہ کا نہ ملا۔"

ذاتی ڈائری جلد دوم میں مولانا رقم طراز ہیں:

"محمد علی ضابطے سے تو مرشد نہ تھے لیکن ان کی رضا جوئی اپنے کو ایسی ہی مقصود و مطلوب رہتی جیسے مریدوں کو اپنے مرشدوں سے رہتی ہے۔"

غرض کہ مولانا محمد علی کے اصرار پر وہ اس دور کی عظیم الشان خلافت تحریک میں باقاعدہ طور پر شامل ہو گئے اور اس کے توسط سے عملی سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔

"۱۹۲۵ء میں محمد علی ہی کی رفاقت اور کشش کھینچ کر اس حلقہ کے اندر لائی۔ شرکت کی تبلیغ زبانی گفتگوؤں میں بار ہا کرتے رہے تھے۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مرکزی خلافت کمیٹی کا ممبر منتخب ہوا۔ خلافت کمیٹی کا عروج اس وقت تک ختم ہو چکا تھا، اس پر بھی مرکز کی ممبری بڑے اعزاز کی چیز تھی۔ نومبر ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ کے کارکنان خلافت خصوصاً چودھری خلیق الزماں نے یک بیک صوبہ اودھ کی خلافت کمیٹی کا صدارت کا بار سر پہ رکھ دیا۔"

نامناسب نہ ہوگا اگر مختصر الفاظ میں مسئلہ خلافت پر بھی روشنی ڈال دی جائے۔ تحریک خلافت کی بنیاد مسئلہ خلافت و مقامات مقدسہ کے بارہ میں ان وعدوں اور معاہدوں کے ایفا و تکمیل کا مطالبہ تھی جو پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانوی حکومت نے مسلمانانِ عالم اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں سے کیے تھے۔ سلطنت ترکی جنگ عظیم اول میں برطانیہ کی حریف تھی۔ اس کا حکمراں خلیفۃ المسلمین مانا جاتا تھا اور اس کے زیر اقتدار جزیرۃ العرب بھی تھا۔ جس میں مسلمانوں کے مقامات مقدسہ واقع ہیں۔ قوی اندیشہ تھا کہ ترکی کی شکست کے نتیجہ میں خلیفۃ المسلمین کی سیاسی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی حیثیت بھی خطرہ میں پڑ جائے گی اور اس کے اقتدار سے مقامات نکل جائیں گے۔ برطانوی حکومت مسلمانان ہند کی اسی فکرمندی کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے جنگ کے بارہ میں اپنی پالیسی کا ہندوستان میں وائسرائے ہند کے ذریعہ برطانیہ میں وزیر اعظم کی پارلیمنٹ میں تقریر کے ذریعہ صاف اور واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ جنگ مذہبی نہیں ہے اور اس کے دائرہ میں مقامات مقدسہ کو دور رکھا جائے گا۔ نیز خلیفہ کی مذہبی حیثیت کو مجروح نہ ہونے دیا جائے گا۔ ۱۹۱۸ء میں

برطانیہ کی فتح اور ترکی کی شکست کے بعد برطانیہ کے تیور بدل گئے اور مسلمانانِ ہند سے کیے گئے وعدوں سے مکر جانے کے قرائن و شواہد یکے بعد دیگرے نظر آنے لگے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں اسی شہر لکھنؤ میں خلافت کمیٹی کی بنیاد پڑی۔ اس وقت علی برادران بیتول جیل میں نظر بند تھے لیکن جب سے باہر نکلے خلافت کمیٹی پر ایسا چھاگئے کہ لوگ اس کے بانیوں کو بھول ہی گئے اور زبانوں پر صرف محمد علی شوکت علی کے نام رہ گئے۔ یہ خلافت کمیٹی کے مرادف اور خلافت کمیٹی ان کے مرادف۔ خود تحریک خلافت ہی کیا تھی؟ ایک دوسرا نام علی برادران کا یا عام فہم و عام پسند لفظوں میں محمد علی شوکت علی کا۔

تحریک خلافت کا یہ پہلو خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس سے ہمارے ملک میں آزادیٔ کامل کی بنیاد پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا گیا۔ پہلی مرتبہ ہندوستان برطانیہ کی رعایا ہونے پر فخر کرنے کی ذلت سے نکلا اور ہر باشندۂ ملک نے خودداری اور خود اعتمادی کی فضا میں اپنے کو ہندوستانی کہنے پر شرم نہ کرنا دریافت کیا۔ قاضی عدیل عباسی مرحوم کے الفاظ میں:

> "تحریک خلافت ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اسی اجالے میں اس نے اپنے آپ کو دیکھ لیا اور پالیا۔ جو نظارہ ہندو مسلم اتحاد کا اس تحریک کے زمانہ میں دیکھنے میں آیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ تحریک آزادی نے عوام کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب ہر طرف ایک ہی جذبہ تھا کہ انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے۔"

اب آیئے ذرا اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ مولانا دریابادی جن کا مزاج مطلق سیاسی نہ تھا ایک بڑی سیاسی جماعت میں باقاعدہ طور پر شامل ہو کر اور اس میں اہم اور ذمہ دار عہدے پر فائز ہونے کے بعد کیا گزری اور انھوں نے کیسا محسوس کیا۔

خلافت کمیٹی کا صدر دفتر بمبئی میں تھا لیکن جلسوں کے لیے سہولت کے خیال سے کوئی مرکزی ہی مقام اختیار کیا جاتا تھا۔ تقریباً ہر جلسہ میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ اس پر قومی اور اسلامی ہند کے عظیم الشان ادارہ کی کارفرمائیوں کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔

ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

"میں اکتوبر ۱۹۲۵ء میں نیا نیا مرکزی کمیٹی کا ممبر بنا تھا۔ کچھ تو تازہ تازہ جوش وشوق اور کچھ محمد علی کی ذاتی کشش۔ ہر بار ۳/۱/۲ سو میل کے فاصلہ سے دوڑ کر دریاباد سے دہلی آنا۔"

ہر جماعت وادارہ کو مختلف نشیب وفراز سے گزرنا پڑتا ہے۔ مولانا دریابادی جب خلافت کمیٹی میں باضابطہ طور پر داخل ہوئے تو یہ زوال پذیر ہو چکی تھی۔ تحریک خلافت کا زور ۱۹۲۴ء میں بھی گھٹ گیا تھا اور ۱۹۲۵ء میں تو تحریک نیم مردہ ہو چکی تھی۔ محمد علی ذاتی ڈائری حصہ اول میں مولانا رقم طراز ہیں:

"یہ نیازمند، بے عمل وپست ہمت اس کے دور عروج میں تو اس سے چھٹکا چھٹکا پھرا۔ اب محمد علی کی مروت اور تعمیل ارشاد میں مجبوراً اس میں شرکت کرنا پڑی اور کچھ عملی حصہ لینا پڑا۔ یار لوگوں نے کوئی ذمہ داری کا عہدہ بھی سر منڈھ دیا۔ اس کی تفصیلات تو اب یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ اس نئی اور اہم ذمہ داری کے سر آپڑنے پر جولائی ۱۹۲۵ء کے مہینہ میں محمد علی کو لکھا: "اپنی قسمت کو کیا کہیے کہ یہ فرض اپنے حصہ میں آیا تو اب جب کہ فضا بالکل ٹھنڈی ہو چکی ہے اور کوئی ولولۂ عمل کہیں باقی ہی نہیں رہا۔" محمد علی نے جواب میں لکھا: "کام کا وقت تو یہی ہے۔ اس وقت تو ایک سیلاب تھا اور سب ہی اس میں بہے چلے جارہے تھے۔ اب کام کرنا عزیمت کا ثبوت ہے۔"

سیاست میں اختلافات اور آویزش ناگزیر ہوتی ہے۔ مولانا دریابادی کو بھی اس کا سامنا کرنا پڑا۔ ذاتی ڈائری حصہ اول میں مولانا تحریر کرتے ہیں:

"مولوی ظفر الملک بھی ان ہی لوگوں میں تھے جو حمایت ابن سعود میں غلو رکھتے تھے اور ہماری خلافت کمیٹی کے خاص رکن تھے۔ ان سے آویزش ناگزیر سی ہو گئی اور پھر سچ (صدق کا پرانا نام)، کے مہتمم اور عقل کل بھی وہی تھے۔ مجھ سا عافیت پسند بھلا جھگڑوں بکھیڑوں کا کہاں عادی۔ جی میں یہی آیا کہ سچ کی ایڈیٹری اور خلافت کمیٹی کی صدارت دونوں ہی سے استعفا داخل کر دیا جائے۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء

کے آخری ہفتہ میں مولانا کو خط لکھا کہ ان دونوں باتوں کی اجازت مرحمت ہو۔ ہمدرد کے اسٹاف کے ایک صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط موصول ہوا۔ اس میں یہ الفاظ تھے

خلافت کمیٹی کے استعفے پر بہت ناراض ہوئے۔ فرماتے ہیں کہ یہ وقت نہیں کہ آپ اس طرح علیٰحدہ ہو جائیں۔ مخلصین کو دل شکنی اور حوصلہ فرسا تجربات ہوتے ہی رہتے ہیں تو پھر کیا ان سے گھبرا کر کام چھوڑ دیا جائے۔"

اب ذرا خلافت کمیٹی کے اس اجلاس کے بارہ میں بھی کچھ بات کر لی جائے جو اسی شہر لکھنؤ ۱۹۰۶ء میں ہوا اور جس کے صدر استقبالیہ مولانا دریابادی تھے۔ اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ خلافت کانفرنس ہوتی تھی اور نہ کہیں خلافت کے ممبر ہی باقی رہ گئے تھے۔ بہرحال آخر میں مرکزی خلافت کمیٹی نے طے کیا کہ خلافت کانفرنس کا اجلاس ایک بار پھر ہو اور اب کے ضمیمہ کے طور پر موتمر عالم اسلامی کا اجلاس بھی رکھا جائے۔ مقام اجلاس کے لیے انتخاب لکھنؤ کے نام پر پڑا اور تاریخیں اخیر فروری کی قرار پائیں۔ اس وقت خلافت کی حیثیت عوام کی نظروں میں کیا رہ گئی تھی اس کا ذکر خود مولانا نے نہایت دل چسپ اپنی ذاتی ڈائری میں اس طرح کیا ہے:

"شہر میں اشتہار تقسیم کرنے کے لیے ہمارے والینٹروں کی وہ ٹولی جب لکوں پر اور پیدل باجہ بجاتی ہوئی نکلی تو مجھے وزیر گنج کی ایک بوڑھا کا فقرہ نہیں بھولتا۔ سڑک پر یہ مختصر جلوس دیکھ پکار کر بولی "اے لو خلافت پھر نکلی"۔ عوام کے دل سے اس کا تصور مٹ چکا تھا۔ اب جو نام سنا تو جیسے بھولا ہوا خواب یک بیک پھر یاد پڑ گیا"۔

چونکہ مولانا اودھ خلافت کمیٹی کے منتخب صدر تھے اس لیے لکھنؤ میں ہونے والی اس کی استقبالیہ کمیٹی کا صدر بھی مولانا کو بنایا گیا۔ اس بارہ میں مولانا لکھتے ہیں:

"وہی یہ پہلی صدارت میرے مذاق طبیعت کے کیا موافق تھی۔ یہ دوسری تو سراسر عملی اور انتظامی قسم کی خدمت تھی۔ ہر وقت کی دوڑ دھوپ کی طالب اور سب سے بڑھ کر چندہ وصول کرنے کی مہم۔ اس پر اپنے تجربے قلم بند کرنے بیٹھوں تو خود

ایک مستقل مقالہ تیار ہو جائے۔ بہر حال میں نے یہ ساری ذمہ داریاں اپنے مذاق کے خلاف جو قبول کیں تو اس کی تہ میں زیادہ تر دخل اسی جذبہ کو تھا کہ محمد علی کی خوشی اسی میں ہے۔ محمد علی ضابطہ سے مرشد نہ تھے لیکن ان کی رضا جوئی اپنے کو ایسی ہی مقصود و مطلوب رہی جیسے مریدوں کو اپنے مرشد کی ہوتی ہے۔ خیر کام تو سارے کے سارے دوسرے لوگ انجام دیتے رہے لیکن نیک نامی ضابطہ کی صدارت کی بنا پر خوامخواہ اپنے حصہ میں آگئی۔ مولانا شوکت علی چندہ وصول کرنے کی گویا مشین تھے اور اس فن میں لاثانی۔ بڑے لوگوں کے ہاں جہاں جہاں گئے یہ خاکسار بھی "تابع مہمل" کی طرح ساتھ لگا رہا۔ فطرت بشری کے تجربے خوب خوب حاصل ہوتے رہے۔"

اس حقیقت کے باوجود کہ تحریک خلافت کا دم واپسیں تھا لیکن کانفرنس نہایت رہی۔ اس کے جلسے دو ڈھائی دن زور شور سے رہے۔ اس جلسہ میں کچھ ہنود حضرات دریابادی کی دعوت پر شریک ہوئے۔ مثال کے طور پر پنڈت کشن پرشاد کول ممبر سرو انڈیا سوسائٹی اور ایڈیٹر ہندوستان۔

مولانا نے اس موقع پر جو خطبہ صدارت ۲۶ فروری ۱۹۲۷ء کو لکھنؤ کے ۱۴ اور آل انڈیا خلافت کمیٹی کانفرنس میں پڑھا اس سے ایک اجمالی نقشہ اس وقت کی سیاسی وقت کے مسائل کا نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کی حاضرہ پر گہری نظر تھی نہ صرف ملکی سیاست بلکہ سیاسیات عالم اسلامی سے بھی۔ خطبہ کے وقت اور اس کے خاتم پر لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔ لیکن مولانا کے لیے سب سے بڑ قیمتی داد یہ تھی کہ ان کے محبوب لیڈر مولانا محمد علی نے ایڈریس کے خاتم پر معاً لپک کر اور پیشانی پر بوسہ دے دے کر داد کے الفاظ بڑے فیاضانہ الفاظ میں صرف کر ڈالے

غرض کہ مولانا محمد علی کے شدید اصرار پر مولانا دریابادی تحریک خلافت کے فارم سے عملی سیاست کی خار دار وادی میں داخل ہوئے اور کچھ برسوں تک اس عمل رہے اور اس مختصر مدت میں انھوں نے اپنی ہمہ گیر شخصیت کے نقوش اس بھی ثبت کیے جو آج تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان کی سیاسی تربیت اور سیاسیات سے وا

لانا محمد علی کا اہم حصہ رہا اور اس کا اعتراف مولانا نے متعدد بار اپنی تحریروں میں کیا ہے
ال کے طور پر ایک اقتباس ذاتی ڈائری جلد اول سے ملاحظہ ہو:

"سیاسی تربیت اور واقفیت محمد علی کے ساتھ رہ کر چند روز میں جتنی حاصل ہو جاتی تھی وہ بجائے خود ایک نعمت تھی اور واقفیت صرف سیاسیات ہندی سے نہیں بلکہ سیاسیات عالم سے بھی خصوصاً سیاسیات عالم اسلامی سے۔"

خلافت کمیٹی کے علاوہ اس وقت جو دوسری بڑی سیاسی جماعتیں مثلاً انڈین نیشنل
انگریس اور مسلم لیگ میدان میں تھیں ان سے مولانا دریا بادی کا تعلق نہ ہونے کے برابر رہا۔
ود مولانا کے الفاظ ہیں:

"سیاسی مجلسوں سے اس ڈائری نویس کو زیادہ دل چسپی کبھی نہیں رہی۔ خلافت کمیٹی کی صورت ایک استثنا کی تھی۔ مسلم لیگ کا نہ کبھی ممبر رہا، نہ کسی جلسہ میں تماشائی کی حیثیت سے بھی شریک ہوا۔ (حصہ اول۔ ص ۲۹۸)

پنی آپ بیتی میں مولانا نے لکھا ہے:

"ان کے (محمد علی کے) بعد سے کوئی لیڈر (اس) پایہ کا نہ ملا اور اسی لیے بعد کی کسی تحریک مسلم لیگ وغیرہ میں عملاً نہ شریک ہوا۔"

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

"پاکستان کے قیام کا میں اصولاً حامی تھا کہ اس سے مسلمانوں کو ایک ہوم لینڈ ہاتھ آیا جاتا ہے۔ لیکن تحریک جس رخ پر چلی اور جو جو مرحلے پیش آتے رہے ان سے میرا کوئی تعلق کبھی نہیں رہا اور تقسیم ملک کا انجام مسلمانان ہند کے لیے اتنا دردناک اور الم انگیز ہو گا۔ اس صورت حال کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں تھا۔"

اُردو بولیے، اُردو پڑھیے، اُردو لکھیے

عابد سہیل

مبادی فلسفہ ـــــ ایک اجمالی جائزہ

مولانا عبدالماجد دریا بادی ایک 'جامع حیثیات' شخصیت تھے۔ مذہبیات، سیاسیات، فلسفہ، نفسیات اور صحافت سے انھیں خاص طور سے دلچسپی تھی۔ لیکن ان تمام شعبوں میں ان کا رویہ بنیادی طور پر فلسفیانہ، یعنی چھان پھٹک کا تھا۔ ممکن ہے فلسفہ اور چھان پھٹک کو مترادف کے طور پر استعمال کرنا کچھ زیادہ مناسب نہ معلوم ہو۔ لیکن اس ضمن میں ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ فلسفہ کی ابتدا بھی چھان پھٹک سے ہوئی اور اس درمیانی مدت کے بعد جس میں باقاعدہ مذاہب فلسفہ یعنی Systems of Philosophy وجود میں آئے، واپسی بھی چھان پھٹک کی جانب ہی ہوئی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ ابتدائی فلسفیانہ موشگافیوں کے بعد کم و بیش ڈھائی ہزار سال قبل، یونان ہو یا ہندستان، فلسفہ سارے علوم کو محیط تھا۔ اسے دو بنیادی سوالوں کا جواب دینا پڑتا تھا۔ کیا وہ کائنات کا، جس کے وجود سے انکار تو ممکن ہے لیکن جس کے احساس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا، جواز فراہم کر سکتا ہے یا یہ کیا اس کی منطق سے یہ پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو بھی ہے، جس صورت میں بھی ہے، اور اگر نہیں بھی ہے یا یہ کہ اس کا صرف احساس ہے تو کیا اس مذہب فلسفہ اور اس تجربہ کا وجود ایک دوسرے کو مسترد کیے بغیر ممکن ہے بلکہ یہ کہ اس احساس کو اس مخصوص مذہب فلسفہ کی حمایت حاصل ہے۔ دوسرا سوال جس کا جواب ہر مذہب فلسفہ کو دینا پڑتا ہے یہ ہے کہ کیا وہ خود کو اپنی داخلی منطق سے قائم رکھنے پر قادر ہے۔ ان دو سوالوں کے جوابات فراہم کرنے کی کوشش ہی دراصل تمام مذاہب فلسفہ کو طبیعات اور ما بعد الطبیعات کی ایک ایسی تصویر پیش کرنے کی کوشش پر مجبور کرتے تھے جس میں بظاہر سارے مسائل، سارے سوال حل ہو جاتے تھے اور کچھ بھی ایسا

نہیں رہ جاتا تھا جس کے لیے اس حصار کے باہر جانے کی ضرورت محسوس ہو۔ ایسا ہرگز تھا نہیں لیکن ایسا سمجھا اور سمجھایا ضرور جاتا تھا۔

لیکن تجربی سائنس کی ترقی نے بیشتر علوم فلسفہ سے چھین لیے اور پھر ان علوم کی بھی شاخیں ہوئیں اور آج ان میں بیشتر آزادانہ وجود رکھتے ہیں اور فلسفہ کے لیے باقی بچے صرف وہ قضایا جن کی پرکھ کے ذرائع تھے، نہ ہیں، نہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس "متاع عزیز" کو بھی مثبتیوں نے اپنی اس دلیل سے کہ وہ سارے قضایا جو قابل تصدیق (verifiable) نہیں قضایا ہی نہیں، چھین لیا۔ مذہب فلسفہ پر دوسرا بڑا حملہ لسانی فکر کی جانب سے ہوا کہ فلسفہ کے سارے مسائل دراصل زبان کے مسائل ہیں۔ مثلاً رسل نے دلیل دی کہ God is[1] اور He is going[1] میں لفظ IS کا استعمال بالکل الگ الگ معنوں میں ہوا ہے چنانچہ خدا کے وجود و عدم وجود کے قضایا دراصل لسانی قضایا ہیں۔ لیکن مذہب فلسفہ پر اس تیسرے حملہ نے جو وجودی فکر نے کیا اس کے سارے تار و پور کو ہی بکھیر دیا۔ اس دعوے کے بعد کہ وجود جوہر پر مقدم ہے (Existence Preceeds Essence) مابعد الطبیعات کی تو بنیاد ہی ختم ہوتی نظر آتی ہے۔

مولانا کی تصنیف (مبادی فلسفہ) ایک ایسے دور میں وجود میں آئی جب مذہب فلسفہ تیزی سے بکھر رہا تھا اور افضل ترین اصول cardinal principles یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی افضل ترین اصول نہیں ہے۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

مولانا عبدالماجد کے لیے جو ذہنی طور پر افضل ترین اصول کے ہمیشہ حامی بلکہ موید رہے یہ ماتم کس قدر سخت بلکہ سخت تر رہا ہوگا اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنے نظریاتی اور فکری اعتمادات اور اعتقادات کو اپنے ہی بوجھ تلے مسمار ہوتے دیکھا ہے۔

مبادی فلسفہ اس فکری انتشار اور پھر ایک دوسری چھتری تلے اسی فکری خس و خاشاک سے ایک آشیانہ کی تعمیر کی داستان ہے۔ اس میں ان کے ذہنی تحفظات اور شکوک کو بھی شامل

---

[1] رسل کا جملہ شاید یہ نہیں تھا۔

کر لیجیے تو تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔

مولانا فلسفی نہیں مفسر فلسفہ تھے اور مبادی فلسفہ کو اسی نقطۂ نظر سے پڑھنا چاہیے۔ یہ ہاکنگ کی انواع فلسفہ Tapes of Philosophy کے قسم کی تصنیف ہے نہ مادھوچار کے سرو درشن سنگرہ کی طرح کی کتاب بلکہ ان تیرہ مقالات کا مجموعہ ہے جو مولانا نے چھ سات سال مدت میں فلسفہ کے بعض اہم مباحث پر لکھے تھے۔ ان میں ایسے مضامین بھی ہیں جو افضل ترین اصول کے موضوع کے مضمرات کو چھوتے ہیں اور ایسے بھی جو ان مضمرات کے مضمرات پر روشنی ڈالتے ہیں اور وہ بھی جنھیں آج شاید فلسفیانہ موضوع قرار ہی نہ دیا جا سکے۔ لیکن یہ سارے مضامین ان کی دروں بینی اور فلسفیانہ مسائل کے گہرے مطالعہ اور ان کے مضمرات سے مکمل شناسائی کی گواہی ضرور دیتے ہیں۔

مولانا دریابادی نے اپنا ذہنی سفر مذہب سے شروع کر کے مذہب ہی پر ختم کیا۔ درمیانی مدت میں وہ تشکیک اور الحاد کی منزلوں سے بھی گزرے۔ گویا ان کا مذہب موروثی نہیں اختیاری تھا، محض جذبہ کا اسیر نہیں تھا بلکہ وہ اس تک عقل و خرد اور دلائل کی وساطت سے پہنچے تھے۔ کانٹ نے کیا خوب کہا ہے کہ کوئی فعل اس وقت تک اخلاقی قدر نہیں بن سکتا جب تک اسے کرنے کے لیے انسان کو خود سے لڑنا نہ پڑے۔ مولانا کی تو ساری زندگی خود سے لڑنے ہی میں گزری۔ تشکیک، الحاد اور اگر آپ مجھے معاف کریں تو مذہب تک کو " چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی "کے طور پر تسلیم کر لینا ایک بات ہے اور کسی نتیجہ پر عقل اور دلیل کی روشنی میں پہنچنا دوسری بات۔ مولانا نے نہ صرف فلسفہ کا مطالعہ کیا بلکہ فلسفہ کی معیت میں زندگی بسر کی اور ان کی زندگی کو اس شعر کی عملی تشکیل قرار دیا جا سکتا ہے:

یقیں کی خلد طرب ناک تک پہنچنے میں
ہزار منزل وہم و گماں سے گزرے ہیں

مبادی فلسفہ کی پہلی جلد ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی تھی اور دوسری ۱۹۲۴ء میں۔ لیکن یہ سارے مضامین جن پر یہ کتاب مشتمل ہے ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۹ء کے دوران چھپ چکے

تھے یعنی مولانا کی عمر کے ۲۹ ویں سے ۳۶ ویں سال کے درمیان۔ ان مضامین کے موضوعات کا انتخاب اور مسائل کی جانب ان کا رویہ اور ۱۹۱۲ء میں لکھا جانے والا پہلا مضمون "فلسفہ اور مذاہب فلسفہ پر ایک نظر اور ۱۹۱۶ء میں لکھا جانے والا مضمون "مذہب ارتقائی نقطۂ نظر سے" مولانا کے فکری سفر کی روداد اور اس ذہنی کش مکش کی مکمل نہ سہی تو خاصی بڑی حد تک تصویر کشی کر دیتے ہیں جن سے ان کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ کتاب کا آخری مضمون اس منزل کی نشان دہی کرتا ہے جس تک مولانا دریابادی تشکیک اور الحاد کی منزلوں سے گزر کر پہنچے۔ ۱۹۱۶ء کے بعد انھوں نے جن فلسفیانہ موضوعات کو قابلِ توجہ سمجھا ان پر مذہب کی چھاپ بہت گہری ہے۔ اس دوران وہ بارکلے کے مکالمات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس کا ترجمہ کر ڈالا اور اس پر مقدمہ بھی لکھا۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یورپ میں مادیت اور عقلیت پرستی (Rationalism) کی سب سے شدید اور مدلّل مخالفت بارکلے ہی نے کی۔ وہ زبردست مذہب پرست اور پادری تھا۔ ترجمہ کے لیے بارکلے کے مکالمات کا انتخاب ہی ان کی فکر میں تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے مقدمہ میں بارکلے کی وکالت تو نہیں کی البتہ اس کے دلائل انھیں قابلِ قبول نظر آئے وہ ان کی حمایت میں "صوفیہ اسلام اور بعض ہند و فقرا" کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۴ء میں ان مضامین کو کتابی شکل دیتے وقت مولانا نے ان پر "پوری طرح نظرِ ثانی" کی، "صرف اجمالی نہیں بلکہ تفصیل کے ساتھ ایک ایک جملہ پر اور ہر ہر فقرہ پر قطع و برید، تبدیل و ترمیم، حذف و اضافہ لفظوں اور عبارتوں میں بکثرت" کیا، اور "بعض مقامات پر صفحے کے صفحے بدل کر بالکل نئے ہو گئے"۔ اصل مضامین اور قطع و برید کے بعد شائع ہونے والے مضامین کا تقابلی مطالعہ ممکن ہے مولانا کے ذہنی سفر کی واضح نشان دہی کرے۔ یہ کام کرنے کا ہے۔

مولانا نے اپنے متعدد مضامین اپنے سرمایۂ تحریر سے مسترد کر دیے تھے۔ اولاً تو جو چیز شائع ہو گئی وہ مصنف کی رہ کہاں گئی۔ اسے اس بات کا تو حق ہے کہ خود اپنے ہی سابقہ نقطۂ نظر کو مسترد کرے، اس کے خلاف جم کر لکھے۔ وہ ان سے برأت بھی کر سکتا ہے لیکن

ان کے وجود کو عدم وجود میں تبدیل نہیں کر سکتا اور پھر مولانا وہ فرد واحد نہیں تھے جو تشکیک و الحاد کے اسیر ہو گئے، ان سے پہلے بھی لوگ ان منزلوں سے گزرے ہیں، ان کے بعد بھی اور مستقبل میں بھی لوگ ان مسائل سے دوچار ہوں گے۔ وہ سوال اور مولانا نے ان کا جواب جس طرح ڈھونڈا یہ دونوں ہی چیزیں سامنے ہوں تو مستقبل کی نسلوں کے لیے زیادہ مفید ہوں گی کیونکہ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی اور مولانا اشرف علی تھانوی "مٹی کو نم" کر سکتے تھے۔ وہ "نم مٹی" کو زرخیز تو بنا سکتے تھے۔ لیکن سوال نم مٹی کو زرخیز بنانے کا نہیں، بلکہ کھاری شورہ زمین کو زرخیز بنانے کا ہے۔ اور مولانا دریابادی کا مذہب "لاچار مسلمان شد" والا نہیں تھا۔ وہ فکر و نظر کے وسیلہ سے اس منزل تک پہنچے تھے۔ ان کے فکری سفر سے مکمل واقفیت اور نئی نسلوں کی رہنمائی کے لیے انھیں صرف جوابوں سے نہیں بلکہ سوالوں سے بھی واقف ہونا چاہیے۔

یہ مضامین اس وقت لکھے گئے تھے جب تجربی سائنس کی ترقی سے فلسفہ کی دنیا روز بروز سکڑ رہی تھی اور صرف مابعد الطبیعات تک محدود ہو جانے کی جانب گامزن تھی۔ علم منطق فلسفہ کا حصہ رہنے کے باوجود اس کا باج گزار نہیں بلکہ آزاد وجود کا مالک ہو چکا تھا اور ارسطو کی منطق جسے روایتی منطق کا نام بھی دیا جا سکتا ہے دھیرے دھیرے مابعد الطبیعاتی (بریڈلے اور بوسانکے)، عملی (جان ڈیوی) اور ریاضیاتی (وہائٹ ہیڈ اور برٹرینڈ رسل) ہوتی جا رہی تھی۔ نفس و مفردات نفس، ماہیت جذبات، حس، عملی تو ہم اور فلسفہ جذبات اب نفسیات کا حصہ ہیں جو بڑی حد تک تجربی ہو چکی ہے۔

تجربی علوم اور مابعد الطبیعات کے قضایا میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں اول الذکر کے قضایا تبدیل ہوتے رہتے ہیں وہاں موخر الذکر یعنی مابعد الطبیعات کے افکار، استدلال کی حد تک دائم و قائم رہتے ہیں خواہ ان کو رد کرنے کے لیے کتنے ہی مضبوط دلائل کیوں نہ پیش کیے جائیں۔

لیکن فلسفہ کے چھتنار درخت سے الگ ہونے والی شاخوں کے بارے میں، جنھوں نے تجربی سائنس کی آغوش میں نئے گل بوٹے کھلائے، اپنے وقت کے اکتسابات سے مولانا پوری طرح واقف تھے۔ ظاہر ہے اس وقت کے علم کو بعد کے انکشافات کے پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔

ایک مضمون کے علاوہ باقی سارے ہی مضامین میں مولانا نے استدلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور اپنی ذہنی کش مکش کا عکس ان پر نہیں آنے دیا ہے۔ "تشکیک اور متشککین"،

واجب الوجود اور حکمائے جرمنی" اور" مل کی منطق اس ضمن میں نمونہ کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان مضامین میں مولانا دریابادی نے نہ "بُت شکنی" کی ہے نہ "ہم" کو راہ کا سنگ گراں بننے دیا ہے۔ صاف اور شستہ زبان، عبارت آرائی سے پاک، غیر مبہم انداز بیان اور عالمانہ نثر نے نفس مضامین کو اس وقار سے ہم کنار کیا ہے جس کے وہ مستحق تھے۔

دیباچہ حصہ اول میں مولانا نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ:

"ملک کی مختلف یونی ورسٹیوں کے نصاب میں اب اردو ادب داخل ہو چکا ہے۔ ممکن ہے ان درجوں کے طالب علموں کو سنجیدہ مباحث پر مقالہ نگاری و مضمون نویسی کی مشق میں اپنے ایک پیش رو کی حقیر کوششوں سے کچھ تھوڑی بہت مدد مل جائے۔"

سنہ ۱۹۳۱ء میں جب اس کتاب کا حصہ اول شائع ہوا، ملک کی علمی، ادبی اور ذہنی فضا آج سے قطعاً مختلف تھی۔ اس وقت کے طلباء نے یقیناً اس سے خوب خوب کسب فیض کیا ہوگا۔ لیکن آج صورت یہ ہے کہ ان کے ٹوٹے پھوٹے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے جب میں نے لائبریری سے یہ کتاب حاصل کی، (میں اپنا ذاتی نسخہ فوری طور سے تلاش نہ کر سکا) تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سنہ ۱۹۸۲ء کا یہ ایڈیشن مطالعہ کے لیے سنہ ۱۹۹۰ء میں پہلی بار لائبریری سے باہر آیا ہے۔ ایسی صورت میں کیا ہم خود کو مولانا کے اکتسابات کا وارث بھی قرار دے سکتے ہیں؟ ہمیں اس پہلو پر بھی غور کرنا ہوگا کہ ہم نے مولانا کو ایک بنا کر اپنے معتقدات کا اسیر اور دوسروں کے لیے "شجر ممنوعہ" تو نہیں بنا دیا ہے۔ ضرورت ہے سالم مولانا عبدالماجد دریابادی کو دریافت کرنے کی۔

امید ہے یہ سمینار 'عبدالماجد فہمی' میں معاون ہوگا اور نئی نسل کو اس جید عالم کے اکتسابات سے مستفیض ہونے اور ان خارزار راستوں سے واقفیت حاصل کرنے پر بھی اکسائے گا جن کو مولانا نے عقل و خرد کی روشنی میں خس و خاشاک سے پاک کیا تھا۔

(پروفیسر) ضیاء الحسن فاروقی

حیاتِ ماجدی کا مجدِ علمی

"ایک انگریزی خواں ہوں، مدتوں مغربی فلسفے کے اثر ضلالت بلکہ الحاد کی وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا، خدا اور رسولؐ کی شان میں گستاخیاں کرتا رہا، برسوں کے بعد اسلام و ایمان کی طرف مراجعت نصیب ہوئی، زیادہ تر مثنوی کی برکت سے، گو اسے بھی بے سمجھے پڑھا۔ اکبر الہ آبادی کی صحبتیں بھی اصلاحی اثر ڈالتی رہیں، اب 'سچ' ہفتہ وار کے ذریعے سے، اپنی بساط کے لائق، دین کی خدمت میں لگا لپٹا ہوا ہوں، اپنے لکھے ہوئے کو آپ ہی مٹاتا رہتا ہوں۔"

یہ ایک اقتباس ہے "حکیم الامت، نقوش و تاثرات" (مؤلفہ مولانا عبدالماجد دریابادی، مطبع معارف، ۱۹۵۲ء، صفحہ ۵) میں درج، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام مصنف کے ایک مکتوب سے جو ستمبر یا اکتوبر ۱۹۲۷ء میں اُس وقت لکھا گیا تھا جب مولانا کو مرشد کی تلاش تھی۔ اس اقتباس کا خاص فقرہ میرے نزدیک آخری فقرہ ہے، یعنی "اپنے لکھے ہوئے کو آپ ہی مٹاتا رہتا ہوں۔" اس ایک فقرے میں مولانا دریابادی کی علمی و ادبی زندگی کی ایک داستان سموئی ہوئی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے خانگی تعلیم و تربیت اور اسکول کی تعلیم کے بعد اعلا تعلیم کے میدان میں قدم رکھا تو اُس وقت کے انگریزی نصاب تعلیم پر مغرب کی لبرل ازم اور لبرل ایجوکیشن کی ان اقدار و روایات کی گہری چھاپ تھی جن کے ڈانڈے انیسویں صدی کی عقلیت (ریشنلزم) سے ملتے تھے۔ اس دور میں سائنس خصوصاً لبرل آرٹس کی تعلیم پورے طور پر مغربی تمدن کی ترجمان اور آئینہ دار تھی، جس کی تعمیر میں یونان، روما، عیسائی مذہب

اور اٹھارویں صدی کی منتشر الخیال اور بعض لحاظ سے الحاد پرور روشن خیالی کو بنیادی عناصر کی حیثیت حاصل تھی۔

ہندوستان میں اس تعلیم اور نصابِ تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس عہد کے شرفا (خاص طور پر شمالی ہندوستان کے) کے گھرانوں کے نوجوانوں کو سلطنتِ برطانیہ کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے، اور یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کرنے کے بعد عام طور پر یہ نوجوان اس خدمت کو باعثِ افتخار سمجھتے تھے اور ان کی بھاری اکثریت چھوٹی بڑی سرکاری ملازمتوں میں لگ بلکہ کھپ جاتی تھی۔ کم گریجویٹ ایسے تھے جو آزاد پیشے اختیار کرتے تھے یا علم وادب کی خدمت گزاری کو اپنی زندگی کا زیور تصور کرتے تھے۔ علم وادب دونوں کی خوش نصیبی تھی کہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی برادری اور اپنے ماحول کے سماجی تقاضوں سے کٹ کر انھیں کی ملازمت اور خدمت اپنے لیے پسند کی اور سرکاری ملازمت نہیں کی۔

لیکن وہ جو ہم نے لبرل آرٹس کی تعلیم کی طرف اشارہ کیا، مولانا دریابادی کے علمی و ادبی کیریئر میں اس کے گہرے اثرات سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اس تعلیم کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کے نظام الاوقات میں آزاد مطالعہ کی بڑی گنجائش تھی، تخصص (Specialization) یک رُخاپن شاذ تھا، بلکہ یوں سمجھیے کہ ابھی اس کا جادو نہیں چلا تھا۔ مقررہ نصاب کے فریم ورک میں مختلف علوم وفنون اور ان کے متعلقات میں ایک صاحبِ ذوق واستعداد اور مطالعہ کا شیدائی طالب علم اپنے مطالعہ کو مختلف سمتوں میں خاصی دور تک لے جاسکتا تھا۔ ہمارے مولانا دریابادی مرحوم نے مطالعہ لڑکپن ہی سے جن کی فطرتِ ثانیہ تھی، کالج کی انڈر گریجویٹ سطح ہی پر آزاد مطالعہ کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا تھا، انگریزی زبان وادب بی۔ اے میں ان کا لازمی مضمون تھا، اور عربی اور فلسفہ ان کے اختیاری مضامین تھے۔ شاید فلسفے اور منطق سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت بھی تھی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ "عقلیت" اور آزاد خیالی نے انھیں پورے طور پر اپنے قابو میں کر لیا۔ اپنی 'آپ بیتی' میں انھوں نے اپنی زندگی کے اس دور کی دلچسپ داستان ہمیں سچائی اور صاف گوئی سے

سنائی ہے اور اس کی کوشش نہیں کی ہے کہ اپنی زندگی کے اِس "نشیب" میں "فراز" کی کوئی کیفیت پیدا ہونے دیں۔ کمال معروضیت کے عقائد و اعمال پر جو کچھ گزری، اسے بے کم و کاست بیان کر دیا۔ لکھتے ہیں:

"لیجیے برسوں کی محنت اور تیاری کا قلعہ بات کی بات میں ڈھ گیا۔۔۔ اسلام و ایمان کی دولت عظیم بات کہتے، ارتداد کے خس و خاشاک میں تبدیل ہو گئی ۔۔۔ مذہبی مطالعہ اس وقت بھی کچھ ایسا کم نہ تھا لیکن فرنگی الحاد کے جس سیلاب عظیم سے ٹکراؤ تھا اس کے مقابلہ کے لیے وہ مطالعہ ہرگز کافی نہ تھا۔"[1]

اِسی دور کی خاص تالیفات و ترجمے مولانا کے قلم سے 'فلسفۂ جذبات'، 'فلسفۂ اجتماع' 'منطق استخراجی و استقرائی' اور 'سائیکلوجی آف لیڈرشپ' وغیرہ ہیں۔ اُن کی بعض تحریروں اور ترجموں کو دیکھ کر اُس وقت مولانا ابوالکلام آزاد نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ:

"مجھے یقین ہے کہ اُن (مولانا دریابادی) کا ذوق علمی اردو زبان کو انشاء اللہ بہت فائدہ پہنچائے گا اور علوم حدیثہ کے تراجم میں ان سے بہت مفید مدد ملے گی جو اب تک گویا اردو زبان میں مفقود محض ہیں۔"[2]

سائیکلوجی آف لیڈر شپ پر مولانا محمد علی نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۵ رجولائی ۱۹۱۶ء میں اظہارِ خیال کیا تھا اور مولانا کو لکھا تھا کہ:

"یہ کتاب مصنف کے جس غور و فکر، وسعت مطالعہ اور زبردست قوت مشاہدہ کی شہادت دے رہی ہے، اس کے لحاظ سے میں داد دیتا ہوں۔۔۔ موجودہ فلسفیانہ زبان پر آپ کو جو قدرت بلکہ عبور حاصل ہے اس پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ بیان ہر جگہ صاف ہے اور جو شخص نفسیات جدیدہ سے واقف ہے اُسے آپ کے مفہوم کے سمجھنے میں کہیں بھی دقت نہیں ہو سکتی۔"[3]

---

[1] آپ بیتی، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء۔ ص ۲۳۸ - ۲۳۷

[2] ابوالکلام آزاد، الہلال، ۱۲ر ستمبر ۱۹۱۳ء

[3] مولانا عبدالماجد دریابادی، خطوط مشاہیر، جلد اول، لاہور، ۱۹۴۴ء ص ۲۷ - ۲۲۶

ان توصیفی کلمات کے بعد مولانا نے مکتوب الیہ کے بعض مزعومات اور خیالات پر
تنقید کی ہے خصوصاً ان خیالات کی جن کا اظہار انھوں نے پیغمبر خدا حضور صلی اللہ علیہ
اور قرآن مجید کے ذکر کے سلسلے میں کیا تھا۔ مولانا محمد علی کو غالباً اس کا علم نہیں تھا کہ
الیہ تشکیک وارتیاب اور الحاد وانکار کی راہ میں کافی دور جا چکے ہیں، اس لیے اُن کو
تھی کہ ایک سچا اور حقیقی مسلمان ایک مقدس شخصیت اور ایک مقدس آسمانی کتاب کا
یوں کر ایسے ہلکے الفاظ اور عیسائی مشنریوں و مستشرقین کے سے سطحی لب ولہجہ میں کر سکتا
لیکن مصنف موصوف مولانا محمد علی کے تبصرہ سے مطمئن تھے۔ انھوں نے اس تبصرہ کے
شاید اپنے اس وقت کے تاثر کا اظہار ایک عرصہ کے بعد "محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق"
اول، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء) میں ان الفاظ میں کیا:

"کتاب پر تبصرے بہتوں نے کیے تھے۔ اچھے اچھے پیشہ ور تبصرہ نگاروں نے بھی۔ محمد علی کا تبصرہ سب سے بڑھ چڑھ کر رہا۔ کوئی دوسرا ریویو نہ اتنا جامع تھا نہ اتنا مفصل۔ نہ اتنا گہرا نہ اتنا مبصرانہ، نہ اتنا پُر مغز نہ اتنا مخلصانہ، نہ بیجا مداحی نہ خواہ مخواہ کی تنقیص۔"

برکلے ایک دوسرے طرز اور عام فلسفیوں کے برعکس مذہبی خیال کا مصنف تھا۔ اس کے
لات کا ترجمہ مولانا نے دار المصنفین (اعظم گڑھ) کے لیے کیا تو اس کے مقدمے میں اس ادارہ
مزاج کی رعایت سے اپنے خاص اسلوب میں یہ دو جملے کیسے جامع، کتنے سادہ و پُرکار اور
پھڑ کا دینے والے قلم بند کیے:

"برکلے کی ذات عقل و نقل کی جامعیت کا مجسمہ تھی۔ اس سے بہتر نمونہ خانقاہِ شبلی کے درویشوں کو ملنا ناممکن تھا۔"

قریب دس سال (۱۹۰۹ء یا اس سے کچھ قبل تا ۱۹۱۸ء کی آخری سہ ماہی) الحاد و ارتداد
بے آب و گیاہ صحراؤں میں شوریدگی اور سرگشتگی کے ایمان و یقین کے ٹھنڈے جھونکوں سے
انی و واماندگی کے دور ہونے اور اسلام کی طرف بازگشت کا زمانہ آیا اور مولانا کی ذات میں
و تحقیق کو ایک ایسا دانش ور عالم اور محقق اور اردو زبان و ادب کو ایک ایسا صاحبِ طرز

ادیب، نقاد اور صحافی مل گیا جو اپنی مثال آپ تھا۔ کوئی پچاس پچپن برس تک وہ اپنے ا
میں علم و دانش اور اردو ادب و انشاء کی دنیا پر چھائے رہے اور ان کی زندگی کے اسی دو
دریابادی نے بھی علم و ادب کی تاریخ میں اپنے لیے ایک مقام حاصل کر لیا، بڑی غیر معمولی بات
ہے، اور کم جگہوں کو یہ رتبہ نصیب ہوتا ہے۔

مطالعہ مولانا کا پہلے ہی سے وسیع تھا۔ تحقیق و تلاش اُن کی گُھٹی میں پڑی تھی اور اس
لیے وہ بے پناہ مطالعہ کرتے تھے۔ یہ جو ہم نے ابھی کہا کہ اسلام کی طرف جب وہ لوٹے تو ان کی
میں علم و ادب کی ایک انجمن سنور گئی، تو اُس کا ایک خارجی لیکن اہم سبب اُن کا گہرا اور متنوع
بھی تھا۔ ملحد فلسفیوں اور مصنفوں کے بعد ۱۹۱۸ء کے وسط میں انھوں نے اپنے اُسی شوق و تفح
کے طفیل "مطالعہ مذہبی یا نیم مذہبی قسم کے فلسفیوں کا شروع کیا۔"[1] اور اس سلسلے میں مغر
مشرق کے کئی فلسفیوں اور فلسفوں کو پڑھا اور جانچا۔ اس سب کی تفصیل 'آپ بیتی' کے باب
میں ملے گی جس کا عنوان 'مد کے بعد جزر' ہے۔ قریب دو سال کے اس مسلسل مطالعے کا اثر م
ہی کے الفاظ میں سننے کے لائق ہے۔ اقتباس ذرا طویل ہے لیکن اس کے بغیر اس موقع پ
بھی نہیں بنتی۔ لکھتے ہیں:

"اس مطالعہ کا حاصل یہ نکلا کہ فرنگی اور مادی فلسفے کا جو بت دل میں بیٹھا ہوا تھا، وہ شکست ہو گیا اور ذہن کو یہ صاف نظر آنے لگا کہ اسرار کائنات سے متعلق آخری توجیہہ اور قطعی تعبیر ان فرنگی مادیین کی نہیں بلکہ دنیا میں ایک سے ایک اعلیٰ اور دل نشین توجیہیں اور تعبیریں اور بھی موجود ہیں اور روحانیت کی دنیا سر تا سر وہم و جہل اور قابل مضحکہ و تحقیر نہیں، بلکہ حقیقی اور ٹھوس دنیا ہے، عزت و توقیر کی مستحق۔ عُمق اور تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے گوتم بدھ اور سری کرشن کی تعلیمات ہرگز کسی مل، کسی اسپنسر سے کم نہیں بلکہ کہیں بڑھی ہوئی ہیں۔ اور حکمائے فرنگ ان کے مقابلے میں بہت پست و سطحی نظر آنے لگے۔

---

[1] آپ بیتی، بحوالہ سابق، ص ۲۴۵

اسلام سے ان تعلیمات کو بھی خاصہ بُعد تھا۔ لیکن بہر حال اب مسائل حیات، اسرار کائنات سے متعلق نظر کے سامنے ایک بالکل نیا رُخ آ گیا، اور مادیت، لاادریت و تشکیک کی جو سر بفلک عمارت برسوں میں تعمیر ہوئی تھی وہ دھڑام سے زمین پر آرہی۔ دل اب اس عقیدہ پر آ گیا کہ مادیت کے علاوہ اور اس سے کہیں ماورا وما فوق ایک دوسرا عالم روحانیت کا بھی ہے۔ حواس، مادی محسوسات، مرئیات و مشہودات ہی سب کچھ نہیں، ان کی تہ میں اور ان سے بالاتر "غیب" اور مغیبات کا بھی ایک مستقل عالم اپنا وجود رکھتا ہے۔" [1]

اسی زمانے میں 'گیتا' کے مطالعے کا مولانا پر یہ اثر ہوا کہ ان کا رجحان تصوف کی طرف ہوا ...ھوں نے صوفیہ کے ملفوظات اور مثنوی مولانا روم کا مطالعہ کیا اور اسی کے ساتھ تصوف ...سی کتابیں بھی خاصی پڑھیں۔ ان مطالعات نے دل کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ...سی قلب ماہیت کے عمل کے دوران جب انھوں نے مولانا شبلی کی سیرت النبی اور محمد علی ...ہی احمدی (عرف عام میں قادیانی) کے انگریزی ترجمے وتفسیر کو دیکھا تو بقول خود ان کے،

"جوں جوں پڑھتا گیا الحمد للہ ایمان بڑھتا گیا ... اور اس انگریزی قرآن کو جب ختم کر کے دل کو ٹٹولا تو اپنے کو مسلمان ہی پایا۔" [2]

اس سلسلے میں مولانا کا یہ اعتراف خاص اہمیت رکھتا اور دعوت غور و فکر دیتا ہے:

"ضلالت مطالعہ کے راستے سے پائی، ہدایت بھی بحمد اللہ اسی کی راہ سے نصیب ہوئی ... زندہ شخصیتوں کو دخل خاص ان انقلابوں میں کم ہی رہا۔

ہندو فلسفہ اور جوگیانہ تصوف نے گویا کفر و ایمان کے درمیان پل کا کام دیا۔" [3]

۱۹۲۰ء سے لے کر عمر کے آخری شب و روز تک اگر مولانا کی تحریروں کی کتابیات مختصر ...ت کے ساتھ ترتیب دی جائے [4] تو اچھا خاصا کم از کم متوسط سائز کا ایک کتابچہ تیار

---

[1] ...پ بیتی، ص ۲۴۷، [2] ایضاً، ص ۲۵۴ [3] ایضاً ص ۲۵۵

[4] ...لانا دریابادی کی چھوٹی بڑی جملہ کتابوں کی تعداد چونسٹھ ہے۔

ہو جائے گا۔ ان تحریروں میں مولانا کی خاص علمی، ادبی اور صحافتی تحریروں، تالیفات
تصنیفات کے علاوہ ان کے خطبات، مضامین، خطوط، نشریات اور 'سچ'، 'صدق' اور
جدید' کے شذرات سبھی کچھ شامل ہیں۔ ان کے مطالعہ سے جہاں ایک طرف ان کے تبحر علمی
مطالعہ و مشاہدہ کی کثیر جہتی کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں دوسری طرف موضوع خواہ ادبی و
ہو، خواہ فلسفیانہ و تاریخی۔ اُن کی ہر قسم کی تحریروں میں، ہمیں ان کے منفرد اسلوب نگارش
کی تازہ کاری، معنی آفرینی، سادگی اور پرکاری کا یکساں تجربہ بھی ہوتا ہے۔

لکھنے لکھانے کے فن میں اصطلاحی و رسمی معنوں میں مولانا یوں تو بے استادے
لیکن ہمارے کلاسیکی لٹریچر کی خصوصیات کی جامعیت ہمیں جو ان کے یہاں نظر آتی ہے و
راستوں سے آئی ہوگی؟ 'آپ بیتی' میں چند سطروں میں اس سے متعلق کچھ اشارے مل جاتے ہیں
کسی ریسرچ اسکالر کے لیے ایک اچھا اور شاید اچھوتا موضوع تحقیق ہو سکتا ہے، لیکن ا
راستہ بالکل صاف اور واضح ہے اور خود مولانا نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے، اور وہ
مولانا شبلی کے تتبع کا، اس بات کا اظہار انھوں نے کئی جگہ مختلف انداز میں کیا ہے۔ 'آپ
میں لکھتے ہیں:

"۱۹۰۶ء تھا یا ۱۹۰۷ء کہ زیارت پہلے ماہنامہ 'الندوہ' کی ہوئی اور پھر اس
کے بعد ہی صاحب 'الندوہ'، مولانا شبلی کی۔ اور الندوہ نے دل و دماغ کو اتنا متاثر
کیا کہ اور سارے رسالے جریدے نظر سے گر گئے اور دل و جان سے شبلی کا کلمہ
پڑھنے لگا۔ مولانا شبلی کا علم و فضل۔ اسلوب زبان و طرز بیان سب دماغ پر چھا
گئے اور کہنا چاہیے کہ علمی و قلمی زندگی کا ایک نیا دور اسی وقت شروع ہو گیا۔"[لہ]

اور اپنے ایک مقالے میں یوں لکھتے ہیں:

"اس بے علمے کو جو کچھ بھی الٹا سیدھا لکھنا لکھانا آیا وہ بر، اسی آستانے کا
فیض ہے (یعنی آستانۂ شبلی کا)۔ پہلے تو انھیں حضرت کے مضمون اور کتابیں پڑھ پڑھ کر

لہ آپ بیتی، ص ۲۱۲-۲۱۱

اور ان کی نقالی میں کمال پیدا کر کے یہاں تک کہ اُن کی خاص خاص ترکیبیں اور لفظ از بر ہو گئے تھے۔ اور پھر اسی زندہ بساط کے ایک ادنیٰ حاشیہ نشیں بن کر یا[۵۱] ذکر شبلی مرحوم اور مولانا دریا بادی پر ان کے اثر کا آیا ہے۔ یہیں اُن کے اسلوب سے متعلق بھی مولانا کا معروضی جائزہ بھی سُن لیجیے:

"تصنیف و تالیف جب خود ایک مستقل فن ٹھہرا تو آرٹسٹ یا فن کار کے لیے لازم ہے کہ اسے ناظرین با تمکین کی طبیعت پر، جبلت پر، نفسیت پر پورا عبور حاصل ہو۔ عبارت دقیق ہو ثقیل نہ ہو، سادہ ہو پھیکی نہ ہو، سلیس ہو سپاٹ نہ ہو، سنجیدہ ہو خشک نہ ہو، عام فہم ہو عامیانہ نہ ہو، لطیف ہو رکیک نہ ہو، ٹھوس ہو ٹھس نہ ہو، فکر انگیز ہو بور کر دینے والی نہ ہو، پُر زور ہو مگر پر شور نہ ہو۔ شبلی اسلوب بیان کی ان باریکیوں کے اور لطافتوں اور نزاکتوں کے محرم راز تھے۔"[۵۲]

اب اس کے بعد شبلی اور ان کے معتقد و مقلد مولانا دریا بادی کے اسلوب بیان کا موازنہ کیجیے، دیکھیے کہ کتنی مماثلت ہے دونوں کے طرز نگارش میں اور بتائیے کہ کیا مذکورہ بالا اقتباس میں حدیث شبلی کے پردہ میں مولانا نے ایک لحاظ سے بہت کچھ، خود اپنے ہی طرز و اسلوب کی دلبری و دل ستانی کا ذکر نہیں کیا ہے؟

زبان اور لہجے کے سلسلہ میں کوئی شبہ نہیں کہ نوک پلک کا کچھ تھوڑا بہت سلیقہ مولانا نے مرزا ہادی رسوا سے سیکھا، لیکن مجموعی اعتبار سے اسلوب بیان اور تصنیفات میں تنوع اور رنگا رنگی میں ان کے اپنے وسیع اور متنوع مطالعے کے اثر کے ساتھ بڑی حد تک شبلی ہی کا فیض نظر آتا ہے۔

مہدی افادی کو بھی بحیثیت مصنف مولانا کی اسی خصوصیت نے مسرت زا حیرت میں ڈال دیا تھا۔ انھوں نے انھیں لکھا تھا کہ:

---

۵۱ و ۵۲۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی، "شبلی ۔ انسان، مصنف، مصنف گر"۔ (یہ مقالہ ۲۱ فروری ۱۹۶۵ء کو دارالمصنفین اعظم گڑھ، کی طلائی جُبلی کے موقع پر پڑھا گیا اور ۱۹ مارچ ۱۹۶۵ء کو پہلی بار صدق جدید میں چھپا

"معارف میں "توجیہہ کی ماہیتِ نفسی" دیکھی، بھئی سچ یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ شبلی کے ساتھ لٹریچر کا لطف گیا لیکن آپ کی نکتہ آرائیاں سب سے بڑی کمی کی تلافی ہی نہیں کرتیں بلکہ مجھے حیرت میں ڈال دیتی ہیں" (مکاتیب مہدی، ۳۱ جولائی ۱۹۱۹ء کا خط)

"تاریخ الاخلاق کی دوسری جلد ملی... کتاب ترجمہ کہیں سے معلوم نہیں ہوتی ... ایک مستقل لٹریچر ہے جو حکیمانہ استخراج نتائج کے ساتھ سلاست اور روانی بیان کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ کتنے لوگ میری اس رائے کو برداشت کر سکیں گے کہ شبلی کے بعد اس درجہ کا لٹریچر یاران باصفا، ماجد و باری کے سوا کسی اور کے بس کا نہیں" (مکاتیب مہدی، ۱۰ر جنوری ۱۹۲۰ء کا خط)

اکبر الہ آبادی پر انھوں نے خاصا لکھا، اکبر کی دانش آموز، حکمت آفریں شاعری کے وہ دل دادہ تھے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں دونوں بزرگوں کے تہذیبی اور معاشرتی خیالات میں یگانگت ہی کو دخل تھا۔ اس یگانگت کی جلوہ فرمائیاں تو بعد کی ہیں۔ ابتدائی مکاتبت کے وقت یعنی ۱۹۱۲ء میں مولانا فلسفی قسم کے دہری تھے، لیکن آٹھ نو برس کے تعلقات نیازمندی کے دوران انھوں نے اکبر سے "بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ لیا، اکبر کے کلام سے بھی اور اکبر کی ذات سے بھی"۔ [1]

مولانا عبدالماجد دریابادی کی طبیعت میں سخن فہمی کا جوہر تو فطری تھا، لیکن اس کی جلا ہوئی کلام اکبر اور مولانا شبلی کی ادبی مجلسوں سے۔

"شبلی اگر شعر کے ظاہر کے مبصر تھے اور اس کے ادبی حسن و صناعت کے، اس کے آرٹ کے پرکھنے والے... تو اکبر اس کے معنی کے مصور تھے، اس کے جمال معنوی کے روشن گر۔ اکبر کی زبان سے ان کے شعر سن کر پہلی بار یہ بات سمجھ میں آئی کہ شعر معنوی حیثیت سے کتنا بلند اور پر معرفت ہو سکتا ہے۔ ان دونوں باکمالوں کا فیض اگر نہ شامل ہو جاتا تو اپنا مذاق شعری خدا معلوم کتنا پست و ناقص رہ جاتا"۔ [2]

---

[1] مولانا دریابادی، "اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں"، ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۴ء، ص ۱۶۸

[2] آپ بیتی، ص ۳۲۱

سخن سنجی یا شعرگوئی تو مولانا کی کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھی، لیکن ان کی سخن فہمی کا بہت کچھ اندازہ ہم شاعروں اور اُن کے کلام پر اُن کے مضامین اور شرحوں سے اور ادیبوں کے رشحات قلم پر اُن کے تبصروں سے کر سکتے ہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ اُن کے حُسنِ انشا سے کہ بقول کسے وہ چھپے شاعر اور کھُلے انشا پرداز تھے۔ اُن کے مضامین و نشریے جاوید نامہ، ضرب کلیم پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، غالب کا فلسفہ، مرزا رسوا کے قصے، کچھ ادھر سے کچھ اُدھر سے، اردو کا واعظ شاعر، مرزا ثاقب، نیا آئین اکبری، "شکوہ" اور "جواب شکوہ" آدمی نامہ، "دلم در عاشقی آوارہ شد" اور مثنوی زہر عشق اور امراؤ جان ادا پر اُن کے خیالات و احساسات ہماری اس بات کے شاہد ہیں۔ ان مضامین اور اس طرح کے دوسرے مضامین اور تبصروں میں مولانا کے مطالعے، ذہانت، ذوق سلیم، قدرت بیان اور صحیح ادبی مزاج کی آمیزش سے ایک ایسی ادبی بصیرت کی جلوہ آرائی ہے جس کا ذکر پروفیسر احتشام حسین نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"ایک خاص طرح کی تنقیدی بصیرت جو تاثراتی اور شخصی ہوتے ہوئے بھی استدلالی رنگ رکھتی ہے۔ اپنی بات کہنے کے جوش میں حقائق کو نظر انداز نہیں کرتی اور جہاں تک ادب کا تعلق ہے، اس کے اخلاقی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے بھی تخلیق کے ادبی وجمالیاتی حُسن پر بھرپور نگاہ ڈالتی ہے۔"

مولانا کے اُسلوب کا یہ خاص رنگ بھی انھیں سے مخصوص ہے کہ وہ فارسی اور اردو کے اشعار اور مصرعوں کا استعمال ایسا برمحل کرتے ہیں کہ یہ استعمال سرتاسر آمد محسوس ہوتا ہے اور اس سے اگر ایک طرف اُن کی نثر میں گہری معنویت اور ایک خاص سرور و کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو دوسری طرف شعر یا مصرع خود افق نثر پر ایک تابندہ ستارے کی طرح جگمگا اٹھتا ہے۔ سفر حجاز اور حکیم الامت جیسی کتابوں میں بھی مولانا کے انشا کا یہ حسن اسی طرح سچ، صدق اور صدق جدید میں ان کے شذرات اور مضامین۔ مثالیں کہاں تک دی جائیں، لطف اس کا اسی وقت ہے جب مولانا کی تحریروں کے اس خاص ادبی پہلو سے دل چسپی رکھنے والے ارباب ذوق خود حُسن و معنی کے چمنستان کی سیر کریں۔ ہم یہاں

صرف چند مصرعے درج کرتے ہیں، اس سے ہماری اس بات کی تصدیق ہو جائے گی:

۱۔ کتنے ہیں سادہ و پُرکار یہ خوباں غالب

۲۔ تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے

۳۔ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

۴۔ عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزی افرنگ

۵۔ جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

۶۔ نہ نادر بجا ماند و نے نادری

۷۔ از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارد

۸۔ اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

۹۔ غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ

۱۰۔ شیشے مرے نصیب سے پتھر کے ہو گئے

۱۱۔ کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

اب 'صدق جدید' (۱۳ راگست ۱۹۶۵ء) کا شذرۂ اوّل بھی دیکھ لیجیے "یادِ ایام" کے عنوان کے تحت:

"دانت اپنے جوانی ہی کے زمانے سے گرنے شروع ہو گئے تھے۔ آخری دانت کو بھی گرے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا، البتہ اس کی ایک کرچ نیچے کے جبڑے میں بائیں طرف لگی رہ گئی تھی۔ اس ہفتے وہ بھی ختم ہو گئی۔ خزاں کی آخری پتی، شمع کی آخری بھڑک، زندگی کی آخری سانس، آخر کب تک غریب کی زندگی قائم رہتی!

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا — یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک"

مولانا دریابادی یوں تو ذوقِ خامہ فرسا کے ستم زدہ تھے، لیکن اس سلسلے میں خاص بات جو یاد رکھنے کی ہے اور جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ:

"تصنیف برائے تصنیف ... اپنا مقصد کبھی نہ رہا۔ ہر دور میں وہی

لکھا جو اپنے خیال و عقیدہ کے مطابق تھا، قلم سے وہی ٹپکا، وہی چھلکا جو دل و دماغ کے اندر موجود تھا، جب الحاد کی شامت سوار تھی تو رنگِ تحریر ملحدانہ تھا جب اسلام کی حلقہ بگوشی از سرِ نو نصیب ہوئی تو وہی رنگ تحریر کا بھی ہوگیا۔ کام اُجرت پر کیا، رائلٹی لی، حق تالیف یک مشت فروخت کیا، لیکن اللہ نے ہر صورت میں مخالفتِ ضمیر کی بھٹی میں گرنے سے محفوظ رکھا۔"[1]

۱۹۲۰ء کے بعد جب کہ مولانا کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ ان کی مطبوعہ تحریروں کی تعداد و مقدار اچھی خاصی ہے۔ لیکن جن کتابوں کو ہم مستقل تصنیف یا تالیف کہہ سکتے ہیں؛ ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

"پیام امن"، "تصوفِ اسلام"، "فیہ مافیہ"، "سفر حجاز"، "محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق"، "خطوط مشاہیر"، "مکتوباتِ سلیمانی"، "حکیم الامت"، "ترجمہ و تفسیر ماجدی"، (انگریزی اور اردو) "حیوانات قرآنی"، "جغرافیہ قرآنی"، "قرآنی شخصیات"، "خطبات ماجدی"، "بشریت انبیاء"، "اور آپ بیتی"، ——— "انشائے ماجد"، "نشریات ماجد"، "قصص و مسائل" وغیرہ قسم کی چیزیں متفرقات کا مجموعہ ہیں۔ "سچ"، "صدق"، اور "صدق جدید" کے شذرات، وفیات اور مکتوبات اپنی الگ نوعیت رکھتے ہیں۔"

علم و دانش کے یہ نقش مولانا کی علمی و ادبی جامعیت کے شاہد ہیں۔ اب ان کے مطالب میں اگر کچھ "حرف مکرر" کی قسم کی چیزیں بھی ہیں، اور یقیناً ہوں گی، تو بھی زمانہ ان کو نہیں مٹا سکتا کہ ان میں مولانا کے قلم کی انفرادیت سے ایک نیا اور تازہ کار رنگ پیدا ہوگیا ہے۔

مکتوبات جو مولانا کے نام ہیں، ان کے حاشیوں نے اُن کی قدر و قیمت بڑھادی ہے اور ان کی معنویت (Relevance) کو واضح کردیا ہے اور جو مکتوبات دوسروں کے نام مولانا کے ہیں، ان کی ادبیت کی شان نرالی اور ان کی ادبی افادیت مسلم ہے، مثلاً اور بطور نمونہ ۱۷ر جولائی ۱۹۵۳ء کو سید آل عبا صاحب مارہروی آوارہ کو لکھتے ہیں:

---

[1] آپ بیتی، ص ۲۸۲

"آوارگی" کے پردے میں یہ "ردائے آلِ عبا" خوب چمکی، سبحان اللہ!

ہماری کم نگاہی تم کہاں تھے ہم کہاں سمجھے

دل نے کہا "فرقہ ملامتیہ" ابھی زندہ ہے۔"[1]

مرحوم مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی نے مولانا کو اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا تو انھوں نے ۵ ر ستمبر ۱۹۵۶ء کو انھیں لکھا:

"دوشنبہ کی صبح کا وقت تو شہید صاحب[2] کے لیے بُک ہو چکا تھا، اُن کی منظوری سے بہ آسانی اپنے ہاں منتقل کرا سکتے ہیں۔ لا نفرق بین احد منکم۔ مولانا علی میاں صاحب اور حیات اللہ انصاری کا اجتماع پُر لطف رہا۔ دین و دنیا ایک ہی دسترخوان پر۔ ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ کی عملی تفسیر"[3]

"سفرِ حجاز" پر دیباچہ مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے، جس میں سید صاحبؒ نے ہمارے مولانا کو "صاحبِ دل اور درد آشنا دوست" لکھا ہے۔ ایک صاحبِ دل اہلِ قلم کی تصدیق ایک دوسرے اہلِ قلم کی فقر و درویشی اور درد آشنائی کی۔ اس لیے مناسب ہے کہ سید صاحب مرحوم و مغفور کی رائے اس سفرنامے سے متعلق انھیں کے الفاظ میں یہاں پیش کر دی جائے وہ لکھتے ہیں:

"سفرنامہ کے مختلف ابواب اور مباحث میں اس کا مصنف کہیں مورخ ہے، کہیں فقیہہ، کہیں محدث، کہیں صوفی، کہیں شاعر، کہیں سیاسی، ۔۔۔۔"

"ولیکن اس سفرنامہ کی اصلی حیثیت اور حقیقی عزت میری نگاہ میں دو باتوں سے ہے، ایک اس کی انشاپردازی کہ مصنف کے قلم نے اس میں انتہائی سادگی

---

[1] مکتوبات ماجدی، ادارہ انشائے ماجدی، کلکتہ، ۱۹۸۲ء، ص ۹
[2] مکتوب الیہ کے چچا مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری فرنگی محلی (مرحوم)
[3] مکتوبات ماجدی، ص ۲۲

کا کمالِ حسن دکھایا ہے۔ سہل الفاظ، سادہ ترکیبیں اور پھر شاعرانہ تخئیل' اس لیے انشار کی حیثیت سے اس کی کیفیت بہت کافی ہے، دوسری چیز وہ تاثرات اور وجدانیات ہیں، جو اس کتاب کے فقرہ فقرہ سے نمایاں ہیں ... میں سفر حجاز کی یہ بھی برکت سمجھتا ہوں کہ ان کے قلم نے ان کے دل کی ایسی ترجمانی کی ہے اور روح نے جسم کا ایسا قالب اختیار کیا ہے کہ باطن ظاہر، محجوب منکشف اور نادیدہ دیدنی ہو گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ فاضل مصنف کی تصنیفات میں ان کے قلم کی یہ سرسری تحریر ہی سب سے زیادہ دیرپا، سب سے زیادہ سودمند اور سب سے زیادہ مقبول ہوں گی"۔[۵۲]

'تصوف اسلام' اور 'فیہ مافیہ' اُس عہد کے مطالعے کا نتیجہ ہیں جب وہ اسلام کی طرف لوٹ رہے تھے اور تصوف کی کتابیں پڑھ رہے تھے، جب مطالعوں اور تلاش و جستجو کے ہچکولوں کے بعد کشتیِ حیات ایمان کے ساحل سے آ لگی تو فکر ہوئی کہ کسی تالیف میں تصوف کے اسلامی عناصر کو یکجا کر دیا جائے، 'تصوف اسلام' اسی کاوش کا نتیجہ ہے اور 'فیہ مافیہ' کی ترتیب و تہذیب بھی اسی سلسلے کی کڑی، لیکن اپنے اس آخرالذکر کام سے مولانا مطمئن نہ تھے۔ 'تصوف اسلام' البتہ خوب مقبول ہوئی اور تھی بھی ۲۴-۱۹۲۳ء میں اس موضوع پر اُردو والوں کے لیے ایک نادر تحفہ۔

'حکیم الامت، نقوش و تاثرات' فقہ و تفسیر اور سلوک و تصوف کے موضوع پر ایک بالکل دوسرے طرز کی کتاب ہے۔ "یہ مجموعۂ اوراق" اگرچہ بقول مؤلفِ علام "نہ کتاب المناقب ہے، نہ ملفوظات مرشد اور نہ سیرۃ الشیخ" لیکن اسے ذاتی تجربات و مشاہدات اور نجی مراسلت و مکاتبت کے وسیلے سے، جو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے ان کی عمر کے آخری ۱۵-۱۶ سال کے زمانے میں مولانا دریابادی کے نیازمندانہ اور مسترشدانہ تعلقات

---

[۵۱] پہلے تاثرات و مشاہدات اخبار 'سچ' میں مضامین کی شکل میں شائع ہوئے تھے۔

[۵۲] مولانا عبدالماجد دریابادی، 'سفر حجاز'، طبع اوّل لکھنؤ، ص ۹

سے متعلق ہیں۔ انھوں نے مناقب و ملفوظات و سیرت شیخ ہی کی قسم کی ایک یادگار تالیف بنا
بنا دیا ہے۔ اس مضمون میں ہم اس کے مطالب و معانی اور ابواب و مباحث سے متعلق کوئی
گفتگو نہیں کریں گے کہ اس کا یہاں کوئی موقع نہیں، کتاب علم و ادب اور حکمت و موعظت کا
ایک خوبصورت اور نرالا مرقع ہے۔ یہاں ہم صرف اتنا کہیں گے کہ 'حکیم الامت' میں اگر ایک
طرف ہمیں مولانا دریابادی کی انشا پردازی کے اچھے نمونے ملتے ہیں تو دوسری طرف مولانا
اشرف علی تھانویؒ کے ذوق ادبی و شعری کی خوبصورت مثالیں[1] بھی ——— ذیل میں ایک ایک
مثال ہر دو بزرگ کی تحریر سے دی جا رہی ہے جن سے ہماری یہ بات واضح ہو جائے گی۔

حضرت تھانویؒ، مولانا دریابادی کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اصل یہ ہے کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است، اور ہر گل اپنی جگہ محبوب ہے اور اس کی خوشبو بھی اپنی جگہ مرغوب،

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خندان است   بہ عندلیب چہ فرمودۂ کہ نالان است

حضرت مخدوم صاحبؒ (علاء الدین صابر کلیریؒ) پر سکر غالب تھا، اور اُن کے لیے یہی مناسب تھا، اور سکر کے یہی آثار ہیں جو ان کے نقد وقت تھے۔ اور حضرت سلطان الاولیاءؒ پر صحو غالب تھا اور ان کے لیے یہی مناسب تھا، اور صحو کے لیے یہی آثار ہیں جو ان کے نصیب حال تھے۔"[2]

حکیم الامت کے صفحات ۴۵-۴۴ پر حضرت تھانویؒ کے ایک معذرت نامہ کے اقتباسات درج ہیں، اس سے متاثر ہو کر ہمارا مصنف رقمطراز ہے:

"عبدیت کا مرتبہ اور انابت کا جو درجہ ہے، کون سا حال اور کون سا مقام

---

[1] حضرت تھانویؒ کو فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے، حافظ و مولانا روم کے بیشتر اشعار نوک زبان تھے اور نظم کا سلیقہ اور ملکہ بھی تھا۔ کلید مثنوی، رومی کی مثنوی کی بھی شرح ہے۔

[2] مولانا عبدالماجد دریابادی، 'حکیم الامت' نقوش و تاثرات، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۵۲ء، صفحہ ۳۴۔

اسے پا سکا ہے؟ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا کی آہ وزاری نے ابوالبشرؑ کے جو مرتبے بڑھائے کس بشر کی مجال ہے کہ انھیں بھلائے؟ بڑی سے بڑی ریاضتیں، بڑے سے بڑے مجاہدے بھی اس ایک شکستگی، اس ایک افتادگی اس ایک بے چارگی کے مقابلے پر لائے جا سکتے ہیں؟

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں ۔۔۔ پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی[1]

اب آخر میں کچھ تفسیر ماجدی سے متعلق جو مولانا دریابادی کی دینی، علمی اور ادبی زندگی کا سب سے بڑا تصنیفی وتالیفی کارنامہ ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ عوام وخواص سبھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ وہ علمائے راسخین بھی جنھیں 'ترجمان القرآن' اور 'تفہیم القرآن' کی کئی تصریحات سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ ایک سند ہے اس کے استناد اور مقبولیت کی۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ اس میں تفسیر کے روایتی تسلسل کو باقی رکھتے ہوئے جدید ذوق تحقیق کی تشفی کا پورا سامان موجود ہے۔ قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر میں قدیم وجدید کا ایسا خوشگوار امتزاج جو دونوں طرز کے حلقوں میں پسندیدہ ہو، اپنی جگہ خود ایک مہتم بالشان کارنامہ ہے۔ اس کے افتتاحی کلمات میں قرآن کی آفاقیت ومقامیت کی جامعیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعے سے متعلق بڑے بلیغ نکات ملتے ہیں۔ اس کی تفسیری توضیحات مستند، معلومات افزا اور فکر انگیز ہیں، اس کام کے لیے مولانا کو جس قدر وسیع مطالعہ کرنا پڑا 'آپ بیتی' میں اس کا کچھ ذکر ملتا ہے لیکن اس مضمون کا محل یہ نہیں کہ یہاں تفسیر ماجدی پر زیادہ تفصیل سے لکھا جائے، البتہ علم و تحقیق کے ساتھ اس میں مولانا کے ادب وانشا نے جو ایک ایمان پرور حُسن پیدا کر دیا ہے وہ انھیں کے زرنگار قلم سے پیدا ہو سکتا تھا۔ مثالیں اس بات کی بہت ملیں گی، لیکن ہم بس ایک پر اکتفا کرتے ہیں جس میں، اگر غور کیجیے تو فلسفہ کی دقت نظری ادب کی دلآویزی سے گلے ملتی نظر آتی ہے اور مابعد الطبیعی 'طبیعی سطح پر' اس سطح کی تمام تحدیدات کے ساتھ کیسی نورانیت سے نازل ہو رہا ہے، سورۃ الدخان کی شروع کی ان دو آیتوں۔ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝

---

[1] حکیم الامت، بحوالۂ سابق ص ۷۴

إِنَّا أَنزَلْنَٰهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَٰرَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ ۔ کی تشریح و تفسیر ہمارے مفسر نے کیسے سہل مگر دل نشیں تمہیدی کلمات کے ساتھ "رحمت کی رات" کے عنوان سے کی ہے، لکھتے ہیں:

"جان جب جسم کے پردہ میں ظاہر ہونے لگتی ہے، بے صورتی جب صورت پکڑنے لگتی ہے، اطلاق جب تعین قبول کرنے لگتا ہے تو لازمی ہے کہ وہ اپنے لیے بھی وہ تمام قیود و خواص اختیار کرے جو جسم، صورت اور تعین مادی کے لیے ضروری ہے۔ عالم جسم اور کائنات مادہ میں دو بڑے دروازے زمان و مکان ہیں۔ لطیف سی لطیف نورانیت بھی جب سطح زمین پر نازل ہوگی تو انھیں دروازوں میں ہو کر داخل ہوگی۔ برکت و رحمت جیسی لطافتیں بھی (جو بار الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں) کرۂ خاکی کو جب اور جہاں سرفراز کریں گی، وقت اور جگہ، زمان و مکان کی قید اور پابندی کے ساتھ ہی کریں گی۔"

پروفیسر احتشام حسین نے جنھیں مولانا دریابادی نے غالباً حالی کے بعد اردو ادب کا دوسرا ممتاز نقاد کہا تھا، اُن کی تحریروں کے گوناگوں موضوعات کو نظر میں رکھ کر ان کی زندگی کے تصنیفی اور ادبی پہلو سے متعلق یہ جو کہا تھا، تو کتنا سچ کہا تھا کہ:

"اردو میں شاذ و نادر ہی ایسے ادیب ہوں گے جن کے یہاں قرآن و حدیث، تصوف و اخلاق، فلسفہ و نفسیات، سوانح و سیرت، سفرنامہ اور ڈائری، سیاسی موضوعات اور سماجی مسائل، شاعری اور تخلیقی نثر، افراد و تحریکات کے متعلق بے تکلفی اور ادبی لطافت کے ساتھ اظہارِ خیال میں تازگی، لطف زبان، نشتریت اور بلاغت بھی ہو۔ یہ ساری خوبیاں مولانا عبدالماجد کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ دوسرے علمی کاموں سے قطع نظر مولانا دریابادی اپنے ادبی اسلوب کی وجہ سے بھی زندہ رہیں گے۔"

جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر اپنا یہ ایک احساس بھی بیان کر دوں کہ مولانا مرحوم کی زندگی کے علمی و ادبی پہلو کی ایک خصوصیت اُن کی قدرے انتہا پسندی بھی تھی۔ ایمان و اسلام

سے انحراف کا زمانہ ہو یا ایمان و اسلام کی طرف بازگشت کے بعد کا دور ہمیں ان کے یہاں نتہا پسندی کی مثالیں ملتی ہیں۔

مولانا نے ۲۰-۱۹۱۹ء میں بقول اُن کے از سرِ نو اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے بعد کی اُن کی بعض تحریروں میں، خاص طور پر سچ، صدق اور صدق جدید کے شذرات اور مضامین میں ہمیں کبھی کبھی ایک پُرخروش جوشِ ایمانی ملتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے مذہبی جوش کا وفور معتدل ادبی اسلوب کی حد سے باہر نکلتا محسوس ہوتا ہے۔ اسی میں ان کا وہ ذوقِ احتساب بھی شامل ہے جس کے ناوک نے گنہگاروں کے ساتھ نہ معلوم کتنے بے گناہوں کو بھی گھائل کیا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ سے زیادہ اور کون اُن کی طبیعت کے اس پہلو کا آشنا ہو سکتا تھا، جبھی تو انھوں نے 'سفرِ حجاز' کے دیباچے میں ایک محتاط انداز میں قلم بند فرمایا تھا:

"ہمارے فاضل، فلسفی اور لائق انشا پرداز دوست کا مذہبی رنگ روز بروز پختہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ کہیں کہیں صوفیانہ رواداری اور صلح کل کی وسیع شاہراہ سے نکل کر فقیہانہ تشدد کے تنگ کوچے میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ کیا عجیب بات ہے کہ ایک پُرانی تعلیم گاہ کا مولوی دوست نئی تعلیم گاہ کے گریجویٹ دوست کی حد سے زیادہ مولویت کی شکایت کر رہا ہے۔ وتلك الایام نداولها بین الناس۔"[1]

مذہبی رنگ کی پختگی کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ اس پختگی کے حامل میں فقیہانہ تشدد بھی ہو۔ مذہبیت کی گہری اور سچی پختگی کی ایک بڑی اچھی مثال ہمیں خود مولانا کے ترجمہ و تفسیر قرآن میں ملتی ہے۔ 'تفسیر ماجدی' مولانا کا بہت بڑا کارنامہ ہے، ساری زندگی کا حاصل، علمی و ادبی دنیا میں مدت العمر کی راہ پیمائی کا بالین آسائش، یعنی یہ کہ خاتمہ بالخیر۔ شبلی کا خاتمہ بالخیر سیرتِ نبویؐ کی تصنیف پر ہوا تھا اور دبستانِ شبلی کے ایک ادیب شہیر کا خاتمہ بالخیر کلامِ الٰہی کے ترجمہ و تفسیر پر، کیسی نصیب وری کا حامل ہے یہ حُسنِ تقدیر!

---

[1] سفرِ حجاز، بحوالۂ سابق، ص ۱۰

ڈاکٹر محمد اقتدار حسین فاروقی

مولانا عبدالماجد دریابادی کی تصانیف میں

سائنسی اندازِ فکر

میں جناب یونس نگرامی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے مولانا عبدالماجد دریابادی کی ادبی، صحافتی اور دینی خدمات کے سلسلے کے اس سیمنار میں مقالہ پیش کرنے کے لیے مدعو فرمایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دعوت نامہ بھیجتے وقت ڈاکٹر نگرامی اور دیگر عہدیدارانِ اکادمی کے ذہن میں یہ بات ضرور رہی ہوگی کہ میں سائنس کا ایک طالب علم یا یوں کہہ لیجیے کہ ایک ناچیز سائنس داں ہونے کے ناطے مولانا ماجد کی ان ادبی خدمات سے یقیناً واقف ہوں گا جن میں ان کی سائنسی فکر کی جھلک ملتی ہے اور اپنے مقالہ میں اسی اندازِ فکر پر روشنی ڈالنے کی سعی کر سکوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی کرتے ہوئے اس وقت میں مولانا کی ان تحریروں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور شاید ثابت بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ایسے ذہن کے مالک تھے جس میں سائنسی رجحان بدرجۂ اتم موجود تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز اور وسط کے درمیان ہندستان میں جو ثقافتی، سیاسی اور ادبی انقلاب برپا ہوا اس سے ہر ذی شعور انسان بخوبی واقف ہے، اسی انقلابی دور میں نہ جانے کتنے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور عالموں نے اردو زبان کو وہ سرمایہ عطا کیا جس کے بل پر پچھلی چند دہائیوں کے ناموافق حالات کے باوجود یہ اپنی تمام تر رعنائیوں اور خوبیوں کے ساتھ زندہ بھی رہی اور MATURITY بھی

تی رہی۔ انقلابی دور کے ان محسنوں کی تعداد کا اندازہ لگانا یا ان کی فہرست مرتب کرنا نہایت دشوار طلب کام ہے جنھوں نے شاعر یا ادیب، نقاد یا محقق، صحافی یا عالم کی حیثیت سے زبانِ اردو کو مالا مال کیا ہے۔ لیکن ایسی شخصیتوں کا شمار بہر حال ممکن ہے جنھوں نے بیک وقت ادب، صحافت اور دینی علوم میں ناقابل فراموش CONTRIBUTION سے ملک و قوم کو نوازا ہے۔ ان ہستیوں میں ایک نہایت مستند نام جناب مولانا عبدالماجد دریا بادی کا ہے جنھوں نے ایک طویل عرصہ تک قلم کا جادو جگایا اور ایسی محققانہ تحریریں سپردِ قلم کیں جو آج اردو زبان کی اہم تصانیف تصور کی جاتی ہیں اور جن سے آنے والی نسلیں ہمیشہ مستفید ہوتی رہیں گی۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی کی طرح متعدد موضوعات پر بیک وقت قدرت اور عبور رکھنے والی شخصیتیں ہمارے ملک میں یقیناً اور بھی ہوئی ہیں لیکن ان سب میں جو بات مولانا کو دوسرے حضرات سے نمایاں اور شاید ممتاز رکھتی ہے وہ ہے ان کا سائنسی اندازِ فکر۔ دینی تصانیف ہوں یا صحافتی مضامین، مولانا نے اپنا سائنٹیفک اندازِ تحریر ہر جگہ قائم رکھا ہے۔ کسی بھی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے وقت وہ سائنسی دلائل کو کبھی فراموش نہیں کرتے تھے، وہ آنکھیں کھول کر زمین، فلک، فضا اور ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھتے تھے اور آئینۂ ایام میں انسان کی ادا اور حقیقت کو سمجھنے اور پرکھنے کے قائل تھے۔ آنکھیں موند کر کسی بات کا یقین کر لینا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ مولانا کے اس سائنسی طرزِ فکر کے ثبوت میں یوں تو ان کی تصانیف کے بہت سے حوالے فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں آپ کے سامنے ان کے سائنسی نظریات اور احساسات کی صرف وہ مثالیں پیش کروں گا جو ان کی تصنیف 'حیوانات فی القرآن' میں ملتی ہیں یا پھر نباتات کے ضمن میں ان کی وہ تشریحات و توضیحات بیان کروں گا جو انھوں نے اپنی مشہورِ زمانہ تفسیر القرآن (تفسیر ماجدی) میں تحریر فرمائی ہیں۔ میں نباتات سے متعلق ان کے خیالات پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا کیونکہ نباتاتی کیمیا اور نباتاتی سائنس میرا شوق بھی ہے اور موضوع و مشغلہ بھی۔ ویسے بھی اس ایک مقالہ میں

مولانا کی ساری تصنیفات کا احاطہ کرنا اس ناچیز کے بس کی بات نہیں ہے۔

"حیوانات فی القرآن" کے تصنیف کیے جانے کی وجہ مولانا نے کتاب کے دیبا[چہ] میں یہ بتائی ہے:

"خیال آیا کہ قرآن پاک کی کچھ اور بھی خدمت علمی رنگ میں کیجیے اور ایسے طور پر کہ جو زمانہ کے بھی مزاج کے موافق ہو۔"

اس کے بعد اسی دیباچہ میں مولانا رقم طراز ہیں:

"قرآن مجید اصلاً ایک کتاب ہدایت اور دستور العمل ہے لیکن ضمناً بہت سے علمی مسائل پر بھی اس سے روشنی پڑتی ہے اور عربی زبان و ادب کے علاوہ علوم و فنون کے بھی کتنے ہی عنوانات اس سے منور ہو جاتے ہیں۔"

مولانا کے یہ ارشادات قرآنِ حکیم کے مکمل دین کے دستور العمل ہونے کے بھرپور سائنسی علم ہونے کا اشارہ بھی دیتے ہیں۔ اس سائنسی علم کو حاصل کرنا یا اس تک پہنچنا میرے خیال میں زمانے کی ایک اشد ضرورت ہے۔ اس ضرورت کی بابت خود مولانا اپنے نظریہ کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

"متقدمین قرآن مجید کی جیسی گراں بہا خدمات کر گئے، یہ انھیں کا حصہ تھا۔ ان کی تحقیق و جانفشانی کی پوری قدر نہ کرنا اپنی ناشکر گزاری بلکہ کم ظرفی کا ثبوت دینا ہے۔ ان کے نقوش قدم ہماری راہ نمائی کے لیے نہ موجود ہوتے تو شاید ہم لوگ چند قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ تاہم دوسری طرف یہ سمجھنا کہ سارے کام ختم ہو گئے اور اب کسی جدید خدمت کی گنجائش ہی نہ رہی بجائے خود بڑی زیادتی بلکہ ظلم ہے۔ نئی نئی خدمات کا سلسلہ ان شاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔"

خوش عقیدگی، صدق دلی، سنجیدگی، دیانت داری اور ایمانی جذبے سے لبریز ۱۹۵۲ء میں تحریر کیے گئے مولانا کے یہ الفاظ ماضی میں نہ جانے کتنے تحقیق کرنے والوں کے لیے تقویت کا باعث ہوئے ہوں گے اور مستقبل میں بہتوں کو راہ دکھلائیں گے۔

مولانا نے 'حیوانات فی القرآن' میں ان سارے چرندوں اور پرندوں کا ذکر

بیانی، علمی اور سائنسی انداز سے کیا ہے جن کے حوالے قرآنی آیات میں ملتے ہیں۔
اونٹ، گھوڑا، ہاتھی، شیر، بھیڑیا، کوّا، بکری، گائے، مینڈک، شہد کی مکھی،
بیر، خچر، کتا، ٹڈی اور ہُدہُد وغیرہ پر نہایت دلچسپ اور ادبی مضامین کتاب میں
موجود ہیں اور ان میں بقول مولانا وہ معلومات بھی شامل ہیں جو ان کو سائنس اور عصری
علوم کی بعض کتابوں میں مل سکیں۔ ان معلومات میں جانوروں کی طبعی عمریں، اقسام،
علامات، خصلتیں، معاشی و غذائی استعمال اور پائے جانے والے ملکوں کی تفصیل
شامل ہے۔

سورۂ نمل کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے، جس میں حضرت سلیمان کے دربار
میں ملکۂ سبا کی حاضری کا ذکر ہے، مولانا نے لکھا ہے:

"ہُدہُد کی زبردست قوتِ پرواز کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کا ملک شام
سے اُڑ کر ملکِ یمن تک جانا کوئی ایسا مستبعد واقعہ نہیں ہے۔"

جیسا میں نے اس سے قبل عرض کیا ہے کہ نباتات کے ضمن میں تفسیر القرآن میں
دیے گئے مولانا کے نظریات میرے لیے نسبتاً زیادہ دلچسپی اور اہمیت کے حامل
ہیں کیونکہ میں نے قرآنی نباتات پر ایسی تحقیق کے سلسلہ میں ان سے استفادہ کیا ہے
اور جس طرح موصوف نے متقدمین کی گراں بہا خدمات کو سراہا ہے اسی طرح مجھے خود
بھی ان کی خدمات کا اعتراف ہے جو انھوں نے نباتاتِ قرآن کے ضمن میں انجام
دی ہیں۔ ان خدمات نے مجھے راہ بھی سجھائی ہے اور تحقیق کے لیے ہمت بھی
بڑھائی ہے۔

نباتات سے متعلق مولانا کے نظریات کی کچھ مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا
ہوں۔ سب سے پہلے منّ و سلویٰ کی بابت مولانا کے خیالات اور ارشادات کو ملاحظہ
فرمائیے۔ "منّ" کا ذکر "سلویٰ" یعنی بٹیر کے ساتھ قرآن پاک میں تین مرتبہ کیا گیا
ہے۔ مذکورہ آیات اور مولانا کے دیے ہوئے تراجم اس طرح ہیں۔

نمبر ایک۔ سورۃ البقر۔ آیت نمبر ۵۶:

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ط كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○

ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا، منّ وسلویٰ کی غذا تمہارے لیے فراہم کی اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انھیں کھاؤ مگر تمہارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ ہم پر ظلم نہ تھا بلکہ انھوں نے اپنے آپ پر ہی ظلم کیا۔

نمبر ۲۔ سورۂ اعراف۔ آیت نمبر ۱۶۰ :

وَقَطَّعْنَاهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا ط وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُ أَنِ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ ج فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ط قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَشْرَبَهُمْ ط وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ط كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ط وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○

اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل گروہوں کی شکل دے دی اور جب موسیٰؑ سے ان کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر لاٹھی مارو۔ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی۔ ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر منّ وسلویٰ اتارا۔ کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تمہیں بخشی ہیں مگر اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا وہ ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرتے رہے۔

حوالہ نمبر تین۔ سورۂ طٰہٰ آیت نمبر ۸۱ :

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ قَدْ أَنْجَيْنَاكُمْ مِنْ عَدُوِّكُمْ وَوَاعَدْنَاكُمْ جَانِبَ الطُّورِ الْأَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ.

اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور طور کی بائیں جانب تمہاری حاضری کے لیے وقت مقرر کیا اور تم پر منّ وسلویٰ اتارا۔

مَنّ کی ان تینوں آیات کی تفسیر فرماتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں :

" اَنزَلَ یعنی اُتارا سے مراد لازمی طور پر یہ نہیں ہوتی کہ وہ چیز کسی غیر طبعی معجزانہ طریقہ پر اُتری ہو۔ پانی، لوہا، کھانے کے سامان وغیرہ کے لیے۔ جو اپنے معمولی اور طبعی طریقوں پر انسان کے کام کے لیے پیدا ہوتے ہیں ان سب کے لیے قرآن مجید میں اتارنے ہی کا لفظ آیا ہے۔ مَنّ اہلِ لغت کی تحقیق میں ایک میٹھی رطوبت تھی ۔ معنی اس کے متعدد بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن اکثر کا خیال ہے کہ یہ ترنجبین کے مُرادف ہے۔ اہلِ تفسیر نے عموماً ابر کی سایہ افگنی، مَنّ و سلویٰ کے نزول اور چٹان سے چشمہ کی روانی کو معجزات میں شمار کیا ہے۔ لیکن اگر کسی کی تحقیق میں یہ سب امور عام واقعاتِ طبعیہ میں داخل ہوں اور ان کی توجیہ عام اور معمولی قوانین تکوینی کے ماتحت ہو جائے یا آج کل کی اصطلاح میں ان کے سائنسی اسباب دریافت ہو جائیں تو اس کا اثر ارشاداتِ قرآنی پر مطلق نہیں پڑے گا۔ ان کی اتفاقی اور احسانی حیثیت بہرحال برقرار رہتی ہے اور اسی کی تذکیر قرآن کا مقصود ہے۔"

اب آپ غور فرمائیں کہ " منّ " کی بابت یہ تفسیر مولانا عبدالماجد دریابادی کی وسیع النظری، علمی لیاقت اور سائنسی فکر کا کتنا مکمّل ثبوت ہے۔ " من " کی سلسلے میں جو تذکرے توریت کے باب خروج اور باب گنتی میں ملتے ہیں ان پر محققین نے بڑی ذرائے زنی کی ہے۔ اَن گنت مضامین میں اس موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ سوالات و جوابات کا ایک سلسلہ لامتناہی ہے جو ان مضامین میں ملتا ہے۔ دس سے بیس لاکھ اسرائیلیوں کے لیے متواتر چالیس سال تک سینا کے لق و دق جنگل و بیاباں و ریگستان میں منّ کی فراہمی کیوں کر ہوئی اس پر بہت ساری قیاس آرائیاں ہوئی ہیں۔ بعض محققین نے کہا کہ اتنے سارے لوگوں کے لیے کم از کم دو ہزار ٹن وزن کے برابر روزانہ منّ کی ضرورت پڑتی ہوگی۔ لیکن کیا سینا میں اتنا منّ پیدا کرنے والے پودوں کا ہونا ممکن تھا۔ غرضیکہ اس مسئلہ پر کسی حد تک بے مقصد بحثوں میں عجیب و غریب تاویلیں پیش کی گئی ہیں۔ لیکن

مولانا ماجد کا سائنٹیفک ذہن ان بحثوں کو بے معنی تصور کرتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ من وسلویٰ کی غذا بنی اسرائیل کو میسّر تھی لیکن بقول ان کے "یہ کسی اور غذا کی نفی کو مستلزم نہیں"۔ گویا کہ وہ لوگ ان جانوروں کا گوشت بھی کھاتے رہے ہوں گے جو ان کے ساتھ تھے اور وہ جنگلی غذائیں بھی جو راستے میں کہیں بھی دستیاب ہوتی رہی ہوں گی۔ ہاں صرف وہ غذائیں ان کو نہ مل سکتی تھیں جن کو حاصل کرنے کے لیے کسی ایک جگہ طویل عرصہ تک رُک کر کھیتی کرنی ہوتی اور اس طرح منزل مقصود تک پہنچنے میں اس قافلہ کو تاخیر ہوتی اور اسی لیے مسور، پیاز، لہسن، ککڑی اور دیگر ترکاریوں کی خواہش کو حضرت موسیٰؑ نے ناپسند فرمایا۔ مولانا کی اس سائنسی دلیل اور وضاحت کے بعد من وسلویٰ کے سلسلہ میں کسی بحث میں پڑنا "بحث برائے بحث" تو ہو سکتا ہے "بحث برائے علم ہرگز نہیں۔

منّ کے علاوہ دوسری نباتات اور نباتاتی اشیاء پر بھی نہایت علمی تحقیقی اور سائنسی بیانات آپ کو مولانا کی تفسیر القرآن میں مل جائیں گے۔ مثلاً سورۂ "التین" کی پہلی چار آیات کی تفسیر فرماتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ:

> "ہو سکتا ہے کہ تین (یعنی انجیر)، زیتون، بلد الامین (یعنی مکہ معظمہ) اور طور سینین کا اشارہ چار شریعتوں کی طرف ہو لیکن اصل میں اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہے کہ نظام عام تکوینی کی فکر و اہتمام یا ان چاروں نظامات تشریعی کی حفاظت و انتظام کی ذمہ داری خود اس کی دلیل ہے کہ انسان کی آفرینش یوں ہی اٹکل پچو نہیں کردی گئی ہے بلکہ یہ انتہائی حکمتوں اور صناعیوں کا مجموعہ ہے۔"

غالباً آپ میرے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ انسان کی پیدائش کی بات جس انداز میں قرآن پاک میں کہی گئی ہے یعنی "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" اس کی یہ تفسیر مولانا کی ادبی و سائنسی طرز تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

سورۂ "النجم" اور سورۂ "النور" کی تفسیر بیان فرماتے ہوئے مولانا ماجد سدرۃ المنتہیٰ کو ایک ایسے نقطۂ انصال سے تعبیر کرتے ہیں کہ جہاں سے ملائکہ،

عالم بالا کے احکام زمین پر لاتے ہیں اور یہاں کے اعمال صعود وہاں تک پہنچاتے ہیں اور اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہ دنیا کے نباتات سمیت بہت سی چیزوں کا جنت ہونا مسلّم ہے وہ ان تفسیر نگاروں سے اختلاف نہیں کرتے ہیں جن کی رائے میں "سدرہ" سے مراد بیری نہیں ہے بلکہ "ایک اور عمدہ درخت"۔ سدرہ کی اصل نباتاتی پہچان میں مجھے مولانا کے ان ارشادات سے بڑی مدد ملی ہے۔

سورۂ "الصّٰفّٰت" کی اُن آیات کی تفسیر بیان فرماتے ہوئے جس میں یقطین یعنی 'کدو کی بیل' کا ذکر ہے مولانا رقم طراز ہیں:

> "حضرت یونسؑ کی کشتی کو طغیانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ملاحوں نے مجرم کے تعین کے لیے قرعہ اندازی پر اتفاق کیا اور قرعہ میں نام حضرت یونسؑ کا نکلا اور ملاحوں نے آپ کو سمندر میں ڈال دیا۔ حکم خداوندی سے ایک بڑی مچھلی نے آپ کو نگل لیا۔"

لکھنے کے بعد مولانا وضاحت فرماتے ہیں کہ شارک وغیرہ قسم کی بڑی مچھلیوں کا انسان کو نگل لیا جانا لوگوں کے مشاہدہ میں آچکا ہے۔

سورۂ "نور" میں زیتون کے تیل سے نکلی ہوئی روشنی کی مولانا کی تفسیر بھی ملاحظہ ہو:

> "مطلب یہ ہے کہ ایک تو اس میں خود قابلیتِ نور اعلیٰ درجہ کی تھی۔ پھر ادھر سے فاعل یعنی نار کے ساتھ اجتماع ہو گیا۔ پھر تیل بھی زیتون کا جو اِشراق و قلتِ دخان میں مشہور ہے۔ تو اس قدر روشنی ہوئی کہ جیسے بہت ہی روشنیاں جمع ہوں یعنی نورٌ علیٰ نور۔"

سورۂ "نحل" کی آیات کا مفہوم بتاتے ہوئے مولانا شانِ قدرت اور وجودِ الٰہی پر یوں استدلال فرماتے ہیں:

> "اس سارے محکم نظام و انتظام نباتاتی میں اہل فکر و تدبر کے لیے اللہ کی ربوبیت، قدرت، حکمت و توحید کی بڑی بڑی نشانیاں موجود ہیں۔"

پھر ایک جگہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ سارے نباتات، اشجار و اثمار کا پیدا کرنے والا وہی ایک خالق بے ہمتا ہے اور ان نباتاتی مشاہدات میں اثبات توحید کے پورے پورے

دلائل موجود ہیں۔

غرضے کہ قرآن حکیم میں بیان کردہ زیادہ تر نباتات پر مولانا کے خیالات و نظریات
ایک عظیم علمی، دینی اور سائنسی سرمایہ ہیں، منّ وسلوٰی، سدرۃ المنتہیٰ، کافور، زنجبیل (یعنی
سونٹھ)، عَدَس (یعنی مسور)، فُوم (یعنی لہسن)، بَصَل (یعنی پیاز)، قِثّا (یعنی ککڑی) زقو
(یعنی تھوہڑ) وغیرہ کی بابت حاشیوں میں دی گئی تفصیلات پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں ۔۔
بے شمار بیانات اور نکتے ایسے ہیں جو ان کے سائنسی مزاج کے مظہر ہیں۔ آج کے اس ماحول
میں جب کہ انسان اصل دین سے دور ہوتا جا رہا ہے، اخلاقی قدروں کو پامال کیے جا رہا ہے
توہم پرستی کو اپنا شعار بنا کر نفرت و عداوت کو اپنے دلوں اور دماغوں میں جگہ دے رہا
ہے۔ ایسے دور میں ضرورت ہے سماج کو دین کے ساتھ سائنسی رجحان اور سائنسی فکر
کی۔ وہ دین اور وہ فکر جو مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں کا اصل مدعا، مقصد،
خلاصہ اور نچوڑ یا یوں کہہ لیجیے کہ ESSENCE ہے۔

مولانا عبد اللہ عباس ندوی

تفسیر ماجدی کی انفرادیت

مجھے مولانا عبدالماجد دریابادی کی انگریزی تفسیر پر اپنا مطالعہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے، اردو تفسیر و ترجمہ میں جو محاسن ہیں ان میں کچھ تو مشترک ہیں جو انگریزی تفسیر میں بھی ہیں اور کچھ اضافی خصوصیات بھی ہیں۔ مثلاً زبان و بیان کی سلاست، حوالوں میں بجائے صرف کتاب یا مصنف کا نام لینے کے قدیم مفسرین کے بجنسہٖ الفاظ کا نقل کرنا اور اس طرح کے چند در چند امتیازی پہلو ہیں، جن کا احاطہ ایک مقالہ میں مشکل ہے۔ برسہا برس کی جد و جہد اور دیدہ ریزی، منٹ منٹ کا حساب رکھنے والے اور وقت کا پورا پورا فائدہ اٹھانے والے محقق کے کام کو سرسری مقالہ میں مکمل طور پر نہیں بیان کیا جا سکتا، اور نہ اس کے محاسن کے تمام پہلوؤں کا جائزہ ایک نظر میں ممکن ہے۔ "داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار" کی نوعیت ہے۔ تاہم "مَالَا يُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُلُّهٗ" جو سب کا سب نہ حاصل ہو سکے تو سب ہی کو کلیۃً چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ یا "اَخْذُ الْبَعْضِ خَيْرٌ مِّنْ تَرْكِ الْجَمِيْعِ" کچھ ہی پا لینا اس سے تو بہتر ہے کہ پورے مجموعہ سے محروم رہا جائے۔ اس کوتاہ بیں کو تفسیر ماجدی میں انفرادیت کے جو پہلو نظر آئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) مفسر کا سب سے بڑا سرمایہ اس کا اخلاص ہے جو ہر کام کے لیے ضروری ہے اور دین کے کام کے لیے اشد ضروری اور دین کے کاموں میں بھی کتاب اللہ کی تشریح و تفہیم، وحی رسالت کو دوسروں تک منتقل کرنے کی امانت عظمیٰ کی خدمت کے لیے اشد سے اشد ترین اور اہم سے اہم ترین ضرورت ہے۔ اخلاص کے بعد علم کا درجہ ہے۔ اگر اخلاص شرط ہے تو علم فرض کا درجہ رکھتا ہے جس طرح نماز میں وضو شرط ہے تو اس کے ارکان فرض ہیں اور اخلاص و علم کے ساتھ

ایک اور بات ہے جو اُن کو چمکاتی ہے وہ ہے کسی رہبر مخلص اور اس راستہ کے تجربہ کار پیر دانا کی سرپرستی اور اس کی ہدایات کا حصول مفسر دریا بادی کو یہ تینوں نعمتیں حاصل تھیں جو ایک ساتھ شاذ و نادر ہی کسی کے حصہ میں آتی ہیں۔ ان کے اخلاص کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ کسی تجدد کے داعی نہ تھے، اپنی کوئی پارٹی نہیں بنائی تھی، کسی خاص طرز فکر کے بانی نہ تھے اور مفسر ہونے سے پہلے وہ عبدالماجد دریا بادی صاحب طرز انشا پرداز، کامیاب صحافی کی حیثیت سے معروف تھے، فلسفہ جذبات اور فلسفہ اجتماع کے مصنف، مذہبی لٹریچر کا وسیع مطالعہ رکھنے والے دانشور تھے۔ سوائے اخلاص کے کوئی بات ایسی نہ تھی جو ان کو تفسیر لکھنے پر آمادہ کرتی۔ عربی میں ان کی صلاحیت عربیت کے کسی بڑے فاضل سے کم نہ تھی۔ انھوں نے باقاعدہ اس کی تحصیل کی تھی۔ صرف و نحو کی باریکیوں پر اُن کی جو نگاہ تھی اس کا اندازہ اسی کو ہوسکتا ہے جس نے ان کی تفسیری بحثیں پڑھی ہیں۔ اس مقالہ میں بھی چند مثالیں سامنے آئیں گی اور آخری بات یہ ہے کہ اس راہ کے قدیم رہ نورد، ایک تسلیم شدہ محقق و مفسر کی رہنمائی اور وہ بھی اس طرح کہ قدم بغیر اس کی ہدایت کے نہ اٹھے۔ یہ وہ سعادت ہے جس میں کوئی شاید ہی ان کا سہیم و شریک ہوگا۔ اپنی فکر پر اصرار، اپنی بات پر اصرار اور اپنی رائے پر بے لچک ہونا خواہ دوسرے معاملات میں رہا ہو لیکن قرآن کے معاملہ میں مفسر دریا بادی، عبدالماجد دریا بادی ایڈیٹر صدق سے مختلف تھے۔ مناسب ہوگا کہ اس اجمال کی تفسیر کر دی جائے اور گفتگو اشاروں کے بجائے حوالوں سے ہو۔

مفسر دریا بادی اپنے مرشد و مربی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۲ر شوال ۱۳۵۴ھ مطابق ۲۳ر جنوری ۱۹۳۴ء میں لکھتے ہیں :

"بحمد اللہ ترجمہ کا ایک پارہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تک یہ معمول رہا ہے کہ تازہ وضو کے ساتھ دو۲ رکعت نفل کے بعد پہلے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام والی دعا "رب اشرح لی صدری ویسر لی امری" کسی قدر الحاح کے ساتھ کر لیتا ہوں جب ترجمہ کا کام شروع کرتا ہوں۔ دعا میں اکثر حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ اللہ اللہ عرب سے صدہا میل دور بخارا اور ترکستان کا

ایک شخص بودھ مت[1] ماننے والوں کی اولاد، کہاں پڑا ہوا تھا، اسے کہاں سے کھینچ کر کہاں پہنچایا گیا کہ آج کتاب اللہ کے بعد گویا اسی کی کتاب دین کی بنیاد ہے۔ اسی کریم سے دعا ہے کہ اس مخلص ومقبول کے اخلاص کا ایک شمہ اس سیاہ باطن کے اندر بھی پیدا کردے۔"

دریابادی مسترشد کی اس تحریر پر تھانوی مرشد کا جواب:

"مبارکباد قبول ہو۔ آپ کی دعا الہامی ہے جو مصداق ہے "ہم دعا از تو" کا تو اس کے ساتھ "ز تو" کی کامل توقع ہے۔"

مولانا تھانویؒ نے ز تو سے اس شعر کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو　　　　ایمنی از تو، مہابت ہم ز تو

یعنی صرف تو ہی دعا کی توفیق دیتا ہے، قبولیت دعا بھی تیری طرف سے ہے۔ دل لرزتا تیرے خوف سے ہے اور اس کو سکون بھی تو ہی دینے والا ہے۔

مفسر دریابادی اور حضرت تھانوی کی مراسلت "حکیم الامت۔ نقوش وتاثرات" کے صفحات سے نقل کی گئی ہے۔ اسی کے چند صفحات کے بعد مفسر دریابادی لکھتے ہیں:

"اب مراسلت کیا ہوتی تھی گویا حضرت کے ہاں سے تفسیر درس تحریری Corres Ponding course کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور ہر ہفتہ ادھر سے استفادہ ادھر سے افادہ برابر شروع ہوگیا تھا۔

اخلاص اور ایک مرشد کامل کے زیر سایہ، زیر تربیت اور زیر ہدایت کام کرنے کا ثبوت تو اس مراسلت سے ظاہر ہوگیا۔ لیکن کلام ربانی عربی زبان میں ہے۔ بغیر عربی میں مہارت اور احادیث نبویہ سے براہ راست استفادہ کرنے کی پختہ صلاحیت کے اس راہ میں ایک قدم بھی چلنا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ مفسر دریابادی کی عربی دانی اور دینی علوم سے وابستگی کو بتانے کے لیے کسی سند یا سوگند کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی تفسیر میں

---

[1] بخاری مجوسی مذہب رکھنے والوں کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے پردادا (مغیرہ) کے والد بردزبہ مجوسی تھے۔

جو حوالہ جات ہیں اور جہاں پوری پوری عبارت نقل کرتے ہیں، احادیث نبویہ سے استشہاد کرتے ہیں، ان کے راویوں پر بحث کرتے ہیں، نحو و بلاغت کے دقیق مسائل اور باریک سے باریک فرق کو واضح کرتے ہیں وہ خود شاہد عدل ہیں ان کی عربی میں مہارت کے ان کے مآخذ جو عربی تفسیروں کے ہیں ان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تفسیری اقوال کا مجموعہ "تنویر المقباس"، ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کی "جامع البیان"، لغت و ادب کے مشہور امام جاراللہ زمخشری (م ۵۳۸ھ) کی کشاف، امام فخرالدین رازی (م ۶۰۶ھ) کی تفسیر کبیر، امام محمد بن احمد انصاری قرطبی (م ۶۷۱ھ) کی جامع احکام القرآن، حسین بن مسعود بغوی شافعی (م ۵۱۰ھ) کی معالم التنزیل، آٹھویں صدی ہجری کے نامور محدث اور ثقہ مفسر ابن کثیر دمشقی (م ۷۷۴ھ) کی تفسیر ابن کثیر، محمود ابوالبرکات الحنفی النسفی (م ۷۰۱ھ) کی مدارک التنزیل، قاضی بیضاوی (م ۶۸۵ھ) کی مشہور تفسیر اسرار التاویل و انوار التنزیل جو تفسیر بیضاوی کے نام سے ہر مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اسرائیلیات اور شان نزول کثرت سے نقل کرنے والے خازن اور بغوی کی تفسیریں ان کے علاوہ چھوٹی بڑی متعدد تفسیروں سے مفسر دریابادی نے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ اگر کسی نے ایک ضمیر کے مرجع اور لام تاکید اور لام سببیہ میں بھی اختلاف کیا ہے اس کو سامنے رکھ کر ترجیحی شکل اختیار کی ہے۔ لغت میں اصلاً تو "لسان العرب" اور اسی پایہ کی انگریزی میں Lane کی Lexicons اور صحاح سے کام لیتے تھے۔ لغات قرآن پر اصبہانی کی شرح مفردات غریب القرآن اور ابن قتیبہ کی الفاظ القرآن اور اعراب کے لیے العبکری ما من بہ الرحمٰن من وجوہ الاعراب کے بے شمار حوالے جا بجا موجود ہیں۔

اسی طرح وہ تین باتیں جو اوپر سطروں میں ذکر کی گئیں، اخلاص، علم اور اس کے ساتھ بحر علم کے شناور کی رہنمائی کا حصول ایک امتیازی وصف ہے۔ کسی کے اخلاص سے انکار نہیں نہ کسی کے علم پر تعریض مقصود ہے، مگر ان دونوں کے ساتھ مفسر کا اپنے کو عقل کل نہ سمجھنا اور تدبر کا تنہا حقدار نہ سمجھنا، اپنے اوپر شک کرنا، اپنی تحقیق کے باوجود مرشد کی رضا کی تلاش کرنا کامیاب بات ہے جس نے مفسر عبدالماجد کو اپنی عطا و بخشش سے

بعد و شرف کے بلند مقام پر فائز کر دیا۔ دوسرا انفرادی پہلو اس تفسیر کا یہ ہے کہ مفسر نے براہ راست متن قرآن سے خود اپنا ترجمہ کیا ہے کسی ترجمہ کو اپنی تعبیر کا جامہ نہیں پہنایا ہے متن قرآن کو سمجھنے میں خواہ ان کو جس قدر بھی دیدہ ریزی اور کاوش فکر سے کام لینا پڑا ہو، اور خود ایک ایک لفظ تول کر، ایک ایک فعل اور متعلق فعل، ضمیر اور اس کے مرجع کو نحوی کتابوں اور تفسیروں کے اندر بحثوں سے اطمینان کرنے کے بعد لکھا ہے۔ اس میں وہ یہاں تک محتاط تھے کہ خود اپنے مرشد حکیم الامت سے مفاہمت میں ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی۔ کیوں کہ نحوی ترکیب کا مسئلہ بہت نازک اور وسیع ہے۔ جن لوگوں نے قرآن کریم کی تفسیر کے بجائے اپنے ذہن و تجربہ، ذوق و تصور کی ترجمانی کی ہے ان کو کھینچا تانی کا موقع نحوی ترکیب تحریف کے ذریعہ ملا ہے۔ اس معاملہ میں مفسر دریابادی کا حاسہ بہت قوی بھی تھا اور شکی بھی اور بغیر شک کے تحقیق ممکن نہیں ہے۔ مفسر دریابادی کس درجہ باریک بینی سے ان کو پرکھتے تھے اس کا نمونہ مرشد و مسترشد کے نام و پیام میں ملتا ہے۔

مفسر نے اپنے مرشد کو لکھا:

”آپ کی بیان القرآن کی پوری قدر رفتہ ہی رفتہ جا کر ہوتی ہے۔ جب شروع شروع اسے کئی سال ہوئے میں نے دیکھا تھا تو ایک متوسط درجہ کی کتاب نظر آئی تھی۔ پھر جب میں نے لوگوں کو ترجمہ قرآن اس کی مدد سے پڑھانا شروع کیا تو اس کی قدر بڑھی اور پوری قدر تو اب جا کر ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مفسر نے ایک ایک لفظ تول کر لکھا ہے، لیکن بایں ہمہ چند مقامات میں جناب کا اتباع نہیں کر سکا ہوں۔

(۱) ”بقرۃ“ کا ترجمہ میں نے ”بیل“ سے نہیں ”گائے“ سے کیا ہے۔ لغت سے مجھے جھکتا ہوا پلا گائے ہی کا معلوم ہوا۔

(۲) ”ملة ابراهيم حنيفا“ میں جمہور مفسرین کے اتباع میں میں نے حنیفا کو ابراہیم سے متعلق کیا ہے نہ کہ ملت سے۔

(۳) ایک اختلاف معنوی حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہے یہاں میں آپ ہی

کے نہیں اکثر مفسرین کے اتباع سے ہٹ گیا ہوں "ان الذین کفروا سواءٌ علیھم" میں میں نے کشاف وغیرہ کا اتباع کر کے متن ترجمہ میں سواء علیھم کو حال قرار دیا ہے یعنی ایسے کافر جن کے لیے انذار وعدم انذار سب برابر ہیں ایمان نہیں لائیں گے، البتہ حاشیہ دے دیا ہے کہ جمہور اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے۔

مرشد تھانوی کا جواب:

" بقرہ کے سلسلہ میں: لغت اور نقل میں دونوں برابر ہیں، دونوں کا اختیار کرنا جائز ہے لیکن مجھ کو بیل کا ترجمہ اس لیے راجح معلوم ہوتا ہے کہ آگے آیت میں "لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث" آیا ہے اور ظاہر ہے گائے میں یہ وصف عادی مثل فطری کے ہے تو اس کی نفی کی ضرورت تھی اور بقرہ کا مذکر ومونث دونوں میں استعمال مصرح ہے۔ لیکن اگر کسی کے ذہن میں دوسرے ترجمہ کی ترجیح ہو تو گنجائش ہے۔

ملة ابراھیم میں حنیفا حال ابراہیم کا میرا مرجح ہے لیکن آپ کی ترجیح میں بھی معنیٰ کا تغیر نہیں ہوتا۔

دوسری آیتوں کے سلسلہ میں مفسر دریابادی کو مرشد تھانوی نے کیا جواب دیا اس کے ذکر سے پہلے مناسب ہوگا یہ واضح کر دیا جائے کہ مفسر دریابادی نے کوئی ایسا اختلاف نہیں کیا تھا جس سے مفہوم میں واضح فرق ہو۔ یہ صرف ان کے احتیاط، تفقہ، وسیع النظری اور کمال تحقیق کی ایک مثال ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس آیت کا جو ترجمہ دیا ہے اور اس پر جو حاشیہ یا تفسیر ہے اس کو بجنسہ نقل کرتا ہوں:

قل بل ملة ابراھیم حنیفا، ترجمہ ماجدی: آپ کہہ دیجیے کہ نہیں بلکہ (ہم نے تو) ابراہیم سیدھی راہ والے کا مذہب پالیا ہے۔ تفسیر: (اس کی اصلی اور غیر محرف شکل میں) یہود اور نصاریٰ دونوں، نو مسلموں اور نیم مسلموں کو اپنی طرف کھینچتے تھے کہ فلاح ونجات منظور رہو تو ہمارے مذہب میں آؤ، اس نئے مذہب میں کیا رکھا ہے، مسلمانوں کو تعلیم اس جواب کی مل رہی ہے کہ تمھارے ہاں کیا

رکھا ہے بجز تحریفات کے؟ رہا ہمارا دین تو نو پیدا ذرا بھی نہیں، وہ تو قدیم دین توحید ابراہیم علیہ السلام کا ہے اور ہم اس کی اصل اور غیر محرف شکل پر قائم ہیں۔ حنیفًا ترکیب میں حال واقع ہوا ہے مضاف الیہ ابراہیم کا۔ اکثر اکابر تفسیر اس طرف گئے ہیں۔ زمخشری نے لکھا ہے "حال من المضاف الیہ" ابوسعود حیان نے لکھا ہے "ھو حال المضاف الیہ"۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حنیفًا صفت ابراہیم کی نہیں ملت کی ہے اور حال مضاف الیہ کا نہیں بلکہ مضاف کا واقع ہوا ہے۔ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اسی کو ترجیح دی ہے۔ ھو حال من المضاف بتاویل الدین أو تشبیہالہ بفعیل بمعنی المفعول، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا: ہم نے پالیا ہے مذہب ابراہیم کا جو سیدھی راہ ہے۔ حنیفا بہر صورت مستقیما مائلا الی الحق کے معنی میں ہے۔ اس جملہ کی تقدیر یوں ہے بل نتبع ملتہ علیہ السلام۔"

اس تفسیر کو نقل کرنے کا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ مفسر دریابادی نے بلاشبہ مفسرین سلف سے ہٹ کر اپنی کوئی راہ نئی نہیں نکالی ہے اور نہ تدبر قرآن کی دعوت کو بہانا بناکر قرآن کے پردہ میں اپنی بات کہی ہے جن کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے "قوم رأوا رأیا وحملوہ علی القرآن" یعنی کچھ لوگ بات تو اپنی کرتے ہیں مگر اس کو قرآن پر ڈال دیتے ہیں۔ مفسر دریابادی نرے مقلد اور جامد متبع سلف ہیں ان کے مرشدان سے بھی زیادہ سخت مقلد تھے۔ اکابر کی راہ سے سرمو اختلاف نہیں کرتے تھے مگر یہ راہ اس لیے نہیں اختیار کی کہ اس میں تن آسانی ہے ورنہ کیا مشکل تھا کہ دو چار ترجموں کو سامنے رکھ کر ایک نیا ترجمہ اور چند تفسیروں کو سامنے رکھ کر معمولی الفاظ کے رد و بدل سے ایک نئی تفسیر وجود میں آجاتی۔ مفسر دریابادی نے اجتہاد میں انقیاد کا راستہ اختیار کیا بلکہ اس راہ میں الفوح سالہاسال دیدہ ریزی کی ہے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک فعل، اسم اور حرف کو خردبین لگاکر دیکھا ہے۔ اس کی ہوا بھی ان لوگوں کو نہیں لگی ہے جو ایک اچھوتا خیال، ایک مقصد، ایک نئی دریافت کے نام سے تفسیر لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔

مفسر دریابادی نے مرشد تھانوی کو ایک آیت "ان الذین کفروا سواءٌ علیھم" کی نحوی ترکیب کے سلسلہ میں لکھا کہ میں اس میں جناب کا اتباع نہیں کرسکا ہوں بلکہ صاحب کشاف کی رائے کو ترجیح دی ہے اس کا جواب مرشد تھانوی نے حسب ذیل دیا:

"یہاں کشّاف موجود نہیں، ورنہ اس کی عبارت اور وجہ اس کے اختیار کرنے کی دیکھتا، اب آپ کی تحریر سے جو سمجھا ہوں اس کی بنا پر عرض کرتا ہوں۔ 'حال' ہونے کی تقریر تو معلوم ہوتی ہے کہ "کفروا" میں ضمیر فاعل کی ہے، راجع موصول کی طرف وہ ذوالحال ہے اور جملہ "سواء علیھم" اس کا حال ہے اور ذوالحال اس حال سے مل کر فاعل ہے کَفَرُوْا کا، اور "کفروا" صلہ ہے موصول کا اور موصول اسم ہے اِنَّ کا اور لا یومنون خبر ہے ان کی۔ بعض دوسرے مفسرین نے بھی "لا یومنون کو ان کی خبر کہا ہے مگر سواء علیھم کو جملہ معترضہ یہاں علت کے لیے کہا ہے، جس کا اعراب میں کوئی عمل نہیں، ہے۔ حال ہونے کی صورت میں اس کا ترجمہ ہونا چاہیے "یقیناً جن لوگوں نے اس حالت میں کفر کیا (غایت عناد کے سبب) ان کو آپ کا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے (یعنی کسی حالت میں وہ باز نہیں آئیں گے) ایسے لوگ ایمان نہیں لائیں گے"۔ اس ترجمہ سے حال ہونا صراحتاً معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو ترکیب (نحوی) کی تقریر ہوئی، باقی وجہ اس کے اختیار کرنے ظاہراً ایک اشکال کا جواب دینا ہے۔ اشکال یہ ہے کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ کافر ہوگئے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ حالانکہ نزول آیت کے بعد بھی بہت سے کافر ایمان لے آئے تو پھر آیت کے کیا معنی ہوئے؟ صاحب کشاف اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ آیت مطلق کفار کے حق میں نہیں بلکہ معاندین کے حق میں ہے، پس وہ اشکال نہ رہا۔ اگر یہ جواب دیا جائے کہ جب عناد نہیں رہا تب ایمان لائے تو ایسا جواب تو بدون قید عناد بھی اشکال مذکور کا ہوسکتا ہے۔ یعنی جب تک کفار کفر پر رہیں گے ایمان نہ لائیں گے اور جب کفر سے باز آگئے تو مومن ہوگئے، تو دفع اشکال میں اس ترکیب کا کوئی دخل نہ ہوا،

علاوہ اس کے جملہ معترضہ ماننے میں کشاف کی ترکیب کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔
کیونکہ جملہ معترضہ میں علت کی طرف اشارہ مانا گیا ہے۔ پس معنی یہ ہو گئے کہ کفار ایمان نہ لائیں گے کیونکہ وہ معاند ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ آیت کفار معاندین کے حق میں ہے، تو ترکیب کشاف میں کیا ترجیح ہوئی؟ اس کے علاوہ بعض مفسرین نے اشکال کا اور بھی جواب دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ موصول "الذین" عہد کے لیے ہے، یعنی خاص کفار کے حق میں ہے جیسے ابوجہل، ابولہب وغیرہ۔ اس صورت میں یہ جائز ہے کہ "سواء علیھم" خبر ہو اور "لا یومنون" اس کی تفسیر یا خبر بعد خبر ہو، لیکن اگر باوجود اس کے دفع اشکال کے لیے آپ کو ذوقاً ترکیب کشاف سے اطمینان ہو تو اس کے اختیار کرنے میں مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ جمہور کی ترکیب میں اشکال دفع نہ ہوگا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقصود سب کا مشترک ہے اور اس میں کوئی مختلف فیہ استشہاد معتزلہ کا نہیں ہے اس لیے حاشیہ میں تنبیہ خصوصاً اہل سنت کے عنوان سے ناظرین کو خلل میں ڈالے گا۔
واللہ اعلم۔"

یہ طویل مراسلت جو مفسر دریابادی کی کتاب "حکیم الامت" سے نقل کی گئی ہے یہ ظاہر [ہوت]ا ہے کہ مفسر نے جس باریک بینی اور دقتِ نظر سے کام لیا ہے اور ان کے مرشدؒ نے بھی [جس] درجہ اہتمام و فکر کے ساتھ رہنمائی کی ہے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

(۳) تفسیر ماجدی کی انفرادیت کے یہ دو پہلو جو اوپر ذکر کیے گئے وہ ایسے ہیں کہ جن [کی] طرف عام طور پر نگاہ نہیں جاتی، کیونکہ اصل انفرادیت جو لوگوں کو سرسری نظر ڈالنے [سے] معلوم ہو جاتی ہے وہ ہے صحف سماویہ توراۃ وانجیل کے محرف ہونے کو ثابت کرنا انصاف [کی] بات یہ ہے کہ اس باب میں مفسر دریابادی کا کام متقدمین اور متاخرین سب [سے] بڑھا ہوا ہے۔ متقدمین کے کام سے اس لیے بڑھا ہوا ہے کہ قرآن کریم کی وہ آیات [جن] کا پس منظر سمجھنے کے لیے کتب سماویہ سے موافقت اور ان کے مندرجات سے آگہی [کی] حاجت تھی۔ انھوں نے اسرائیلی روایات سے حل کی تھیں اور اسرائیلی روایات کے قبول

کرنے کی مشروط اجازت ہے، اگر وہ قرآن کریم کی تصدیق کرتی ہوں، یا کم سے کم معارض
تو ان کو قبول کیا جا سکتا ہے اور ہر حالت میں ان کی صداقت یقینی نہیں ہے۔ سلف کا
"لا نصدقه ولا نکذبه" نہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ جھٹلاتے ہیں، ت
ایسے مقامات قرآن مجید میں ہیں جن کی تفسیر کے لیے ابن جریر طبری سے لے کر ابن
الدمشقی تک مجبور تھے کہ کعب الاحبار، وہب بن منبہ، عبد الملک بن عبد العزیز بن الج
الرومی کے حوالہ سے ان کی روایات کو تسلیم کر کے ان خاص آیات کی تفصیل کریں مثلاً
لهم نبيهم ان اٰية ملكه ان يأتيكم التابوت فيه سكينة من ربكم
آیت میں "التابوت" کیا ہے؟ اس میں رازی، بغوی، اور متاخرین میں آلوسی
مراد لی ہے کیونکہ انھوں نے وہب بن منبہ کی روایت پر اعتماد کیا ہے" اور دوسرے
نے اس کو اسی صندوق کے معنی میں لیا ہے جس میں توراۃ اور تبرکات تھے۔ شیخ رش
نے ان تمام روایات کو چھوڑ کر دوسرے معنی لیے یعنی تابوت کا مطلب 'سینہ' ہے۔
یہ ہے کہ اسرائیلی روایات ناقابل اعتبار ہیں اور تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ غور کر
اطمینان و سکینت کا محل قلب ہے نہ کہ صندوق۔ اسی طرح آیت "ماکفر سلیمان
الشیاطین کفروا" میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ جو پیغمبر تھے ان سے
نفی کیا معنی؟ جیسے آپ کسی حکمراں کے متعلق یہ کہیں کہ وہ دغاباز نہیں تو شبہ ہوتا ہے
نے اس پر یہ الزام لگایا ہوگا جس کی نفی کی جا رہی ہے۔ اس کا حل بھی اسرائیلی روا
سے کیا جاتا تھا، اسی طرح "ألقينا على كرسيه جسدًا ثم أناب" اس ک
میں ہمارے قدماء نے بھی عجیب و غریب حکایتیں نقل کر دی ہیں جو ایک پیغمبر کے کیا
عامی مسلمان کے بھی شایان شان نہیں ہیں۔ اسی بنا پر احمد امین نے فجر الاسلام میں کع
پر سخت تنقید کی ہے اور ان کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے۔ ان مقامات کو حل کرنے ک
ہی طریقے ہو سکتے تھے۔ ایک تو اسرائیلی روایات کو بجنسہٖ قبول کر لیا جائے، دوسرا
یہ کہ ان سب سے انکار کر کے محض اٹکل سے ایک مفہوم تجویز کر دیا جائے۔ پہلا راستہ
مفسرین نے اختیار کیا ہے چنانچہ متعدد روایتیں جمع کر دی ہیں اور دوسرا راستہ مفتی

کے شاگرد رشید رضا اور دیگر متبعین نے، جن میں ہمارے انگریزی کے مشہور مترجم اور قادیانی مترجم محمد علی عرف مولانا محمد علی لاہوری بھی ہیں۔ مفسر دریابادی کی یت یہ ہے کہ انھوں نے سلف کے مختار قول کو نقل کرنے کے بعد اس کی اصل توراۃ کے تحریف شدہ نسخوں میں تلاش کی پھر "جیوش انسائیکلوپیڈیا"، "انسائیکلوپیڈیا ٹانیکا" اور "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" میں علمائے یہود و نصاریٰ کی جدید تحقیقات کا مطالعہ کر کے یہ دکھایا کہ قرآن ہی تنہا وہ آسمانی صحیفہ ہے جو ان مسخ شدہ ت کی تصحیح کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دو مقامات سورہ بقرہ سے پیش کرتا ہوں:

"اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ (الآیۃ)

کیا تو نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کی جس نے ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارہ میں مباحثہ کیا۔

(منکر و مخالف کی حیثیت سے) یہ بحث و مناظرہ کرنے والا کون تھا؟ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کوئی معاصر بادشاہ تھا۔ یہ تصریحات تو قرآن مجید بلکہ اس آیت کے اندر موجود ہیں۔ مفسرین نے اس موقع پر نمرود کا نام لیا ہے اور چونکہ اس خاص قصہ کا ذکر اہل کتاب کی کتاب میں موجود نہیں، اس لیے وہ اس روایت ہی کے ماننے میں تامل کر رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید، توریت کی اس طرح کی خدا جانے کتنی فروگذاشتوں کی تصحیح کرتا گیا ہے۔ اتنا تو بہر حال تاریخ توریت اور روایات یہود میں تسلیم ہے کہ نمرود نامی بادشاہ کا وجود تھا، بادشاہ بہت بڑا تھا، اور ساتھ ہی سخت ظالم اور مشرک اور آزر اس کا وزیر تھا، توریت میں ہے: "اور کوش سے نمرود پیدا ہوا، زمین پر جبار ہونے لگا، خداوند کے سامنے وہ صیاد و جبار تھا، اسی واسطے مثل ہوئی کہ خداوند کے سامنے نمرود سا صیاد و جبار (پیدائش ۱۰۔۹۸) اور کوش سے نمرود پیدا ہوا وہ زمین پر جبار ہونے لگا (۱۔ تواریخ ۱۔۱۰) اور حسب روایات یہود، یہ نمرود اپنے قبیلہ والوں کی مختصر فوج سے آل یافث کو شکست دینے کے بعد زمین کا بادشاہ ہو گیا اور آزر کو اس نے

اپنا وزیر بنایا، اس کے بعد اپنی عظمت کے نشہ میں نمرود خدا سے بیگانہ ہو گیا اور بہت سخت قسم کا مشرک ہو گیا۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا، جلد ۹ صفحہ ۳۰۹، بابل (کلدانیہ) ہی کی تاریخ میں ایک اور بادشاہ کا نام آتا ہے جو بابل کا سب سے پہلا انسانی خدا تھا۔ بعض مورخین نے اسے نمرود کا مرادف قرار دیا ہے (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۶ صفحہ ۲۴۶) انیسویں صدی عیسوی کے ثلث آخر میں فرنگی مادیت وعقل پرستی اور اس کی تقلید میں ہندوستانی "روشن خیالی" اور "نیچریت" کا شدید تقاضا یہ تھا کہ ان قصوں ہی سے سرے سے انکار کر دیا جائے، لیکن جوں جوں خود فرنگی مورخین کے قدم آگے بڑھتے گئے۔ یہ تشکیک وبے اعتقادی بھی ضعیف ہوتی چلی گئی۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں اعتراف ہے کہ نصف صدی پیشتر ان قصوں کو جیسا بے اصل ونامعتبر سمجھ لیا گیا تھا۔ وہ خیال اب مزید تحقیق سے قائم نہیں رہا یہاں تک کہ نمرود کے ساتھ مناظرہ ابراہیمی کا قصہ بھی جلد ۱۳ صفحہ ۶۵ پر موجود ہے۔ "ربہ" میں ضمیر ابراہیمؑ کی طرف ہے، لیکن بعض نے "الذی حاجّ" کی جانب بھی جائز رکھی ہے اور اس صورت میں ترجمہ ہو گا: اپنے رب کے باب میں، والضمير يحتمل أن يعود إلى إبراهيم ويحتمل أن يرجع إلى الطاعن والاول اظهر (کبیر) بہرحال قابل لحاظ لفظ یہاں "رب" ہے، گفتگو "رب" کے بارہ میں تھی "اللہ" کے بارہ میں نہ تھی، باب الوہیت میں نہ تھی۔"

اس آیت کی شرح وتفسیر سے تفسیر ماجدی کا اندازہ واضح ہو جاتا ہے جو شروع سے آخر تک یکساں ہے۔ اسی طرح ایک دوسری آیت:

"وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ (الآیۃ) اور ان سے ان کے نبی نے کہا کہ اس کی امارت کا نشان یہ ہے کہ تمھارے پاس وہ صندوق (از خود) آجائے گا جس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے لیے سامان تسکین ہے۔

(درانحالیکہ تم مدت دراز سے اپنی اس متاع عزیز سے محروم ہو) "یاتیکم"
یعنی از خود بغیر تمھاری کسی جد و جہد کے آجائے گا۔ "التابوت" اس خاص صندوق
کا اصطلاحی نام "تابوت سکینہ" ہے۔ یہ بنی اسرائیل کا اہم ترین ملی و قومی ورثہ تھا
اس کے اندر اصل نسخہ توریت مع تبرکاتِ انبیاء، محفوظ تھا۔ اسرائیلی اس کو
انتہائی برکت و تقدیس کی چیز سمجھتے تھے اور اس کے ساتھ برتاؤ انتہائی احترام کا
رکھتے تھے۔ سفر و حضر جنگ و امن ہر حال میں اسے بڑی حفاظت سے اپنے
ساتھ رکھتے، یہ کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ موجودہ علمائے یہود کی تحقیق کے مطابق اس
کی پیمائش حسب ذیل تھی۔ طول ۲½ فٹ، عرض ۱½ فٹ بلندی ۱½ فٹ، بنی
اسرائیل اپنی ساری خوش بختی اسی سے وابستہ سمجھتے تھے۔ مدت ہوئی فلسطینی
اسے ان سے چھین لے گئے تھے۔ اسرائیلی اسے اپنے حق میں انتہائی نحوست و بد
طالعی سمجھے، اس کی واپسی کے لیے نہایت درجہ بے تاب و مضطرب تھے۔ طالوت
کے وقت میں یہ تابوت واپس آجانے کے بعد تاریخ کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل
کے قبضہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام (متوفی ۹۳۳ ق م) تک رہا، اور آپ نے
بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد اسی میں اسے رکھ دیا تھا اس کے
بعد سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہود کا عام خیال یہ ہے کہ یہ تابوت اب بھی ہیکل
سلیمانی کی بنیادوں کے اندر دفن ہے۔

"سکینۃٌ مِن رَبِّکُم" یعنی توریت کا نسخۂ شفا۔

اس آیت کی شرح و تفسیر سے وہ شبہات تو دور ہو جاتے ہیں جو اسرائیلی قصوں نے پیدا کر دیے تھے۔ نیز ہمارے روشن خیال اور حدیث، روایت اور اس کے ساتھ لغت و نحو سے آزاد مفکرین اور مدعیان اجتہاد کے علم کی بھی قلعی کھل جاتی ہے جو تدبر کے ادعا میں بے سند جو جی چاہتا ہے مطلب نکالتے رہتے ہیں۔

تفسیر ماجدی کی انفرادیت کا یہ پہلو تشنہ رہے گا اگر یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ آیا مفسر دریابادی اس میدان میں تنہا ہیں جنھوں نے توراۃ و انجیل کے بیانات سے قرآن کریم کی

آیات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور اگر کوئی اور ہے جو اس طرح کا کام کر چکا ہے تو تفسیر ماجدی میں اور اس کے کام میں کیا فرق ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ مفسر دریابادی اس میدان میں پہلے اترنے والے نہیں ہیں۔ ان سے بہت پہلے (قدماء میں) "ابن حیان" الاندلسی نے اور (متاخرین میں) مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا دونوں نے یہ کام کیا ہے اور التزام کے ساتھ نہ سہی مگر قصص کے معاملہ میں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان حضرات نے بھی تورات وانجیل کے عربی ترجموں کو سامنے رکھا ہے۔ محمد علی لاہوری (قادیانی) نے بھی مغرب سے مرعوبیت کم کرنے کی بظاہر کوشش کی ہے، مگر ان تمام کاوشوں اور مفسر دریابادی کے درمیان یہ فرق ہے کہ ان لوگوں کا انداز مدافعانہ ہے اور صرف ان ہی مقامات پر گفتگو کی ہے جن پر مستشرقین کی طرف سے حملے ہوئے ہیں برخلاف مفسر دریابادی کے انھوں نے خود بڑھ کر تحریف شدہ صحائف کا کھوکھلا پن دکھا دیا ہے اور یہ رنگ سورہ فاتحہ سے لے کر اخیر تک قائم رہا ہے۔ سورہ فاتحہ کی تفسیر دیکھیے تو تفسیر ماجدی کے علاوہ کوئی تفسیر ایسی نہیں ملے گی جس میں اس کا موازنہ انجیلی دعا "لارڈ پریئر" (Lords Prayer) سے کیا ہو، یا حضرت یوسف، حضرت مریم، عمران، یونس کے واقعات میں سے ایک ایک جزء کا موازنہ انجیلی بیانات سے کیا ہو اور قرآن کی افضلیت کا سکہ بٹھایا ہو۔ لہذا صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ مفسر دریابادی نے مغربی علوم میں مہارت رکھنے کی وجہ سے اسرائیلی روایات کی اصلیت کھول کر بیان کر دی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے قصص کے علاوہ اور بھی مواقع پر تقابل کر کے دکھایا ہے کہ وحی کی بے آمیز روشنی اگر کہیں ہے تو صرف قرآن میں ہے۔

تفسیر ماجدی کی انفرادیت کا چوتھا رخ یہ ہے کہ یہ تفسیر مفسر گر ہے۔ اگر کسی ایک کتاب میں کسی کو دیکھنا ہو کہ قدماء نے کیا لکھا ہے اور کن الفاظ میں لکھا ہے وہ اس کو تفسیر ماجدی میں پائے گا، محققین کی تازہ بتازہ تحقیقات معلوم کرنا ہوں تو اس کا اچھا خاصا مواد بھی اس تفسیر میں مل جائے گا۔ ایک لفظ کے اگر متعدد معانی مختلف مفسروں نے بیان کیے ہیں اگر ان کو یک جا دیکھنا چاہے تو اس کے لیے اسی تفسیر میں دیکھنا ممکن ہوگا۔ نحوی ترکیب کے کسی گوشہ یا شوشہ میں الجھن پیش آرہی ہو تو تفسیر ماجدی میں اس کا حل موجود ملے گا۔ اگر واعظانہ اسلوب اور

دل کو نرم کرنے والے اور قلب کی سختی کو موم بنانے والے واقعات جو روح المعانی وغیرہ میں ملتے ہیں وہ بھی یہاں موجود ہیں۔ انداز بیان فلسفیانہ اور علمی موشگافیاں کرنے والوں کے جیسا خشک نہیں بلکہ اس میں زبان کی آب اور طرز بیان کی تب وتاب بھی ہے۔ لیکن ایسی مضمون آفرینی نہیں ہے کہ جو کسی صاحب ذوق کے ذوق پر گراں ہو۔ بایں ہمہ زبان وادب کی چاشنی پر معانی کو قربان نہیں کیا ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جو سلف کے اقوال سے متعارض ہو۔ اگر ارض القرآن یا جغرافیہ کے ان مقامات کو معلوم کرنا مطلوب ہے جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے تو شرح وبسط کے ساتھ اس کی تفصیل بھی سامنے ہے۔ قرآن کریم میں جن حیوانات کے نام آئے ہیں، ان کی کیا ساخت ونوعیت ہے اس پر اتنا لکھا ہے کہ مفسر دریابادی نے اس کو علاحدہ "حیوانات القرآن" کے نام سے چھاپ دیا ہے۔

اس تفسیر کی انفرادیت کا پانچواں رخ یہ ہے کہ قرآن کی عظمت کا تصور شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ کلام الٰہی کا جلال وجمال، اس کی معنویت، اثر انگیزی، آیات رحمت میں رحمت کا منظر، آیات غضب میں رونگٹے کھڑے کرنے والا جو انداز ہے اس کو دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں ہے۔ بشر پھر بشر ہے۔ اس کے کلام میں وہ زور کہاں آسکتا ہے جو اصل میں ہے مگر اس کا کوئی شمہ کوئی معمولی سے معمولی حصہ اگر انسان اپنی زبان میں منتقل کر سکتا ہے تو اس کی نمائندگی تفسیر ماجدی کرتی ہے۔

اس تفسیر کی انفرادیت کا آخری باب' اس کم سواد کی نظر میں یہ ہے کہ مذاہب منحرفہ اور فرق باطلہ کا ابطال مناظرانہ انداز میں اور سلبی اسلوب میں نہیں ہے، مگر ایجابی انداز میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جس سے کسی باطل پرست کو موشگافی کا موقع نہیں مل سکتا۔ مثلاً جو لوگ احادیث نبویہ کے منکر ہیں ان کو ایسی آیات کی شرح میں باور کرا دیا ہے کہ بغیر دامانِ رسالت کے سایہ کے محراب قرآن میں رسائی محال ہے۔ صرف مثال کے طور پر سورہ توبہ کی وہ آیت دیکھیے وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا۔

قادیانیت کی ساری دیوار وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر میں منہدم ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ انھوں نے نام لے کر کسی فرد یا گروہ کو

مطعون نہیں کیا ہے۔ لیکن تفسیر میں اقوال سلف اس طرح کے جمع کر دیے ہیں کہ ان کا بھرپور ابطال ہو جاتا ہے۔

حاصل یہ کہ تفسیر کا ہشت پہل نگینہ اپنی جامعیت، معنویت، لفظی محاسن اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے، اور یہ کام خود دراصل بیسوں تفسیروں کا عطر ہے مفسر دریابادی کو رازی، زمخشری، سیوطی، قرطبی، بیضاوی اور آلوسی کی طرح تا دیر زندہ رکھے گا، یوں بقا و دوام حضرت اللہ کی ذات کے لیے ہے۔

ضیاء الدین اصلاحی

نصرانیت، عیسائیت اور مسیحیت تفسیر ماجدی کے آئینہ میں

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی ذات گرامی میں علم و ادب اور مذہب تینوں کا اجتماع بدرجہ اتم تھا۔ ابتدا میں وہ مذہب سے برگشتہ تھے لیکن بہت جلد الحاد کی وادی سے دامن جھاڑ کر نکل آئے اور مذہب کے کوچہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ کارکنان قضا و قدر نے ضرور یہ صدا بلند کی ہوگی کہ

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

اس میدان میں قدم رکھتے ہی رمز آشنائے روم و تبریز بن گئے اور دوسروں پر گوئے سبقت لے گئے۔ مذہبی راسخ العقیدگی ایسی بڑھی کہ مذہب، مذہبی علوم اور اسرار دین کے شارح و ترجمان ہو گئے۔ عربی انھوں نے کالج میں پڑھی تھی مگر اس میں ایسی پختہ استعداد بہم پہنچائی کہ قرآن و حدیث، فقہ و قانون اور سیر و تاریخ سب کا مطالعہ براہ راست اصل ماخذ سے کیا۔

مولانا تقلید و جمود سے ہمیشہ بیزار رہے اور فلسفیانہ قیل و قال ان کی طبیعت ثانیہ تھی۔ مولانا کو مطالعہ قرآن سے بڑا شغف اور تفسیر و قرآنیات کا عمدہ ذوق تھا، جس کا وافر ذخیرہ ان کے سامنے موجود تھا۔ چاہتے تو اسی پر قناعت کر لیتے مگر ہمت عالی تو دریا بھی قبول نہیں کرتی۔ مولانا نے استفادہ سب سے کیا اور سب کی عظمت و خوبی کے معترف و مداح بھی رہے۔ مگر خود فرماتے ہیں:

"یہ عقیدہ ذہن میں تازہ رکھیے کہ نبی معصوم کے بعد کوئی بھی معصوم امت میں نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے فکر، فہم و اجتہاد کے لحاظ سے ہر بڑے سے بڑا محقق بھی غیر معصوم ہی ہے۔ اس لیے پیروی کسی کے بھی قول کی، ہر حال میں کیے جانا اور صریح

دلیل مخالف کے باوجود بھی کرتے رہنا طریق حق وصواب نہیں۔ اللہ کے کلام کی شرح و تفسیر اگلوں اور پچھلوں کے کسی دور میں بھی آخری اور انقطاعی نہیں ہو سکتی۔ کون اس علیم کل کے کلام کے سارے گوشوں اور پہلوؤں کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاسکتا ہے۔ کس کا علم علیم مطلق کی کتاب کے سارے اطراف کا احاطہ کر سکتا ہے۔ نئے نئے گوشے فکر ونظر کے ہمیشہ ابھرتے آئیں گے اور نئے نئے میدان علم و تحقیق کو دعوت ہر دور میں دیتے رہیں گے۔ نئے نئے سوال برابر پیدا ہوں گے اور نئے نئے جواب کتاب الہدیٰ کے صفحوں میں تلاش سے برابر ملتے رہیں گے۔" [1]

اسی احساس کی بنا پر مولانا نے قرآن مجید کا مطالعہ بڑی دقت نظر سے کیا اور اردو انگریزی دونوں میں اپنی خدمت قرآنی کی عظیم الشان یادگار چھوڑ گئے۔

مولانا کے علمی و دینی کاموں کا دائرہ بہت وسیع اور گوناگوں ہے۔ لیکن قرآن مجید کی اردو، انگریزی تفسیر ان کا سب سے مہتم بالشان علمی و مذہبی کارنامہ ہے۔ ان کی تفسیر کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں مختلف اغراض و مقاصد کے لیے قدیم آسمانی کتب وصحف کے بہ کثرت حوالے دیلے گئے ہیں اور گزشتہ قوموں اور مذہبوں کے بارے میں گوناگوں مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں۔ طوالت کے خوف سے صرف عیسائیت کو اس مضمون میں موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس کے متعلق ابتدا سے گیارہویں پارہ کی اردو تفسیر میں جو معلومات بکھرے ہوئے ہیں اس کے کچھ حصوں کو یہاں پیش کیا جائے گا۔

قرآن مجید میں نصرانیت و مسیحیت دونوں کا ذکر ہے۔ عام لوگ ان کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں ان کے فرق پر آگے بحث ہوگی لیکن ان دونوں کی نسبت حضرت عیسیٰؑ سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ہدایت انجیل عطا فرمائی تھی اس لیے پہلے ان ہی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

مولانا کے بیان کے مطابق یہ بنی اسرائیل کے آخری اور مشہور نبی تھے۔ آپ پر اسرائیلی بلکہ

---

[1] تفسیر ماجدی جلد اول ص۸ افتتاحیہ طبع ثانی؛ جمال پرنٹنگ پریس۔ دہلی

قومی ونسلی رسالت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ ان کا آبائی وطن قصبہ ناصرہ تھا جو پہلے ملک شام اور اب فلسطین کے علاقہ گلیلی میں بیت المقدس سے ستر میل شمال میں اور بحر روم سے مشرق میں بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حضرت مسیحؑ کی ولادت شام کے صوبہ یہودیہ کے قصبہ بیت اللحم یا بیت المقدس کے ایک گوشہ میں ہوئی۔ مولانا کی تصریح کے مطابق شام اس زمانہ میں روم کی شہنشاہی کا ایک نیم آزاد علاقہ تھا جس کا حاکم ہیرود تھا۔ ولادت کے متعلق مولانا کی تحقیق ان کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"سنِ عیسوی جو اس وقت رائج ہے خود اسی تقویم کے قائم کرنے میں شروع ہی سے غلطی رہ گئی اور اس کا پتہ بعد کو چلا۔ چنانچہ سنِ عیسوی کا پہلا سال آپ کا سالِ ولادت نہیں۔ آپ کی ولادت کے چوتھے سال یہ سنہ جاری ہوا۔ ۔ اس لحاظ سے کہنا یہ چاہیے کہ آپ کی ولادت ۴ق م میں ہوئی۔ آپ کی عمر غالباً ۳۳ سال کی تھی اور ۳۰ء عیسوی تھا کہ اسرائیلیوں نے آپ کی تعلیم و تبلیغ سے نہایت درجہ آزردہ ہو کر آپ پر مقدمہ پہلے تو اپنی آزاد و خود مختار مذہبی عدالت میں چلایا اور پھر سرکاری قانون کا بھی مجرم بنا کر رومیوں کی ملکی عدالت میں پیش کیا۔ وہاں سے سزائے موت (بذریعہ صلیب) کا حکم صادر ہوا۔"[1]

مولانا کے بیان کے مطابق جمہور امت کے عقیدہ کے مطابق وہ زندہ اور مسیحی عقیدہ کے مطابق تین دن کے لیے وفات پا کر آسمان پر اٹھا لیے گئے۔[2]

حضرت عیسیٰؑ اپنی والدہ کی نسبت سے ابن مریمؑ کہلاتے ہیں۔ آپ کی ولادت کے وقت وہ یہودی رسم و رواج کے لحاظ سے ناکتخدا اور کنواری تھیں۔

آپ کے لقب مسیحؑ کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ مولانا کہتے ہیں:

"خواہ یہ لفظ عربی الاصل ہو خواہ عبرانی کے کسی لفظ کا معرب۔ بہر صورت اپنے معنی کے لحاظ سے اردو کے "مبارک" کا مرادف ہے۔"[3]

قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح صرف بنی اسرائیل کے لیے نبی بنا کر بھیجے

---

[1] تفسیر ماجدی جلد اول ط ۲۴۱ [2] ایضاً ص ۱۵۵ [3] ایضاً ص ۵۷

گئے تھے۔ اسی لیے قرآن نے کہیں کہیں یہ صراحت کی ہے کہ رسولا الیٰ بنی اسرائیل۔ مولانا دریابادی اس کی توضیح میں رقم طراز ہیں:

"یہ بالکل صریح ہے اس باب میں کہ آپ کی دعوت بنی اسرائیل تک محدود تھی اور دوسرے بنی اسرائیلی پیغمبروں کی طرح آپ بھی صرف قومی نبی تھے۔ انجیل تک میں یہ تصریح اتنی تحریفوں کے بعد بھی باقی رہ گئی ہے۔ "ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انھیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانہ کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی ۱۰: ۵۔ ۷) اس نے جواب میں کہا کہ بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس بھیجا نہیں گیا۔" (متی ۱۵:۲۴) تقریباً دو ہزار سال کی کلیسا کی ساری ملمع سازیوں کے بعد بھی آج بھی خود مسیحی فاضلوں کو اقرار ہے کہ تبلیغ نصرانیت کی یہ عالمگیری ایجاد بندہ ہے ورنہ خود حضرت مسیحؑ کے ہاں اس تعلیم کا پتہ نہیں۔ مسیح نے اسرائیل کے باہر اپنے مرید تلاش نہیں کیے (انسائیکلوپیڈیا جلد طبع چہارم) اور مسیح تو مسیح حواریوں تک کا بھی خیال نہ تھا۔" (جلد ا ص ۵۸۲)

وہ صرف موسوی شریعت کی تجدید کے لیے آئے تھے اور تورات کے مصدق تھے۔ مولانا نے اس کو واضح کیا اور انجیل سے بھی اس قسم کی تصریحات نقل کی ہیں (جلد ا ص ۵۸۵)

انجیل

مولانا کے نزدیک قرآن مجید کی اصطلاح میں توریت کی طرح انجیل بھی آسمانی کتاب کا نام ہے جس کی قرآن تصدیق کرتا ہے اور بار بار یہ کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ پر یہ وحی یا الہام کی گئی تھی۔ لیکن اب یہ کتاب دنیا کی نظروں سے معدوم ہے[1] عہد نامہ جدید کو عوام انجیل کا مرادف سمجھتے ہیں جو موجودہ بول چال میں چند صحیفوں کے مجموعہ کا نام ہے جس کو نہ عیسائی کتاب الٰہی مانتے ہیں اور

---

[1] مولانا نے آئندہ کے کسی اسلامی محقق کو اس کی دعوت دی ہے کہ وہ پتا لگائے کہ یہ آسمانی کتاب کیا ہوئی اور کب اور کیسے غائب ہوگئی۔ (تفسیر ماجدی ج ۲ ص ۲۶۳، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ)

نہ غیر عیسائی۔ مولانا کے بقول مسیحی صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ مجموعہ حواریوں کے دور میں بلا ارادہ اور بلا توقع تیار ہو گیا۔ (انسائیکلوپیڈیا) بلکہ یہ حضرت عیسیٰ سے متعلق مجہول الحال لوگوں کی جمع کی ہوئی روایتوں، حکایتوں اور ملفوظات پر مشتمل ہے[1]۔ اسی لیے مولانا نے موجودہ انجیل کو موجودہ توریت سے بھی محرف تر اور اس سے کہیں زیادہ مسخ شدہ بنایا ہے[2]۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"خوب سمجھ لیا جائے کہ ایسے بے سند مقدس نوشتوں کی تصدیق و توثیق کی ذمہ داری قرآن ہرگز نہیں لیتا اور موجودہ بائبل کا کوئی جزء مسلمانوں پر حجت نہیں"[3]

البتہ برنابا کی انجیل کو اس سے مختلف بتایا ہے جس کے بعض مخطوطات اور مطبوعہ ایڈیشنوں کی نشاندہی بھی فرمائی ہے اور لکھا ہے کہ اس نے مسیحیوں کی انجیل کو اپنے عقائد اسلاف سے بالکل مختلف پاکر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا[4]۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے موجودہ اناجیل کی بعض خامیوں اور تحریفات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہیے۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"مگر ایک لطیفہ یہ ہے کہ موجودہ انجیل میں احکام قانونی کا حصہ بس برائے نام ہے۔ فوجداری اور دیوانی کے بیسیوں باب سرے سے خالی ہیں۔ ان کے بجائے اخلاقی وعظ البتہ ملتے ہیں"[5]

ایک اور لطیفہ ملاحظہ ہو۔ سورہ آل عمران آیات ۳۶، ۳۷ میں حضرت مریمؑ کے بعض مناقب بیان ہوئے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

"عجیب لطیفہ ہے کہ حضرت مریمؑ کے شرف و عظمت کی یہ ساری تفصیلات انجیل میں نہیں، قرآن مجید ہی میں مل رہی ہیں۔ انجیل اس قسم کے جزئیات سے خاموش ہے"[6]

آگے آیت ۴۲ کے نوٹ میں بھی تحریر فرماتے ہیں:

"انجیل میں بھی فضیلت مریمؑ کا ذکر ہے لیکن قرآن مجید سے کہیں ہلکے لفظوں میں"[7]

---

[1] تفسیر ماجدی جلد اول ص ۵۳۶ و جلد دوم ص ۲۶۳ [2] جلد سوم ص ۲۴، نامی پریس ۱۹۷۶ء [3] جلد دوم، ص ۶۰۲ [4] ایضاً ص ۲۶۳ [5] جلد اول ص ۵۶۸ [6] ایضاً ص ۵۰۵

اس سے بڑھ کر مولانا نے انجیل کی غلط بیانی اور تحریف کی جانب بھی توجہ دلائی ہے۔

سورہ آل عمران میں حضرت زکریاؑ کے واقعہ میں اس کا ذکر ہے کہ جب انھیں بیٹے یعنی حضرت یحییٰؑ کے تولد کی بشارت دی گئی تو وہ اس پر متعجب ہوئے اور خدا سے اس کے نشان مقرر کرنے کی درخواست کی۔ اللہ نے یہ نشان مقرر کیا کہ تم لوگوں سے تین دن تک بات نہ کرسکو گے بجز اشارہ کے۔ اس کے برعکس انجیل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضرت زکریاؑ سے کوئی بڑی معصیت سرزد ہو گئی تھی اور اس کی سزا میں ان کی قوت گویائی سلب کرلی گئی تھی۔ مولانا کی حقیقت شناس نگاہ انجیل کی اس غلط بیانی پر پڑ کر رہی۔ وہ پہلے لوقا کے حوالہ سے انجیل کا یہ بیان نقل کرتے ہیں:

"اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا۔ اس لیے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی یقین نہ کیا۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انھوں نے معلوم کیا کہ اس نے مقدس رویا دیکھی ہے اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور وہ گونگا ہی رہا۔" (لوقا ۱: ۲۰-۲۲)

مولانا اس کی تصحیح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"قرآن مجید جو تمام قدیم صحیفوں پر مہیمن یا نگراں و نگہبان ہے اور ان کی تمام غلطیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرتا جاتا ہے یہاں بھی اس نے حسب معمول اپنا فرض ادا کیا اور حضرت زکریاؑ سے یہ بہتان رفع کرکے صحیح صورت حال یہ بیان کی کہ ایک غیبی و اعجازی علامت کی تو انھوں نے خود ہی درخواست کی تھی اور ان کی اس درخواست پر یہ علامت غیبی عطا ہوئی تھی کہ آپ تسبیح و ذکر الٰہی تو اپنی جگہ پر بدستور کرتے رہیں گے البتہ لوگوں سے بات چیت کی قوت آپ کو تین دن کے لیے حاصل نہ رہے گی۔"[1]

اسی سورہ میں حضرت مریمؑ کی والدہ کے نذر ماننے کا ذکر ہے۔ لیکن اس بارے میں انجیل کی تحریف کا حال مولانا کے قلم سے ملاحظہ ہو:

"حضرت مریمؑ کی ولادت سے قبل آپ کی والدہ ماجدہ نے جو نذر نیاز مانی تھی اس کی

---

[1] تفسیر ماجدی جلد اول ص ۵۷

بابت بہت سی تفصیلات قدیم ترین مسیحی نوشتوں میں درج تھیں لیکن بزرگان کلیسا نے جب کانٹ چھانٹ کر کے "مستند" اناجیل اربعہ مرتب کرنا شروع کیں تو ان مضامین اور بیانات کو ان سے خارج کر دیا اور اس کی شہادت آج انھیں کے اکابر دے رہے ہیں ملاحظہ ہو کیتھولک ڈکشنری ص۲۸۳ وغیرہ"۔ لہ

نصرانیت

نصاریٰ کا لفظ نصرانی کی جمع اور (Nazarex) کا معرب ہے۔ اس کا انتساب قصبہ ناصرہ کی جانب ہے جو حضرت مسیحؑ کا آبائی وطن تھا اور جس کی مناسبت سے وہ "یسوع ناصری" کہلاتے تھے۔ جو لوگ اسے نصرت سے مشتق مانتے ہیں مولانا کے نزدیک ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ ان کے لفظوں میں:

"حضرت مسیحؑ کے سچے پیرو، نبی کو ماننے والے ابتدائی زمانے میں (Nazareme) کہلاتے تھے۔ یہ توحید کے قائل تھے اور بجائے اناجیل اربعہ کے صرف انجیل متّی کو مانتے تھے۔ آگے چل کر یہی لوگ ایبونیہ (Ebonites) بھی کہلائے۔ چنانچہ جب خود پولوس پر عدالت میں الزام لگا تو وکیل ترطلس نے اسے فرقہ ناصریہ کا فرد کہہ کر اپنی تقریر میں پیش کیا۔ مسیح کے ساتھ لفظ ناصری کا استعمال اعمال اور خود انجیل متّی میں بھی ہوا ہے"۔ ٢ه

دراصل نصاریٰ توحید کے قائل اور سلسلہ وحی و نبوت پر ایمان رکھتے تھے مولانا کے خیال میں:

"حضرت ابراہیمؑ کی توحید خالص پر یہود و نصاریٰ سب ہی متفق تھے مگر عملاً ان کی روش چھوڑے ہوئے تھے۔ گویا توحید، سلسلۂ نبوت اور اجزائے آخرت کے عقائد میں کم از کم اصولی طور پر تو مسلمانوں سے متحد ہیں"۔ ٣ه

مولانا کے نزدیک قرآنی اصطلاح میں اہل کتاب کا لفظ مومنین اور مشرکین کا درمیانی درجہ رکھتا ہے اور اس کا اطلاق یہود و نصاریٰ پر ہوتا ہے جو اصلاً توحید و نبوت و معاد کے قائل تھے

لہ تفسیر ماجدی جلد اول ص ۵۶۶ ٢ه ایضاً ص ۱۲۴ طبع دوم جمال پرنٹنگ پریس دہلی

اور آسمانی صحیفے بھی اپنے پاس رکھتے تھے گو معنوی اور لفظی تحریفات کے لحاظ سے بالکل مسخ شدہ اور قرآن کے منکر تھے۔ گویا نفس سلسلہ وحی کے قائل تھے[1]

مولانا نے نصاریٰ کے دین کو بھی یہود ہی کے دین کی طرح سرتاسر محرف و باطل بتایا ہے اور دونوں کی ملت کو زیغ و باطل کی ایک شکل قرار دیا ہے[2] فرماتے ہیں کہ ان کے ہاں کیا رکھا ہے بجز تحریفات کے۔ مولانا نے ان کے زیغ و ضلال اور بعض بدعات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مثلاً وہ ظہور اسلام کے وقت یہود کی طرح کہتے تھے کہ اس نئے دین کے قبول کرنے کی ضرورت کیا، نجات تو ہمارے دینوں کے ساتھ وابستہ ہے[3] دونوں حضرت ابراہیمؑ کو یہود و نصرانی کہتے تھے۔ یہود و نصاریٰ آپس میں ایک دوسرے کے متعلق کہتے ہیں کہ "ان کے دین کی کوئی بنیاد نہیں ہے" مولانا کے خیال میں یہودی قوم عقیدتاً بہرحال موحد تھی۔ نصرانیت کا شرک اور الوہیت کی تثلیث وہ برداشت ہی نہ کر سکتی تھی اور نہ اس کی قائل ہو سکتی تھی کہ ایسے گڑھے ہوئے دین میں کچھ بھی صداقت ہے[4]

ابن اللّٰہیت کا تصور

یہود و نصاریٰ دونوں اپنے کو ابناء اللہ واحباءہٗ (خدا کے لاڈلے اور اس کے محبوب) کہتے تھے اور یہود حضرت عزیرؑ کو اور نصاریٰ حضرت مسیح کو ابن اللہ کہتے تھے۔ مولانا پوری وضاحت سے بیان کرتے ہیں کہ:

> "عربی میں ابن اور ولد دو الگ الگ مفہوم رکھنے والے لفظ ہیں، اردو کے لڑکے اور بیٹے کے مرادف اور انگریزی میں بھی ان کے مقابل بائبل کی مذہبی اصطلاحیں (Son of God) اور (Child of God) کی الگ الگ ہیں۔ ابن اللہ جو ترجمہ ہے (Child of God) کا، اس سے مراد صلبی یا حقیقی فرزند نہیں بلکہ خدا کا لاڈلا یا چہیتا فرزند معنوی و مجازی ہے۔ جیسے قرآن ہی میں ایک دوسری

---

[1] تفسیر ماجدی جلد اول ص ۱۸۹ طبع دوم جمال پرنٹنگ پریس دہلی [2] تفسیر ماجدی جلد اول ص ۲۱۰ و ۲۱۱ [3] ایضاً ص ۱۹۶ [4] ایضاً ص ۱۹۸

جگہ اہل کتاب ہی کی زبان سے استعمال ہوا ہے (قالوا نحن ابناء اللہ واحباءہٗ) یہاں ابناء اللہ کے کھلے ہوئے معنی ہی مجازی و معنوی اولاد کے ہیں۔ یہودی اسی معنی میں حضرت عزیرؑ کو اپنا مطاع کل اور بارگاہِ حق میں محبوب مطلق مانتے تھے۔"

مولانا شیخ رشید رضا مصری کے حوالہ سے بتاتے ہیں:

"لفظ ابن اللہ ان لوگوں کی کتابوں میں مرادف ہے حبیب اللہ کے۔ یعنی اللہ ان کے ساتھ وہ تعلق رکھتا ہے جو باپ کو بیٹے سے ہوتا ہے۔ شفقت و لطف و کرم کا اور اس لیے احباؤہ کی اس پر عطف بہ طور تفسیر و توضیح کے ہے۔"

مولانا کے نزدیک یہود و نصاریٰ کے اس قول کا حاصل یہ ہے کہ:

"ہم سب اونچی ذات والے اور خاص مقربین حق میں ہیں۔ ٹھیک ویسے ہی دعوے جیسے ہندوستان میں برہمنوں کی اور اپنے کو چندر بنسی اور سورج بنسی کہلانے والے راجپوتوں کی زبان سے سنے جاتے ہیں... اور اسی سے ملتی جلتی ذہنیت خود مسلمانوں کے اندر بھی پیرزادگی، مشائخ زادگی، مخدوم زادگی کے گھمنڈ سے پیدا ہوگئی ہے۔"

مولانا کے نزدیک حضرت مسیح کو خدا کا فرزند مجازی (Child of God) قرار دینا بھی جس کو قرآن نے ابن اللٰہیت سے تعبیر کیا ہے شدید گمراہی ہے جس کو بعض مفسرین کے حوالے سے بھی کفر بتایا ہے، مگر ولد اللٰہیت کا عقیدہ اس سے اشد ہے۔[1]

مسیحیت

نصرانی کے مقابلہ میں مولانا کہتے ہیں کہ مسیحی وہ ہیں جو ایمان اناجیل اربعہ پر رکھتے ہیں۔ مسیح کو خدا کا نبی نہیں خدا کا بیٹا مانتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ان کے قالب میں حلول کر آیا تھا۔ آخرت میں نجات دینے والا خدا کو نہیں مسیح "ابن اللہ" کو یقین کرتے ہیں اور خدائی کو تین اقنوموں میں تقسیم کر کے ایک ناقابل فہم فلسفہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہر اقنوم بجائے خود ایک خدا

---

[1] تفسیر ماجدی جلد دوم ص ۲۱۶ و ۲۱۷ و ۲۲۴، و ۲۲۵۔

ہے اور تینوں اقنوم مل کر بھی ایک ہی خدا بنتے ہیں۔ وہ اس کو کھلا ہوا شرک بتلاتے ہیں[1]

ان ہی مسیحیوں نے اللہ کو ثالث ثلاثہ اور ان اللہ ہو المسیح ابن مریم کہا ہے۔ ان کے ان اقوال کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے مولانا تثلیث کے گورکھ دھندے اور اقانیم ثلاثہ کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے اسے کھلا ہوا شرک بتاتے ہیں اور مولانا خود مسیحیوں کے الفاظ میں ان کی تثلیث کی حقیقت حسب ذیل بتاتے ہیں :

"باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح قدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود اور روح قدس غیر محدود۔ باپ ازلی، بیٹا ازلی اور روح قدس ازلی۔ یوں ہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق تو بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق ہے۔ ویسا ہی باپ خدا، بیٹا خدا اور روح قدس خدا۔ بس بھی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا"۔[2]

سورہ مائدہ آیات ۷۲، و ۷۳، میں مسیحیوں کی جانب کفر کی نسبت کی گئی ہے۔ مولانا کے نزدیک ان کے کافر بلکہ مشرک ہونے پر یہ صاف نصوص موجود ہیں۔ مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ باپ، بیٹا، روح القدس یہ تین اقنوم (اصل) منفرداً بھی خدا ہیں اور مجتمعاً بھی، تینوں الگ الگ بھی خدا ہیں اور تینوں مل کر بھی[3]

قرآن مجید نے اس گورکھ دھندے کی جانب ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ کہہ کر متوجہ کیا ہے۔ مولانا کا حقیقت نگار قلم اس پر یہ حاشیہ آرائی کرتا ہے :

"اور اس طرح کے خرافات میں برابر پڑے ہوئے ہیں کہ" باپ بیٹا اور روح القدس تین جدا جدا اور مستقل اقنوم ہیں"۔ عالم لاہوت میں تینوں کی وحدت ایک ہی خدا ہے تین خدا نہیں۔ بیٹا ازل ہی میں باپ سے ہوا ہے اور روح القدس کا صدور بھی ازل ہی میں باپ سے ہوا ہے۔ روح القدس کا صدور اکیلے باپ سے نہیں بلکہ بیٹے سے بھی ہوا ہے۔

---

[1] تفسیر ماجدی جلد ۱ ص ۲۴۴ [2] ایضاً جلد ۲ ص ۱۰۱، و ص ۲۱۴ [3] ایضاً ص ۲۹۳

خدا ہونے میں تینوں اقنوم برابر کے شریک ہیں۔ ایک ایک پورا اور باقی دونوں اپنی اپنی جگہ جزوی حصہ دار ہیں۔ یہاں ترکیب سے وحدت پیدا ہوتی ہے اور وحدت کا نام ہی ترکیب ہے۔ اقنوم وجود باپ ہے، اقنوم حیات بیٹا اور اقنوم علم روح القدس ہے۔ یہ صرف چند عقیدے بطور نمونہ مسیحیوں کے اسرار الہیات سے پیش کیے گئے ورنہ اسی طرح اور بھی بہت ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ ایک طرف میرے صاف سادہ اور ہر شخص کی سمجھ میں آجانے والے بیان توحید کو دیکھو اور دوسری طرف الفاظ واصطلاحات کے اس گورکھ دھندے پر نظر کرو۔ امام رازی نے سچ کہا جب یہ کہا کہ اس سے بڑھ کر مہمل ونامعقول عقیدے دنیا کے پردہ پر کسی کے نہ ہوں گے"۔[1]

سورہ مائدہ میں ایک جگہ مسیحیوں کو مخاطب کر کے قل أتعبدون من دون الله الخ کہا گیا ہے۔ اس کے متعلق بھی مولانا کا خیال ہے کہ ان کے مشرک ہونے پر نص قرآنی کی مہر لگا رہا ہے، اور فرماتے ہیں کہ ان کی مشہور وضخیم مستند انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں ایک جگہ فخر کے ساتھ درج ہے کہ کلیسا نے اپنی طویل تاریخ میں "کبھی ایسا نہیں کیا کہ خدا کے ساتھ ساتھ مسیح سے بھی دعا نہ کی ہو۔"[2]

دراصل نصرانیت حضرت مسیحؑ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک اور قالب میں تبدیل ہو گئی، اب وہ تو ناپید ہے اور جو مسیحیت اس وقت دنیا میں رائج ہے اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ مختلف قوموں اور ملتوں کے مذاہب وعقائد کا ایک ملغوبہ ہے۔ قرآن مجید نے ایک موقع پر ان ہی لوگوں کو اس طرح مخاطب کیا ہے:

ولا تتبعوا اهواء قوم قد ضلوا من قبل واضلوا كثيرا وضلوا عن سواء السبيل (مائدہ، ۷۷) اور ان لوگوں کی من مانی باتوں پر نہ چلو جو پہلے (خود بھی) گمراہ ہو چکے ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور راہِ راست سے (بہت) بھٹک چکے ہیں۔

اس پر مولانا کا یہ فاضلانہ حاشیہ پڑھنے کے لائق ہے:

"جو لوگ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں اور خود فرنگیوں کی موجودہ

---

[1] تفسیر ماجدی جلد ۲ ص ۲۹۵ و ۲۹۶ [2] ایضاً ص ۲۹۶ بحوالہ انسائیکلو پیڈیا جلد ۱ ص ۱۰۴

نقدیات بائبل سے واقف ہیں۔ وہ قرآن مجید کے اس بیان پر عش عش کر جائیں گے، پہلی صدی عیسوی کا ایک عرب امی لاکھ ذہین و باخبر ہو ان اہم تاریخی حقائق پر نظر ڈال سکتا تھا تاوقتیکہ عالم الغیب والشہادۃ براہ راست اسے تعلیم نہیں دے دیتی۔ مسیحی مذہب میں یونانیوں کا شرک پوری طرح حلول کر آیا تھا۔ یونان کے بڑے بڑے فلسفی سقراط، افلاطون وغیرہ کی "عقلیت" و "روشن خیالی" سے مرعوب و متاثر تھے۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیم جب شروع شروع پھیلی تو ان ہی یونانیوں میں اکابر یہود (مثلاً فایلو) پہلے ہی سے یونانیوں سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے اور ان سے Logos وغیرہ کے عقائد اخذ کر چکے تھے۔ مسیحیوں نے ان تعلیمات کو بلا تامل قبول کر لیا اور پھر پولوس (سینٹ پال) نے تو حضرت مسیحؑ کے مذہب اور تعلیم کو تمام تر مسخ کر کے اسے یونانی شرک کی ایک شاخ بنا دیا۔ آخر میں رہی سہی کسر رومیوں کے مشرکانہ عقائد و خرافات نے پوری کر دی۔ موجودہ مسیحی قوموں کے عقائد و رسوم کثرت سے مصری، یونانی اور رومی شرک ہی کا ایک مخلوطہ ہیں۔[1]

مسیحیوں کے عقیدہ ولد اللّٰہیت اور ابن اللّٰہیت کو بھی مولانا محض ان جاہلی مشرک قوموں کی تقلید بتاتے ہیں جو باری تعالیٰ کی تجسیم کی قائل اور عقیدہ حلول یا اوتار کو مانتی تھیں چنانچہ ارقام فرماتے ہیں:

"اشارہ خاص مشرکین یونان کی جانب ہے کہ انھیں کے حکما و فلاسفہ کے اقوال سے پہلی صدی عیسوی کے یہود و نصاریٰ دونوں ہی متاثر ہو گئے تھے اور ان کی مشرکانہ تعلیمات کو برابر اپنے عقائد کا جزو بناتے چلے گئے۔ مسیحیت پر یونانی اور رومی مذہبوں کے گہرے اثر کی دریافت انیسوی صدی کے نصف آخر کے فاضل محققوں کا خاص کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے صدیوں قبل جب کوئی نام بھی بائبل کی نقدیات کا نہیں جانتا تھا ایک امی کی زبان سے دنیا کو اس حقیقت سے آشنا کر دیا۔"[2]

غرض مولانا کے نزدیک موجودہ مسیحیت سرتاپا پولوسیت ہے اور تمام تر پولوس (Paul)

---

[1] تفسیر ماجدی جلد ۲ ص ۲۹، [2] ایضاً ص ۲۵۔

رسوسی کی تعلیمات پر مبنی ہے جو حضرت مسیحؑ کے کچھ ہی روز بعد شروع ہو گئی تھی اور نصرانی اس ے بالکل منکر تھے[۵۱] اور جب ان کی نصرانیت بھی زیغ و ضلال اور کفر و شرک کی آمیزش سے ک نہیں تو تثلیثی مسیحیت کا کیا حال ہو گا۔ بہت اختصار سے اس کو بھی پیش کرنا مناسب ہو گا۔

مولانا مشرک قوموں کے اس عام مرض کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوؤں و، اس کے نائبوں اور رسولوں کو خود معبود سمجھ بیٹھتی ہیں۔ مسیحیوں کے بارے میں بھی انھوں نے تایا ہے کہ مصری، یونانی، رومی مشرکوں اور مشرک فلاسفہ سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے پیمبر رحق کو بھی مظہرِ خدا یا فرزند خدا کا درجہ دے دیا تھا۔[۵۲]

مولانا مسیحیت کی دو گمراہیاں بتاتے ہیں۔ ایک شدید اور دوسری شدید تر، جو حضرت مسیحؑ و اللہ کا ولد (Child of God) قرار دینا ہے۔ قرآن مجید نے اکثر مواقع پر اس کا ذکر بہت خت وعید کے ساتھ کیا ہے۔ اسی ضمن میں مولانا نے ان کی یہ گمراہی بھی بتائی ہے کہ وہ حضرت سیح کو ولد اللہ اور ابن اللہ قرار دینے ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ایسا مطاع مطلق سمجھتے تھے و بالکل اور براہ راست اللہ تعالیٰ کے مساوی اور ہم رتبہ تھا۔ اس طرح حضرت مسیح کی مطاعیت پ اور کلیسا کے برخلاف اصلاً اور مستقلاً مانتے تھے۔ اسی لیے قرآن مجید میں اس کا بیان بھی علاحدہ وا ہے۔ احبار و رہبان کو اَرْبَابًا مِّن دُونِ اللہِ قرار دینے کی حقیقت مولانا نے یہ بیان کی ہے:

> "یعنی انھیں مستقلاً ایسا صاحب اختیار مان رکھا ہے گویا معبود اور رب ہیں جو چاہیں جائز کر دیں، جو چاہیں وہ حرام ٹھہرا دیں۔ سارے اختیارات شریعت و قانون سازی کے گویا انھیں کو حاصل ہیں۔ مسیحیوں کے یہاں فرقہ کیتھولک میں پوپ (پاپائے روم) بہ حیثیت نائب مسیح آج بھی سارے اختیارات علانیہ رکھتا ہے اور فرقہ پروٹسٹنٹ نے بھی عملاً سارے اختیارات کلیسا (Church) کو دے رکھے ہیں۔"[۵۳]

تثلیث اور اقانیم کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مولانا نے موجودہ مسیحیت کی متعدد شاخوں کا یہی علا ہوا مشرکانہ عقیدہ بتایا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیائے مسیحیت کی ایک بڑی

۵۱؎ تفسیر ماجدی جلد ۱ ص ۱۹۶ ۵۲؎ ایضاً جلد ۲ ص ۱۷۰ ۵۳؎ ایضاً ص ۲۶

آبادی کے نزدیک حضرت مریمؑ بھی شریک الوہیت اور لاکھوں بلکہ کروڑوں مسیحیوں کے اعتقاد میں مرتبہ خدائی پر فائز ہیں۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"مسیح پرستی تو خیر موجودہ مسیحیت کے مرادف ہے لیکن مریم پرستی بھی مسیحی دنیا کا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں۔ دعائیں اس خدا کی کنواری کو مخاطب کر کے کی جاتی ہیں نذریں اور نیازیں ان کے نام پر کی جاتی ہیں کیتھولک گرجاؤں میں قدآدم تصویریں ان کی لگی رہتی ہیں جن کے آگے مراسم پرستی بجالائے جاتے ہیں۔" [1]

ان کی ملائکہ پرستی پر بھی مولانا نے روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

"مسیحیوں کی تثلیث تو ایک معلوم و معروف حقیقت ہے لیکن یہ کمتر لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ملائکہ پرستی بھی ان کے ہاں زوروں پر رہ چکی ہے اور صدیوں تک یہ تعلیم ان کے ہاں جاری رہی ہے کہ "خدا نے انسانوں اور آسمانوں کے نیچے ساری چیزوں کے انتظامات تمام تر فرشتوں پر چھوڑ رکھے ہیں" نیز یہ کہ "خدا کائنات کی صرف کلی ربوبیت کرتا ہے، باقی جزئیات سب ملائکہ کے حوالے ہیں"۔ مسیحیت کی تاریخ ملائکہ کی باضابطہ عبادت و پرستش سے بھی نا آشنا نہیں، ان کی مورتیاں تک ان کے یہاں پوجی گئی ہیں۔" [2]

مسیحیت کے ان مشرکانہ عقائد و اعمال کی بنا پر مولانا دریابادی کا خیال ہے کہ تثلیثی مسیحیت کا ذکر قرآن مجید نے محل مدح میں ایک موقع پر بھی نہیں کیا ہے بلکہ ہمیشہ ملامت اور بیزاری کے ساتھ کیا ہے۔

نصرانیت اور مسیحیت کا فرق

سطور بالا سے خود ہی ظاہر ہو گیا کہ ان دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ قرآن مجید نے جہاں بھی نصاریٰ کا تذکرہ کیا ہے اس سے موجودہ مسیحی مراد نہیں ہیں، ان کے ذکر کے لیے اس نے دوسرا پیرایہ بیان اختیار کیا ہے جس کی مولانا نے اپنی تفسیر میں حسب موقع وضاحت فرما دی ہے

---

[1] تفسیر ماجدی جلد ۲ ص ۳۴۳ [2] ایضاً جلد ۱ ص ۶۱۰

مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :

"خوب خیال کرلیا جائے کہ قرآن مجید النصاریٰ اوران صریح کافروں بلکہ مشرکوں کے درمیان فرق کرتا ہے، ان لوگوں کا ذکر نام کے ساتھ نہیں صرف صفات کے ساتھ کرتا ہے اور انھیں الگ الگ مستقل امت قرار دیتا ہے"۔[1]

سورہ بقرہ میں جہاں پہلی دفعہ نصاریٰ کا لفظ آیا ہے وہاں انھوں نے اس طرح متنبہ کیا ہے کہ قرآن یہاں ذکر مسیحیوں کا نہیں نصاریٰ کا کر رہا ہے اور اس کا ہر ہر لفظ پر حکمت ہوتا ہے۔ چونکہ اس فرق کو نظر انداز کر دینے سے قرآن کا مفہوم پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا اس لیے مولانا نے عموماً اس طرح کے مواقع پر بار بار اس کی صراحت کی ہے۔ سورہ مائدہ میں جہاں آپ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ آپ یہود اور مشرکین کو ایمان والوں کے ساتھ سب سے بڑھ کر دشمنی رکھنے والے پائیں گے اور ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں سب سے زیادہ قریب انھیں پائیں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ مسیحیوں کے موجودہ طرز عمل کی بنا پر آیت پر اشکال متعدد وارد ہوئے ہیں۔ ایک عام جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں مراد صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر عیسائی ہیں لیکن حضرت مولانا کے بقول بنیادی اشکال آیت میں مسیحی یا عیسائی سرے سے مراد ہی نہیں بلکہ نصاریٰ سے مراد نصاریٰ ہی ہیں جو کہ حضرت عیسیٰؑ کو نبی ماننے والا نہ کہ انھیں ابن اللہ قرار دینے والا ایک قدیم فرقہ ہوا ہے اور اس کا شمار ہزار ڈیڑھ ہزار سال سے ارباب کلیسا ملحدوں میں کرتے رہے ہیں[2]۔ قرآن مجید نے ان لوگوں کے مسلمانوں سے نسبتاً قریب تر ہونے کی دو وجہیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں علم دوست، شب بیدار علماء اور تارک الدنیا درویش ہوتے ہیں، دوسرے ان کے قلوب میں تواضع کی نرمی ہوتی ہے۔ مولانا کے نزدیک ان دو وجہوں نے اس حقیقت کو اور زیادہ روشن و موکد کر دیا کہ مراد عام مسیحی خصوصاً فرنگی قومیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ یہاں ان دونوں اوصاف کا قحط ہے۔[3]

ایک اور موقع پر انھوں نے بتایا ہے کہ اس عقیدہ کو جو کھلا ہوا شرک ہے خوب خیال کر کے

---

[1] تفسیر ماجدی جلد ۲ ص ۲۹۲ [2] ایضاً ص ۳۰۰ [3] ایضاً ص ۳۰۱

دیکھ لیا جائے کہ قرآن مجید نصرانیت سے تعبیر نہیں کرتا، نہ ایسے لوگوں کو نصاریٰ یا اہل الکتاب سے موسوم کرتا ہے[1]۔ وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ یہود اور نصرانیوں کے اعمال کیسے ہی غالیانہ ہوں بہرحال اصلاً وہ لوگ توحید ہی کے قائل ہیں اور سلسلۂ وحی و نبوت کے ماننے والے اور عقائد کے باب میں یہی دو عنوانات اہم ترین ہیں۔ البتہ یہ خیال رہے کہ نصرانیت موجودہ یوروپی قوموں کی مسیحیت کے مرادف نہیں[2]۔

مولانا فرماتے ہیں کہ مشرکانہ عقائد کے زور نے اصل مسیحیت حلولیت اور تثلیث کو قرار دے دیا ہے جس کی وجہ سے نصرانیت کا ستارہ گردش میں آگیا اور نصرانی و نصرانیت کے الفاظ بجائے عزت و تکریم کے تحقیر کے موقع اور ذم کے محل میں استعمال ہونے لگے۔ ظہور اسلام کے وقت اس فرقہ کا زور ٹوٹ چکا تھا تاہم اس کے کچھ آثار تو باقی ہی رہ گئے تھے[3]۔

راقم کے خیال میں نصرانیت اور مسیحیت کی تفریق کی وضاحت میں مولانا سے دو فروگزاشتیں ہوگئی ہیں۔ ایک طرف تو مولانا نے نصاریٰ کے بجائے مسیحیوں کے مشرک ہونے پر زور دیا ہے، دوسری طرف بعض علماء کے حوالہ سے خود نصاریٰ کا کافر ہونا دکھایا ہے۔ لیکن مجھ ناچیز کے خیال میں قرآن نے نصاریٰ کے کفر کی کوئی صراحت نہیں کی ہے۔ ان کے جس عقیدہ ابن اللّٰہیت کا ذکر قرآن میں ہے وہ خود مولانا ہی کی تحقیق کے مطابق (Child of God) کے معنی میں ہے اور ولد اللّٰہیت (Son of God) کے مفہوم میں نہیں ہے جو مولانا کے بیان کے مطابق اول الذکر سے اشد ہے اسی لیے خود قرآن مجید نے اسے صراحتاً کفر کہنے کے بجائے **یضاھئون قول الذین کفروا** کہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی یہ بات کافروں کے قول و عقیدہ کے مشابہ ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ قرآن مجید نے جس طرح نصاریٰ کے بارہ میں یہ کہا ہے کہ وہ حضرت مسیحؑ کو خدا کا ابن کہتے تھے اسی طرح یہود کے بارے میں بھی کہا ہے کہ وہ حضرت عزیرؑ کو ابن اللہ مانتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر نصاریٰ کافر ہوئے تو یہود بھی کافر ہوئے۔ اب رہیں وہ آیتیں جن میں کہا گیا ہے کہ **لقد کفر الذین قالوا ان اللّٰہ ثالث ثلاثۃ** یا **لقد کفر الذین قالوا ان اللّٰہ**

---

[1] تفسیر ماجدی جلد ۲ ص ۲۱۴ [2] ایضاً ص ۱۹۰ [3] ایضاً ص ۳۰۱ و جلد ۱ ص ۱۲۵

ہو المسیح بن مریم تو اس سے خود مولانا کے بیان کے مطابق نصاریٰ نہیں مسیحی مراد ہیں جن کی قرآن نے کہیں تعریف نہیں کی ہے بلکہ موقع مدح میں نصاریٰ کا ذکر کیا ہے۔ رہا شرک تو اس سے نہ یہودی پاک تھے اور نہ نصرانی اور جس سے مسلمانوں کے بھی بعض فرقے خالی نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود مولانا فرماتے ہیں کہ یہ دونوں اہل کتاب تھے جو مشرک و مومن کے درمیان کی ایک قرآنی اصطلاح ہے۔

مولانا سے دوسرا تسامح یہ ہوا ہے کہ وہ نصاریٰ اور موجودہ مسیحیوں میں فرق کرتے ہیں جو بالکل بجا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں ایک جگہ مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ سے ترک موالات کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعضهم اولیاء بعض (ان میں سے بعض بعض کا دوست ہے) مولانا اس کی تشریح میں لکھتے ہیں :

"یہودی یہودی اور نصرانی نصرانی تو باہم دوست ہوتے ہی ہیں باقی خود یہود و نصاریٰ کے درمیان بھی بہت کچھ مناسبت ہے۔ کم سے کم یہی کہ اسلام اور مسلمانوں کی عداوت پر دونوں متحد ہیں۔ ان کے آپس میں اگر تمھارے خلاف سازباز ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں لیکن تم جو اہل ایمان ہو تم میں اور منکرین قرآن میں مناسبت ہی کیا اور اشتراک کیسا"

یہاں تک تو مولانا کی بات میں مجھے کوئی اختلاف نہیں مگر آگے فرماتے ہیں :

"آج جب یہ سطریں پہلی بار لکھی جارہی ہیں (جمادی الثانی ۱۳۶۵ھ مئی ۱۹۴۶ء) فلسطین کی سرزمین پر ایک اسرائیلی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کے سلسلے میں مسلمانوں کے خلاف یہود اور نصرانی قوموں کا سازباز قرآن مجید کی اس پیش خبری کی معجزانہ تصدیق پیش کر رہا ہے اور پھر اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز اور دنیا کو دنگ کر دینے والی مثال یہودی نصرانی اتحاد کی اواخر ۱۹۶۴ء میں پیش آئی جب یہود نے اپنا تبری نامہ قتل مسیحؑ کی ذمہ داری سے متعلق پیش کیا اور دنیائے مسیحیت کے پیشوائے اعظم نے اسے انجیلوں کی واضح ترین اور بار بار کی دہرائی ہوئی شہادتوں کے باوجود قبول کر لیا"۔[1]

---

[1] تفسیر ماجدی جلد ۲ ص ۲۷۱

مولانا خود ثابت کر چکے ہیں کہ نصرانی عہد رسالت ہی میں قریب قریب ختم ہو چکے تھے اور بعد میں یکسر، تو ۱۹۴۶ء میں انھوں نے یہودیوں سے ساز باز اور اتحاد کیسے کر لیا۔ ساز باز اور اتحاد کرنے والے یقیناً مسیحی ہیں نہ کہ نصرانی۔ زیادہ سے زیادہ ان کو نصاریٰ کے بقایا کہا جا سکتا ہے۔

مسیحیت کی تردید

مولانا نے نصرانیت و مسیحیت کے ان باطل مزعومات کی تردید جا بجا اپنی تفسیر میں کی ہے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

عقیدہ کفارہ

سورہ فاتحہ میں خدا کو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہا گیا ہے۔ اس سے جہاں مختلف مشرک قوموں کے عقیدہ قانون مکافات عمل کی تردید ہوتی ہے وہاں مسیحیوں کا یہ اعتقاد بھی باطل ہو جاتا ہے کہ "خدا انصاف کرنے پر مجبور ہے اور اسی لیے صفت غفور و رحیم کے اظہار کے لیے اسے اپنے اکلوتے "بیٹے" کو بطور کفارہ کے سب گناہ گار مخلوق کی طرف سے پیش کرنا پڑا" مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کے ایک لفظ 'مالک' میں ان سب باطل عقائد کی تردید آ گئی۔ اسے اختیار کامل ہے کہ جس مستحق سزا کو چاہے سزا دے اور جس مجرم کو چاہے بعد سفارش یا بلا سفارش بالکل ہی معاف کر دے[1]۔ قرآن مجید میں اس طرح کی آیتیں کئی ہیں کہ "قیامت کے دن نہ کسی کے حق میں سفارش قبول ہوگی اور نہ کسی سے معاوضہ قبول کیا جائے گا۔"

ان آیتوں سے عقیدہ شفاعت اور کفارہ پر پوری ضرب لگتی ہے۔ شفاعت اور شفیع مستقل کے اس مبالغہ آمیز تخیل نے مسیحیت میں آ کر انتہائی شکل اختیار کر لی اور بقول مولانا کفارہ ہی کی طرح شفاعت پر مسیحیت کی بنیاد ہے[2]۔

سورہ یونس آیت ۳ میں فرمایا کہ "کوئی بھی شفاعت کرنے والا نہیں ہے مگر ہاں بعد اللہ کی

---

[1] تفسیر ماجدی جلد ا ص ۸ [2] ایضاً ص ۹۵

اجازت کے "۔ مولانا کی تشریح یہ ہے کہ مستقل منصب شفاعت رکھنے والا (Mediator) کوئی بھی نہیں ہاں اللہ ہی اپنے جس کسی مقرب و مقبول بندہ کو جس حد تک اور جن حالات میں جس کے لیے چاہے اجازت شفاعت دے دے۔ تو اصل اور مقدم شے شفاعت نہیں بلکہ اذن شفاعت ہوئی۔ "اذن" کے لفظ نے پورا یہ مفہوم ادا کر دیا کہ اصل حاکم، منصف و مختار تو بس وہی ہے۔ شفاعت ہونے دینا اور نہ ہونے دینا سب اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس میں جاہلی مشرک قوموں کے علاوہ پوری تردید مسیحیت کی بھی آگئی جس کا سارا دارومدار عقیدہ شفاعت و کفارہ ہے۔ پس ایک مستقل بالذات شافع کا عقیدہ مولانا کے نزدیک اسلامی نہیں تمام تر ایک مسیحی عقیدہ ہے۔[1]

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس: ۱۸) یعنی یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں، میں مولانا کے نزدیک تمام مشرک قوموں کے معبودان باطل کی بے حقیقتی اور ان کے اس جھوٹے عذر کا بیان ہے کہ ہم ان دیویوں، دیوتاؤں کو کچھ مستقلاً متصرف فی الکائنات اور خدا تھوڑے ہی مانتے ہیں، ہم تو ان کی حیثیت بس مستقل شفیع کی مانتے ہیں۔ مولانا کہتے ہیں کہ عرب کے مشرکین کی طرح یہی عقیدہ عیسائیوں کا بھی ہے۔ مسیح پرستی کے سلسلے میں تو کھلا ہوا سب کا، اور اولیا پرستی کے سلسلے میں ان کے فرقہ کیتھولک کا، اولیا کو وہ شفعا ہی ٹھہراتے ہیں۔[2]

مولانا فرماتے ہیں کہ مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ ابن اللہ کی حیثیت شافع مطلق کی ہے۔ انسان کے قالب میں انھوں نے اسی لیے تو جنم لیا تھا کہ اپنی جان کا فدیہ سب گنہگاروں کی طرف سے دے کر اور سب کی طرف سے صلیب پر اپنے خون کا چڑھاوا چڑھا کر قیامت میں شافع مطلق کی حیثیت سے ظاہر ہوں اور ان کی شفاعت سب کے حق میں نجات کا حکم قطعی رکھے گی۔[3]

قرآن مجید میں اکثر توبہ قبول کرنے اور اس کی صفات تواب و رحیم کا ذکر ہوا ہے۔ مولانا دریابادی نے اس سے بھی عیسائیوں کے عقیدہ کفارہ کو باطل قرار دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"دنیا کی بہت سی گمراہ قوموں کا یہ عقیدہ رہ چکا ہے اور اب بھی ہے (مثلاً بدھ

---

[1] تفسیر ماجدی جلد ۳ ص ۴۴، ۴۵ [2] ایضاً ص ۴۵ [3] ایضاً جلد ۱ ص ۲، ۴

مذہب والوں کا) کہ خدا کو معاف کر دینے کا کوئی اختیار ہی نہیں، کیونکہ وہ خود قانون مکافات عمل کا پابند ہے۔ مسیحیت بھی اسی اساسی گمراہی میں مبتلا ہے۔ خدا چونکہ از خود کسی کو معاف نہیں کر سکتا اور اپنی رحم دلی کی بنا پر معاف کرنا چاہتا ہے اس لیے اس نے اپنے بیٹے کو سب کی طرف سے بطور کفارہ سزا دے دی اور دوسروں کو معاف کر دیا۔ یہودیت نے بھی خدا کی قہاریت پر اتنا زور دیا کہ اس کی رحمت و رحمانیت کی تصویر بالکل دھندلی پڑ گئی۔ قرآن مجید نے توبہ و قبول توبہ اور رحمت الہٰی کی وسعت پر بار بار زور دے کر ان ساری گمراہیوں کی تردید کر دی۔" (جلد ا ص ۱۰۴)

سورہ توبہ میں ارشاد ہے کہ" اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہ تواب و رحیم ہے۔" مولانا کے نزدیک اس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ توبہ قبول کرنے کا تعلق تو خدائے تواب و رحیم سے ہے نہ کہ رسول سے، کیونکہ جاہلی قوموں یہاں تک کہ بعض مسیحی فرقوں نے توبہ قبول کر لینے اور گناہ معاف کر دینے کا حق درمیانی واسطوں پادریوں وغیرہ کو دے دیا ہے۔ قرآن مجید ان سب کی نفی کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ یہ قبول توبہ کا اختیار پیمبروں تک کو حاصل نہیں۔ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ (جلد ۳ ص ۱۴ و ۱۵)

شرک کی تردید

سورہ فاتحہ آیت أیاك نعبد وایاك نستعین سے مولانا کے نزدیک ہر قسم کی مظہر پرستی اور مخلوق پرستی، شرک کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ شرک کی خفی سے خفی راہیں بند ہو جاتی ہیں اور کوئی خفیف سی گنجائش بھی پیر پرستی، پیمبر پرستی، فرشتہ پرستی وغیرہ کی باقی نہیں رہتی (جلد ا ص) مسیحیوں کے ہاں نماز میں خواہ وہ جیسی بھی ہو برابر خدا کے ساتھ فرزند خدا کی شرکت رہتی ہے۔ آیت کے ایک لفظ "ایاک" سے بقول مولانا اس کی تردید ہو گئی۔ (ص ۹)

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کو عموماً ابن مریم کہا گیا ہے۔ مولانا کی نکتہ شناس طبیعت نے اس میں بھی رد عیسائیت کا مواد تلاش کر لیا۔ فرماتے ہیں:

"اشارہ ہے کہ عیسیٰ مسیح اپنے پیمبرانہ عظمت کے باوجود محض بشر ہی تھے، ایک

عورت کے بطن سے پیدا، خدا یا مثیل خدا یا فرزند خدا وغیرہ کچھ بھی نہ تھے" (۲ ص ۱۵۵)

مولانا نے دوسری جگہ بتایا ہے کہ اس صراحت، نشاندہی اور پتے ہی سے عقیدہ نصرانیت پر ضرب لگائی ورنہ نام تو اور بھی پیمبروں کے لیے ہیں کہیں ابن فلاں کر کے تعارف نہیں کرایا ہے۔

اسی طرح کا نکتہ ان کو ایدناہ بروح القدس میں بھی نظر آیا فرماتے ہیں کہ حضرت مسیح اپنی بشریت کی بنا پر اعانت خداوندی کے محتاج تھے اور وہ اعانت ایک فرشتہ کے ذریعہ سے کرائی جاتی تھی (تفسیر ماجدی جلد اص ۱۵۵)

وقفینا علیٰ اٰثارھم بعیسی بن مریم سے بھی ان کی الوہیت کی تردید کی ہے۔ (ج ۲ ص ۲۹۲) حضرت عیسیٰؑ کو وجیھا من المقربین اور الا رسول وغیرہ کہا گیا ہے۔ اس سے بھی مولانا ان کی الوہیت کی تردید کرتے ہیں۔

مسیحیوں کے شرک کی ایک قسم ابن اللّٰہیت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کا ایک گروہ اتخاذ ولد کا قائل تھا اس کی تردید مولانا نے بڑی مدلل کی ہے پہلے تو اس کا یہ مفہوم بتایا ہے کہ خدا نے گویا کسی کو متبنیٰ کر لیا ہے پھر فرماتے ہیں کہ:

"مسیحیوں کے ہاں ایک زبردست فرقہ اتخاذیوں کے نام سے گزرا ہے۔ ان کے مرکزی عقیدہ کے لیے اصطلاحی لفظ تبنیت یا اتخاذیت کا ہے۔ عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح خلقۃً خدا نہیں، وہ خدا پیدا نہیں ہوئے، وہ خدا شروع سے بنے بنائے اور خود بخود نہیں ہیں بلکہ اصلاً اور خلقۃً وہ انسان ہی تھے۔ البتہ اقنوم ثالثہ یعنی روح القدس کا فیضان ان پر شروع ہی سے ہونے لگا تھا اس لیے وہ قدوسیت کے ایسے اوج کمال پر پہنچ گئے اور روح الٰہی ان کے اندر ایسی حلول کر گئی کہ اقنوم اول یعنی خدائے برتر واعظم نے انھیں اپنا بیٹا قرار دے کر اپنا متبنیٰ بنا کر شریک الوہیت کر لیا اور اب وہ ربوبیت، مالکیت وغیرہ جملہ صفات الٰہی میں شریک وسہیم ہیں۔ اس عقیدہ کے وجود کی شہادت تاریخ میں ۷۸۵ء میں ملتی ہے۔ آٹھویں صدی میں پاپائے روم نے اسے الحاد و زندقہ قرار دیا۔ بارھویں صدی عیسوی میں اس نے پھر زور پکڑا اور پھر یہ لوگ زندیق قرار پائے" (جلد اول ص ۲۰۴)

سمت پرستی

مسیحی مذہب میں مشرکوں کے اثر سے سمت پرستی بھی داخل ہوگئی تھی۔ مولانا اس کی تردید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"مشرکوں ہی کے اثر سے یہ سمت پرستی کا شرک اہل کتاب میں سرایت کرگیا اور مسیحی مذہب چونکہ عقائد و عبادات دونوں میں اپنے وقت کے رائج و شائع رومی مذہب ہی کا مثنیٰ یا پرتو ہے اس لیے وہ تو کھلم کھلا مشرق پرستی میں مبتلا ہوگیا۔ یہود جنھیں اپنی توحید پر ناز تھا، وہ بھی تمام تر محفوظ نہ رہ سکے۔ بلکہ ان کے بعض فرقے تو پوری طرح اس صف میں آگئے۔ بعض قوموں نے مشرق کے جوڑ پر مغرب کے تقدس کا کلمہ پڑھنا شروع کردیا۔ انھوں نے دیکھا کہ مشرق اگر خطہ حیات کی بنا پر مقدس ہے تو مغرب بھی خطہ موت و دیار ہلاکت ہے۔ شاہ خاور طلوع اگر ادھر سے ہوتا ہے تو روزانہ غروب اور فنا تو ادھر ہی ہوتا ہے، پھر اس کے تقدس کا بھی کیوں نہ قائل ہولیا جائے۔ چنانچہ یہ دونوں سمتیں خوب پجتی رہیں۔ مشرق زیادہ اور مغرب اس سے کچھ کم۔ اصل انگریزی حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔ دنیا کی دنیا اس سمت پرستی کے شرک، اس مشرق پرستی اور مغرب پرستی کی ضلالت میں مبتلا تھی کہ توحید قرآنی نے ساری دنیا کے عقائد کو چیلنج کرکے اس مشرکانہ عقیدہ پر ضرب لگا کے ایک عالم کو چونکا دیا۔ قدیم مذاہب یہ آواز سن کر بھوچکے رہ گئے۔"[1]

مولانا نے آگے یہ بھی بتایا ہے کہ پولوسوی مسیحیوں میں مشرق پرستی رومیوں سے آئی اور عبادت مشرق کی طرف رخ کرکے کرنے لگے۔ ان کے گرجے آج تک مشرق رویہ چلے آرہے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے اس مشرق رخی پر زبردست ضرب لگائی اور بتادیا کہ یہ سمت دار تقدس تو کسی درجہ میں بھی طاعت یا عبادت نہیں[2]

---

[1] تفسیر ماجدی جلد ا ص ۲۰۲ [2] ایضاً ۲۰۲ و ۲۰۳

مسیحی خدا کی صفت قیومیت سے متعلق بھی عجیب گمرہی میں پڑ گئے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے
جس طرح بیٹا بغیر باپ کی شرکت و آمیزش کے خدا نہیں اسی طرح باپ پر بھی بغیر بیٹے کو شریک
خدا کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ گویا جس طرح نعوذ باللہ۔ مسیح ابن اللہ خدا کے محتاج ہیں اسی طرح
خدا بھی اپنی خدائی کے اثبات کے لیے مسیح کا محتاج ہے۔ صفت قیومیت کا اثبات کر کے قرآن نے
مسیحی عقیدہ پر بھی ضرب لگائی ہے۔ (جلد اص ۵،۷)

سورہ نساء میں ایک جگہ فرمایا کہ اللہ ایک ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرے گا اور اگر نیکی ہوگی تو
دوگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے اجر عظیم دے گا۔ آیت میں مِنْ لَّدُنْهُ کا لفظ ہے اس سے
مولانا عیسائیوں کے شرک کی تردید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

> "اسلام کا خدا نہ کوئی خونخوار دیوتا ہے کہ خواہ مخواہ کسی پر ظلم کرے نہ ایسا معذور کہ کسی پر کرم کرنا چاہے بھی تو اپنی صفت عدل کو برقرار رکھنے کے لیے کسی اور پر ظلم اسے کرنا پڑے۔ شرک اور مسیحی شرک کی تردید آیت سے ہو گئی۔" (جلد ۲ ص ۵۹)

خدا کے سامنے پیشی

قرآن مجید کی آیتوں کے آخر میں عموماً والیہ ترجعون یا اس کے ہم معنی کوئی فقرہ
آتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہی کی طرف واپس کیے جاؤ گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ
انسان کو جزا و سزا اور اعمال کی جواب دہی کے لیے براہ راست اللہ تعالیٰ ہی کے حضور پیش ہونا
ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس میں مسیحی مشرکوں کے اس عقیدہ کا رد آگیا کہ حشر میں پیشی مسیح
ابن اللہ کے حضور میں ہوگی (جلد اول ص ۶۱) اسی طرح وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ کہہ کر بھی ان کے اس مزعومہ
کی تردید کی ہے۔

تقویٰ

اسلام نے انسانی زندگی کی بنیاد تقویٰ کو قرار دیا ہے اسی لیے قرآن نے اس پر بار بار زور
دیا ہے۔ مگر مسیحی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے مذہب کی بنیاد خوف خدا پر نہیں بلکہ محبت الٰہی پر ہے

اور ان کے پادری اسے بہت فخر سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ مولانا اس کی تردید میں انجیل کی آیت پیش کرتے ہیں مثلاً:

"اسی سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے" (متی ۱۰: ۲۸)

"اسی سے ڈرو جس کو قتل کرنے کے بعد اختیار ہے کہ جہنم میں ڈالے، ہاں میں تم سے کہتا ہوں کہ اسی سے ڈرو" (لوقا ۱۲: ۵)

فرشتوں کی بغاوت کے مسیحی تصور کا رد

قرآن مجید میں انسان کو اپنا خلیفہ بنانے کا جہاں تذکرہ ہے وہاں فرشتوں کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا الخ اس کو بعض علمائے اسلام نے بطور اعتراض یا گستاخی سمجھا ہے مگر مولانا کہتے ہیں:

"باغی فرشتوں کا تخیل تمام تر مسیحی ہے اور عجب نہیں کہ مسیحیوں کے ساتھ تعلقات قائم ہو جانے سے یہ خیال مسلمان علماء میں سرایت کر گیا ہو۔ فرشتوں کا یہ قول تمام تر وفور نیاز مندی، اقرار وفاداری اور جوش جاں نثاری کا نتیجہ تھا" (جلد اص ۷)

مولانا نے تفسیر میں جا بجا مسیحی افکار و نظریات کی مدلل تردید کی ہے اس کی مثالیں بے شمار ہیں جن کو نقل کرنا مشکل ہے۔ ان کے خیال میں سورہ آل عمران میں خطاب مسیحیوں کی جانب ہے اور اس کا اصل موضوع مسیحیت کی تردید ہے۔ (جلد اص ۵۳۴ و ۵۲۷)

مسیحیوں کی فرقہ آرائی اور گروہ بندی

مولانا نے مسیحیوں کی گروہ بندی اور ان کے متعدد فرقوں کا متعدد جگہ ذکر کیا ہے کہ ان میں بے شمار فرقے پیدا ہو گئے تھے اور اصل نصرانیوں کے بجائے ان ہی گمراہ اور باطل فرقوں کا ہر طرف زور و غلبہ ہو گیا تھا۔ ان کے خیال میں آج بھی ان کے بہ کثرت فرقے موجود ہیں۔ سورہ انعام کی آیت إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (آپ پر ان لوگوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے جنھوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے) مولانا اس کی

یہ توضیح کرتے ہیں :

"لیکن اگر قرائن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف معاصرین پیش نظر رکھے جائیں تو اس تعارف کے مصداق سب سے بڑھ کر مسیحی ہی نکلیں گے۔ ان کے اندر فرقوں اور گروہوں کی تقسیم اور تقسیم کے اندر تقسیم سب سے بڑھی چڑھی ہوئی تھی"

(جلد ۲ ص ۴۸۶)

قرآن مجید کی تائید میں انجیلی بیانات

مولانا کی تفسیر کا یہ نمایاں امتیاز ہے کہ انھوں نے بائبل کے حوالے بہ کثرت دیے ہیں۔ یہ حوالے مختلف اغراض و مقاصد سے پیش کیے گئے ہیں۔ یہاں صرف چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ محرف ہونے کے باوجود انجیل کی بہت سی باتوں سے قرآن مجید کے بیان کی تصدیق و توثیق ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں یہود کی قساوت قلب اور سنگ دلی کا کئی جگہ ذکر ہے۔ مولانا نے اس کی تائید میں انجیل کے یہ حوالے نقل کیے ہیں :

"اس نے ان کی سخت دلی کے سبب غمگین ہو کر اور چاروں طرف ان پر غصہ سے نظر کر کے اس آدمی سے کہا" (مرقس ۳ : ۵) "ان کی بے اعتقادی اور سخت دلی پر ملامت کی" (مرقس ۱۶ : ۱۴) "تو اپنی سختی اور غیر تائب دل کے مطابق اس قہر کے دن کے لیے اپنے واسطے غضب کما رہا ہے" (رومیوں ۲ : ۵) (جلد ۲ ص ۲۰۹)

سورہ آل عمران میں حضرت یحییٰؑ کے وصف حصور اور دوسرے اوصاف کی تائید میں انجیل کا بیان ملاحظہ ہو :

"وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ اور کوئی شراب پیے گا اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا" (لوقا ۱ : ۱۶) "اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا اور وہ انبیا کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راستبازوں

کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لیے ایک مستعد قوم تیار کرے۔" (لوقا ۱: ۱۷، ۱۸)

"اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا اور اسرائیل پر ظاہر ہونے کے دن جنگلوں میں رہا۔" (لوقا ۱: ۸۰)

سورہ توبہ کی آیت ہے کہ یہود و نصاریٰ کو صرف ایک خدا کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا، مولانا نے اس کے ثبوت میں دونوں کی کتابوں کے اقتباسات دیے ہیں۔ انجیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"سب حکموں میں اول کون سا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے اے اسرائیل سن، خداوند ہمارا ایک ہی خداوند ہے۔" (مرقس ۱۲: ۲۹۔ نیز متی ۴: ۱۰۔ لوقا ۴: ۸)

سورہ اعراف کی آیت يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ کے ضمن میں دونوں کتابوں سے متعدد ثبوت پیش کرتے ہیں۔ انجیل کی شہادتیں ملاحظہ ہوں:

"یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" (متی ۲۱: ۴۲۔ ۴۴)

"یسوع مسیح یروشلم کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں جب تک عالم بالا پر سے تم کو خوف کا لباس نہ ملے اس شہر میں ٹھہرے رہو۔" (لوقا ۲۴: ۴۹ (جلد ۲ ص ۱۰۶)

سورہ اعراف میں ارشاد ربانی ہے "ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے جن و انس پیدا کیے۔" مولانا نے اس کی تائید میں تورات و انجیل سے شواہد پیش کیے ہیں۔ انجیلی بیان ملاحظہ ہو:

"خداوند نے ہر ایک چیز اپنے لیے بنائی ہاں شریروں کو بھی اسی نے برے دن کے لیے بنایا۔ (امثال ۱۶: ۴) یہ لوگ بے عقل جانوروں کے مانند ہیں جو پکڑے جانے اور ہلاک ہونے کے لیے حیوان مطلق پیدا ہوئے ہیں ... اپنی خرابی میں خود خراب کیے جائیں گے۔" (۲ پطرس ۲: ۱۲) (جلد ۲ ص ۲۶۰ و ۲۶۱)

حضرت ابراہیمؑ سے متعلق قرآنی فضائل کی شہادت تورات اور انجیل دونوں سے ملتی ہے۔

انجیل میں ہے:

"ابراہیم خدا پر ایمان لایا اور یہ اس کے لیے راست بازی گنا گیا۔ بس جان لو کہ جو ایمان والے ہیں وہی ابراہیم کے فرزند ہیں" (گلیتون ۳:۶، نیز رومیون ۴:۳ (جلد اص ۲۳۲)

اسلام میں مرتد کو جو سزا دی گئی ہے اس پر بڑا اعتراض کیا جاتا ہے۔ مولانا نے توریت سے بھی اس حکم قرآنی کی تائید پیش کی ہے اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس سے بھی ملاحظہ ہو:

"دانستہ ارتداد ناقابل تلافی گناہ ہے قتل اور زناکاری کے درجہ کا" (جلد ۲ ص ۶۲۳)

چنانچہ انگلستان میں ایک چھوٹے پادری نے جب تیرہویں صدی مسیحی میں ایک یہودن سے شادی کے پھیر میں دین نصرانیت کو ترک کر دیا تھا تو اسے آکسفورڈ میں ۱۷ اپریل ۱۲۳۲ء کو جلا دیا گیا" (ایضاً ص ۴۴۴)

سورہ توبہ کی ایک آیت میں کہا گیا ہے کہ "بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے خرید لیا ہے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس کے عوض میں کہ انھیں جنت ملے گی" اس کے بعد فرمایا کہ وعدا علیہ حقا فی التوراۃ والانجیل والقران (توبہ: ۱۱۱) یعنی ہماری طرف سے سچا وعدہ ہے توریت اور انجیل اور قرآن میں۔ اس کی تفسیر میں مولانا نے لکھا ہے کہ:

"قرآن تو اس مضمون کی تکرار سے بھرا پڑا ہے اور قرآن کے ساتھ توریت و انجیل کے ناموں کا اضافہ تاکید بیان کے لیے ہے کہ یہ مضمون اتنا اہم ہے کہ سب ہی کتب آسمانی میں درج ہو چکا ہے" (جلد ۳ ص ۲۳)

مولانا کہتے ہیں کہ توریت کی تحریفات دوست و دشمن سب کو مسلم ہیں اب اس میں اگر کوئی مضمون اس قسم کا نہ ملے جب بھی کوئی مضایقہ نہیں لیکن یہ شاید قرآن کا اعجاز ہی ہے کہ اللہ کی محبت و رضا جوئی کی اہمیت کے مضمون سے موجودہ توریت بھی خالی نہیں۔ چنانچہ اس سے اس کے ثبوت میں اقتباس پیش کرنے کے بعد انجیل کو موجودہ توریت سے بھی محرف تر اور اس سے کہیں زیادہ مسخ شدہ بتاتے ہیں تاہم یہ خدا کی رضا جوئی کی اہمیت کا مضمون اس سے بھی ابھی تک محو نہیں ہو سکا۔ تائیدی اقتباس ملاحظہ ہو:

"جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں سے یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں

کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سَو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا۔"

(متی ۱۹ : ۲۹)

قرآن اور بائبل میں تضاد

جس طرح قرآن مجید کے بہت سے بیانات کی تصدیق بائبل سے ہوتی ہے، اسی طرح بعض جگہ دونوں میں صریح اختلاف و تضاد بھی ہے۔ مولانا نے اس طرح کی بہت سی چیزیں تحریر کی ہیں جس کی متعدد مثالیں انجیل کے زیر عنوان گذر چکی ہیں اس لیے یہاں صرف ایک ہی مثال نقل کی جاتی ہے۔

سورہ یونس میں ایک جگہ ارشاد ربانی ہے "پھر ہم نے ان (پیمبروں) کے بعد موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس" (یونس : ۷۵)، مولانا بتاتے ہیں کہ بائبل میں اس کی تصریح کہیں بھی نہیں کہ ان دونوں پیغمبران برحق نے اپنے پیام توحید کی تبلیغ میں مصریوں کو بھی مخاطب کیا تھا۔ حالانکہ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ جو اللہ کی توحید کا منادی ہو وہ اصلاح عقائد کی کوشش سب سے پہلے ہی مرتبہ پر نہ کرے اور کفر و شرک کی ضلالتوں کو اسی حال پر چھوڑے رکھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہیں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کا جو حصہ نسبتاً محفوظ ہے اس میں بھی کیسے کیسے تغیرات و تصرفات ہو چکے ہیں اور قرآن کس طرح ضروری ضروری موقعوں پر اس کی فروگذاشتوں کی اصلاح کرتا جاتا ہے۔ (تفسیر ماجدی جلد ۲ ص ۹۲)

موجودہ مسیحیت اور مسیحیوں کے خط و خال

تفسیر ماجدی میں دور حاضر کے عیسائیوں کا مرقع بھی جا بجا ملتا ہے۔ مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی۔

قرآن مجید نے اپنی نسبت قدیم جاہلی قوموں کا یہ قول اساطیر الاوّلین (اگلوں کی خرافات) اکثر نقل کیا ہے۔ مولانا کچھ اسی قسم کی رائے جاہلیت جدید یا جاہلیت فرنگ کے پجاریوں کی بھی قرآن کے متعلق بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے بڑے بڑے فاضل محققین بہ کمال سنجیدگی فرماتے

کہ محمدؐ چونکہ بے علم تھے یہود اور نصرانیوں سے سن سن کر کچھ قصے اپنے ہاں جمع کر دیتے تھے۔ (جلد ۲ ص ۲۶۵)

سورہ انعام میں مشرکین کے اسی اعتراض کا ذکر ہے کہ آپ امی ہو کر جن علوم، معارف و حقائق کی تعلیم دے رہے ہیں یقیناً آپ نے یہ مضامین عالی کسی نصرانی یا یہودی سے خوب پڑھ کر حاصل کر لیے ہیں۔ مولانا کی حاشیہ آرائی دیکھیے:

"اور جاہلیت کے انھیں لال بجھکڑوں کی نقل آج بڑے بڑے مستشرقین اور فضلائے یورپ کر کے قرآن مجید کی اس پیش خبری کی توثیق کر رہے ہیں۔" (جلد ۲ ص ۳۳۴)

سورہ انعام ہی میں ایک جگہ توراۃ کے احکام عشرہ کا ذکر ہے۔ مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"قرآن مجید میں یوں تو متعدد آیات ایسی ملتی ہیں جو تہذیب فرنگ کی پھیلائی ہوئی فضائے حاضر پر خاص طور سے چسپاں ہوتی ہیں لیکن یہ آیت ان خاص آیتوں میں بھی خاص ہے۔ آیت کے ایک ایک جز کو لے کر خوب غور سے دیکھیے۔

۱۔ ممانعت شرک: آج کے روشن خیال کتنے مختلف قسموں کے شرک میں مبتلا رہتے ہیں ان کی تہذیب اور ان کے علوم کی بنیاد ہی ترک توحید پر ہے۔

۲۔ تعظیم والدین: اخلاقیات جدید میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی کوئی دفعہ ہی نہیں۔

۳۔ اولاد کشی سے ممانعت: منع حمل، ضبط تولید، خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ تو تمدن جدید کے خاص مفاخر میں سے ہیں۔ وہ بھی معاشیات کا نقاب منہ پر ڈالے ہوئے بلکہ اب تو اس فہرست میں جواز اسقاط حمل کا بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

۴۔ منع فواحش: تمدن جدید کی ساری رونق ہی علانیہ و مخفی فواحش کی گرم بازاری سے ہے۔

۵۔ انسانی زندگی کا احترام: اس ہدایت پر کہیں عمل ہوتا تو جنگ چین و جاپان، جنگ جرمنی و فرانس، جنگ جرمنی و برطانیہ، جنگ جرمنی و روس، جنگ جاپان و امریکا کا وجود ہی سرے سے نہ ہوا ہوتا اور دنیا کو ناقابل پیمائش مصیبتوں سے نجات مل گئی ہوتی۔

کاش اب بھی ہماری آنکھیں کھلیں اور دنیا کی سمجھ میں آئے کہ قرآن نسخۂ شفا صرف چھٹی اور ساتویں صدی مسیحی کے عرب کے لیے نہیں بلکہ بیسویں صدی اور اکیسویں صدی اور ہر مابعد صدی کی کل دنیا کے لیے ہے۔" (جلد ۲ ص ۴۷۷، ۴۷۸)

قتل اولاد کے متعلق اتنا اور سن لیجیے کہ اس کی توجیہ فلاسفہ مادیین اور مفکرین جاہلیت خوف
افلاس ہی سے کرتے تھے۔ مولانا کے بیان کے مطابق آج جاہلیت فرنگ کے زیر سایہ جو شاندار
تحریک قتل اولاد کی خفی و باریک صورت کی منع حمل کے نام سے جاری ہے اس کا محرک بھی یہی
خوف افلاس ہے۔ مالتھس نامے ایک ماہر معاشیات جو برطانیہ میں انیسویں صدی کی ابتدا
میں ہوا ہے اور یہ قتل اولاد یا منع حمل کی تحریک اصلاً اسی کی چلی ہوئی ہے۔ اس کے سارے
نظریہ کی بنیاد بھی خوف افلاس ملک ہے۔ (جلد ۲ ص ۴۷۶)

سورہ اعراف میں آدم و ابلیس کے قصہ میں لباس کی اہمیت کا ذکر یک گونہ تفصیل سے
ہے۔ مولانا اس سے ثابت کرتے ہیں کہ لباس و حجاب مقاصد شرعی میں ہیں اور برہنگی و نیم برہنگی
ایک شیطانی فلسفہ ہے خواہ اس کی تبلیغ یورپ و امریکا کریں یا ایشیا اور افریقہ کی وحشی و غیر مہذب
قومیں اس کی ترویج کریں۔ وہ آج کل کے فلسفہ عریانی کے داعیوں اور مبلغوں کو آگاہ کرتے ہیں
کہ قرآن مجید نے انسان کی اولین معصیت کا پہلا ثمرہ لعنت عریانی کو بتایا ہے۔ (جلد ۲ ص ۵۰۶)

اسی سورہ میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ "انسان کا جتھا اور غرور و گھمنڈ قیامت کے دن
کام نہ آئے گا۔" مولانا بتاتے ہیں کہ جمع و استکبار کے اسباب جیسے پرانی قوموں میں جمع ہو جاتے تھے
آج کی مہذب و متمدن قوموں میں ان سے بھی زیادہ جمع ملتے ہیں۔ اپنی جمعیت و قوت و کثرت پر
فخر اور اپنے کمالات علمی و حربی پر ناز اور اپنے آلاتِ احراق و پرواز پر تکیہ وغیرہ۔ (جلد ۲ ص ۵۲۸)

سورہ بقرہ کی آیت اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ کے نوٹ میں وہ عرب
جاہلیت کو بجا طور پر شقاوت اور جنگ جوئی کے لیے بدنام ہونے کے باوجود بتاتے ہیں کہ سال کے
دو تہائی حصہ لڑتے تھے اور باقی ⅓ حصہ امن و آشتی ہی کے مشغلہ میں گزار دیتے تھے مگر اس کے
مقابلہ میں جاہلیت جدید یا جاہلیت فرنگ کا کمال مولانا کے الفاظ میں یہ ہے:

"فرنگی قوموں کے بڑے بڑے سورما نہ اتوار دیکھیں نہ تہوار، نہ کوئی موسم نہ کوئی مہینہ
ہر روز اور ہر ہفتہ اور ہر موسم میں توپیں اور ٹینک اور ہوائی بم ہیں بلکہ اب تو ایٹم بم اور
ہائیڈروجن بم ہیں کہ ایک دوسرے کی جانیں لینے پر تلے ہوئے، ایک دوسرے کو موت کے
گھاٹ اتارنے پر اڑے رہتے ہیں۔" (جلد ۱ ص ۲۶۰ و ۲۶۱)

سورہ توبہ میں قدیم قوموں اور قریش کے لوگوں کے لہو و باطل میں خوض و اشتغال کا ذکر ہے "خُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوْا" ذرا دورِ جدید کا حال مولانا کے جادو نگار قلم سے ملاحظہ ہو:

"ظاہری ٹیم ٹام کے ساتھ بری عادتوں اور ناپاک خصلتوں میں گھسنے اور دھنسنے کی مثالیں دیکھنا ہوں تو آج بھی مہذب قوموں کے شفاخانوں، محتاج خانوں، ڈاک خانوں، درس گاہوں کے پہلو بہ پہلو ان کے نشاط خانے، شراب خانے، قمار خانے، ناچ گھر ان کے نگار خانے، ان کے تھیٹر، ان کے سنیما اور ان کے قحبہ خانے بلکہ ان کے ایک ایک گھر کے بیڈ روم (خواب گاہیں) دیکھ لیے جائیں" (جلد ۲ ص ۵۰)

کہیں کہیں اس مرقع آرائی میں اسلام کی عظمت اور مغربی عیسائی تہذیب پر اس کی برتری اور فوقیت کا ذکر آگیا ہے۔ میں نے یہاں قرآن کی سورہ فاتحہ اور انجیل کی فاتحہ کی مثال قصداً نظرانداز کی ہے۔

سورہ بقرہ کی ایک آیت کا یہ بڑا بلیغ اور معنی خیز فقرہ ہے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (عورتیں تمہارے لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو) مولانا اس کی تفسیر عام مفسرین سے قدرے مختلف مگر نہایت دل نشیں کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

"یہ اس مذہب کی تعلیم ہے جو فرنگی محققین کی نظر میں پست اس لیے ہے کہ اس میں عورت کی تحقیر کی گئی ہے ؏

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا

کون جھوٹ اس سے بڑھ کر سخت کون سا اتہام اس سے بڑھ کر صریح ہو گا۔ منوسمرتی والے ہندو مذہب کا ذکر نہیں عہد عتیق و جدید والے یہودی و نصرانی مذہبوں سے سوال ہے کہ ان کے سارے دفتر کتب و اسفار میں کون سی تعلیم زن و شو کے باہمی تعلق، محبت و اعتماد کے باب میں اس درجہ کی ہے؟" (جلد اول ۳۳۵)

ان کا یہ چیلنج آج بھی ہے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی پر صلا میرے بعد

قرآن کا یہ فرمان سچ ہے کہ يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ

اس کی یہ تشریح بھی مولانا کے قلم سے ملاحظہ ہو:

"تمام قومیں مکر وحیلہ اور زور وجبر کے مختلف طریقوں سے اسلام کی بیخ کنی میں لگی ہوئی ہیں مگر اس کے باوجود وہ پھیلتا جا رہا ہے اور اس کے پیرووں کی تعداد میں اضافہ ہی روز افزوں ہے۔ مسیحی مشنریوں کو اعتراف ہے کہ روپیہ کے بے دریغ خرچ کرنے اور اپنے نہایت درجہ مستحکم نظام کے باوجود مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کے مشن افریقہ وغیرہ میں ناکام ہی رہے ہیں۔" (جلد ۲ ص ۲۷، و ۲۸)

مسیحیت کے اور بھی مختلف اور گوناگوں پہلوؤں اور گوشوں کو بھی مولانا نے بے نقاب کیا ہے مگر ان کو کہاں تک بیان کیا جائے اور کون انھیں سنے گا۔ میر انیس مرحوم کی اس سرزمین پر مولانا کو بھی یہ کہنے کا حق تھا کہ ؏

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

شمس تبریز خاں

تفسیر ماجدی

چند امتیازات و خصوصیات

برصغیر ہندو پاک میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی تحریک کے ساتھ قرآن فہمی کی باقاعدہ تحریک بھی حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ/ ۱۷۰۲-۱۷۶۲ء) کے فارسی ترجمۂ قرآن فتح الرحمٰن اور ان کے رسالۂ الفوز الکبیر سے شروع ہوتی ہے جس کے بعد ان کے لائق فرزندوں میں شاہ عبدالقادر (م ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۴ء) نے اپنے لاثانی ترجمہ و تفسیر موضح قرآن (اشاعت ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۰ء) اور شاہ رفیع الدینؒ نے لفظی ترجمہ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے 'تفسیر عزیزی' کے ذریعے اس تحریک کو آگے بڑھایا، اسی سلسلہ کی ایک کڑی نواب قطب الدین خاں دہلوی اور نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) کی تفسیریں کہی جا سکتی ہیں، اسی عرصے میں مولانا فتح محمد تائب کی 'خلاصۃ التفاسیر' شاہ رؤف احمد مجددی کی "تفسیر رؤفی" مولانا امیر علی کی "مواہب الرحمٰن" بھی شائع ہوئیں لیکن ان کا اثر محدود تھا اور ان کا علمی مقام بھی بلند نہ تھا۔

پھر مولانا عبدالحق حقانی کی تفسیر حقانی (۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) اپنے وقت کی ایک اہم تفسیر بن کر سامنے آئی جس نے عوام و خواص کو متاثر کیا۔ اپنی طوالت و قدامت سے قطع نظر وہ اب بھی ایک اچھی تفسیر ہے، خصوصاً آریوں، عیسائیوں، نیچریوں اور دہریوں کے اعتراضات کا اچھا دفاع کیا گیا ہے اگرچہ اب ان اعتراضات کی نوعیت کچھ بدل گئی ہے اور ان میں وہ شدت بھی نہیں رہی۔ ان کا مقدمہ تفسیر البیان بھی قرآنیات اور علوم القرآن کا اچھا تعارف ہے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) نے محسوس کیا کہ مختلف تفسیروں سے پریشانی افکار اور قرآن کے بنیادی مطالب و مفاہیم سے دوری کا اندیشہ ہے اس لیے انھوں نے غیر ضروری تفصیلات سے قطع نظر اور قرآن فہمی کے اساسی اصول کے پیش نظر اپنی تفسیر اس انداز سے لکھی جو بیک وقت علمار کے لیے بصیرت افروز اور عوام کے لیے مطلب خیز و مفید ہو، اس لحاظ سے وہ اس عہد کی تفاسیر میں ام التفاسیر کی حیثیت رکھتی ہے (۱)

مولانا تھانوی اپنی تفسیر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"تامل و مشورے سے بھی ضرورت ثابت ہوئی کہ ان لوگوں کو کوئی نیا ترجمہ دیا جائے جس کی زبان و طرز بیان اور تقریر مضامین میں ان کے مذاق و ضرورت کا حتی الامکان پورا لحاظ رہے اور ساتھ ہی اس کے کوئی ضروری مضمون خواہ جزو قرآن ہو یا اس کے متعلق ہو رہ نہ جاوے ..... قرآن مجید کا آسان ترجمہ کیا ہے جس میں قابل فہم ہونے کے ساتھ تحت لفظی کی بھی رعایت ہے ...... نفس ترجمہ کے علاوہ جس مضمون کو بہت ضروری دیکھا کہ اس پر توضیح ترجمہ کی موقوف ہے یا کوئی شبہ خود قرآن کے مضمون سے ظاہراً پیدا ہوتا تھا یا مضمون قرآنی کسی مشہور تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتا تھا، اس کی تحقیق یا اسی قسم کی کوئی ضروری بات ہوئی اس کو 'ف' بنا کر بڑھا دیا، باقی لطائف و نکات، یا طویل و عریض حکایات یا فضائل یا بہت سے مسائل وغیرہ سے تفسیر کو طویل نہیں کیا گیا غرض یہ کہ مضامین کا جمع کرنا مقصود نہیں بلکہ محض حل قرآن و رفع ضرورت ہے" (۲)

یہ تفسیر اصلاً علمار و خواص کے لیے تھی، اس لیے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (م ۱۹۲۰ء)

لے اتمام ترجمہ ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں ہوا اور اس کی اشاعت ۱۹۰۸ء میں ہوئی (جائزہ تراجم قرآنی ص ۵۰ از، مولانا محمد سالم قاسمی، دیوبند ۱۹۶۸ء)

ملے دیباچہ بیان القرآن ص ج (تاج پبلشرز دہلی ۱۹۷۶ء)

نے افادۂ عام کی خاطر شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ اور تفسیر کی تجدید کے لیے قلم اٹھایا اور کنعان علم و عمل کے اس یوسف نے زندانِ مالٹا سے قرآن حکیم کے آفتاب ہدایت کی کرنیں اس طرح بکھیریں کہ ایک عالم روشن ہوگیا، اس شرف و سعادت میں ان کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانی بھی شریک ہیں۔ یہ ترجمہ اور فوائد ایسے ہیں جن سے قرآنیات کا کوئی عالم و متعلم بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ (۱)

(یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ کہنا ضروری ہے کہ مولانا دریابادی کی تفسیر کے بعد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کی تفسیر "معارف القرآن" شائع ہوئی ہے جو گویا تفسیر بیان القرآن کی تجدید ہے مگر اس میں قرآن کے فقہی مباحث، نئے مسائل اور احکام القرآن سے بطور خاص بحث کی گئی ہے اس لیے اس دور کی اہم تفسیروں میں اس کا بھی شمار ہے اور عوام و خواص اس سے مستفید ہوسکتے ہیں۔)

اسی اثنا میں مولانا حمید الدین فراہیؒ (م ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء) کی تفسیر نظام القرآن کے کچھ حصے شائع ہوئے جس کے ذریعے مولانا نے پورے قرآن کو ایک مربوط فکری نظام کا حامل بتایا تھا کہ اس کی ہر آیت اور ہر سورہ ایک دوسرے سے مربوط ہے اور قرآن حکیم ایک حکیمانہ نظم و ترتیب رکھتا ہے اور ہر سورہ ایک مرکزی مضمون یا عمود پر مشتمل ہے۔ مولانا نے قرآن کے ربط و نظام کے فن کو مزید ترقی دی اور کلام عرب سے استشہاد کرکے حکمت قرآن کی تفہیم میں گہرائی و گیرائی پیدا کی اور عصری تفسیر نگاری میں ایک مستقل دبستان کے بانی ہوئے جس کا ایک نمونہ مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر 'تدبر قرآن'، اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی قرآنی تحریریں ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب یورپ کی مادیت، جارحانہ قوم پرستی اور جنگ جویانہ ذہنیت سے اہل مشرق متنفر اور بیزار تھے اور عالمی امن، بین الاقوامی مفاہمت، حریت و مساوات اخوت و انسانیت اور اتحاد و اتفاق کی شریفانہ انسانی اقدار کے لیے بے چین تھے اور مذاہب

لہ یہ ترجمہ ۱۹۱۹ء میں مکمل اور ۱۹۲۳ء میں بجنور سے شائع ہوا، جائزہ تراجم ص ۵۲

عالم کی طرف دیکھ رہے تھے تو مولانا آزاد نے اپنے غیر معمولی علم و فضل، ذہانت و ذکاوت، بلند طبعی، عالی دماغی، ژرف نگاہی و دیدہ وری، نکتہ رسی و دقیقہ سنجی اور حکمت و بصیرت سے وقت کے اس مطالبے اور عالم انسانی کی اس ضرورت کی کماحقہ تکمیل کی۔ مولانا نے جس بلند ذہنی سطح سے عالم انسانیت کو قرآن کے ذریعے مخاطب کیا اس میں عالمی و انسانی اپیل تھی اور وہ اسلامی دعوت کو معروضی، غیر جانب دارانہ اور خالص علمی و فکری اور حکیمانہ انداز سے پیش کرنے کی اعلیٰ مثال تھی، مگر افسوس کہ سیاسی مشاغل کے سبب مولانا کا کام ادھورا رہ گیا۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن سامنے آئی مگر بعض مخصوص و منفرد نظریات کے سبب اسے علماء و عوام کے ایک بڑے طبقے کا اعتماد نہ حاصل ہو سکا، تاہم بعض فکری اختلافات سے قطع نظر اپنے موثر و مرتب انداز تفہیم اور اقامت دین کے لیے فکر انگیزی کے سبب تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے علماء کی نگرانی میں اس کا مطالعہ بہرحال مفید ہے۔

'تفسیر ماجدی' قرآن کے اعجاز ہدایت کا ایک شاہکار ہے۔ قرآن نے اپنے تعارف میں اپنے کو ھدی للمتقین کہا ہے، چنانچہ قرآن فہمی کے شوق و شغف، ہدایت طلبی و خدا ترسی اور خدمت قرآن کے مخلصانہ اور پاکیزہ جذبات نے مولانا دریابادی کو الحاد و انکار کی وادیوں سے نکال کر ایمان و یقین، ایقان و اقرار، قرآن فہمی و خداشناسی کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ سچ فرمایا نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما ویضع بہ اٰخرین (مسلم) (اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے ایک طبقے کو بلند کرتا ہے تو دوسرے کو پست) جو کارنامہ بہت سے علمائے عصر و فضلائے دہر نہ انجام دے سکے اسے اللہ قادر مطلق نے اُس فاضل زمانہ کے ہاتھوں پورا کر دیا جس نے عربی کی تحصیل میں صرف اپنی ذاتی محنت اور ذوق و شوق کو رہنما بنایا تھا۔ اور یہ کارنامہ ایسا تھا جس پر علماء نے بھی صاد کیا، عوام نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

تفسیر ماجدی گوناگوں خصوصیات و امتیازات کی مالک ہے، اس میں عربی اردو

کی تمام ممتاز اور اہم تفاسیر کا عطر و خلاصہ آگیا، مسلک اہل سنت ملحوظ و محفوظ رہا اور اس کے ساتھ عصری تقاضے بھی پورے ہوئے، معترضین کو لاجواب کیا گیا، مستشرقین کے شبہات اور دخل در معقولات کا سد باب ہوا۔ نئی تحقیقات اور نئے علوم وفنون کی تائید حاصل کی گئی اور یہ سب اس شان سے ہوا کہ ادبیت و بلاغت بلائیں لیتی جاتی ہیں اور انشائے ماجدی کی بہار گل بوٹے لٹاتی جاتی ہے۔

اس کا سب سے بڑا امتیاز، مستند قدیم وجدید تفسیروں سے استفادہ اور قول راجح کی توجیہ و ترجیح مسلک اہل سنت سے مطابقت و موافقت، تفسیر بالرائے اور اپنی ذاتی رائے پر اصرار سے پرہیز واجتناب ہے جس کی کمی سے ان کے بعض بلند پایہ معاصر مفسروں کو بھی وہ استناد واعتماد نہ حاصل ہوسکا۔ تفسیر ماجدی کے مطالعہ کرنے والے کو صاف محسوس ہوتا ہے کہ قرآن فہمی کی ۱۴سو سالہ روایات نے جس طرح ماضی کی تاریکیوں میں رہنمائی کی تھی اسی طرح عصر حاضر کی برقی چکاچوند اور خیرگی میں بھی انسانیت کی دست گیری کر رہی ہیں۔ روایات سے ان کی اس وابستگی و وفاداری میں مرشد تھانویؒ کی رہنمائی کا بھی دخل تھا جن سے انھوں نے تفسیری استفادہ بھی کیا تھا اور جس کی تفصیلی روداد ان کی کتاب "حکیم الامت" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

تفسیر ماجدی کا دوسرا امتیاز، قرآن پر مشرق و مغرب کی طرف سے ہونے والے اعتراضات اور شکوک وشبہات کا عقلی و نقلی اور مدلل و مسکت جواب دہی ہے جس کی بنیاد ان کے وسیع و عمیق مطالعہ، علوم جدیدہ سے واقفیت اور معلومات کی کثرت اور تنوع پر ہے۔ اہل کتاب کے عقائد و فرق، تاریخ وثقافت سے گہری آگہی کے سبب وہ قرآن اور بائبل کے یکساں بیانات اور قرآن کی تائید میں ان کی عبارات بکثرت نقل کرتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے قرآن کے کتب سماویہ پر نگراں ومہیمن ہونے کے اعجاز کو بخوبی واضح کر دیا ہے، اس وجہ سے ان کی تفسیر اہل کتاب کے لیے 'الکتاب' کی طرف باعث توجہ اور چشم کشا و عبرت افزا بن گئی ہے۔ قرآن مجید کی تائید و تفسیر کے لیے انھوں نے جس اولوالعزمی وجاں کاہی، محنت و محویت اور فکر ونظر کی وسعت سے کام لیا اور علوم جدیدہ سے استفادہ کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔

تفسیر کے علاوہ قرآن کے اعلام و اشخاص، تاریخ و جغرافیہ، حیوانات، مشکلات القرآن اور ... نبوی قرآنی، بشریت انبیاء پر مستقل کتابیں لکھ کر گویا علوم القرآن کا ایک دائرۃ المعارف تیار کر دیا ہے۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ انھوں نے علوم جدیدہ کو قرآن کا خادم بنا کر پیش کیا ہے جس میں مرعوبیت و عذر خواہی نہیں ہے بلکہ قرآن کے فضل و تقدم اور عظمت و رفعت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور مغرب کی تنقید و تردید خود مغربی اہل قلم کے ذریعے بھی کی گئی ہے، اور ایسا ہونا بھی تھا کہ وقت کے بڑے ناقدین مغرب، اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی جوہرؔ اور مولانا حسین احمد مدنی کے وہ عقیدت مندوں میں تھے۔

عصر حاضر میں مفسر قرآن کی ذمہ داریاں کتنی بڑھ گئی ہیں، اس کے لیے قدیم و جدید علوم سے واقفیت کتنی ضروری ہو گئی ہے اور اس کا ذہنی افق کتنا وسیع اور اس کی ثقافتی سطح کتنی بلند ہونی چاہیے اس کا مولانا دریابادی کو پورا احساس تھا اور وہ اس سے عہدہ برآ بھی ہوئے اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> "لازم ہے کہ جدید مفسر و شارح تاریخ اقوام پر بھی نظر رکھتا ہو اور جغرافیۂ عالم پر بھی اور یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور عرب و نواح عرب کے شرکیہ مذاہب سے بھی فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو اور جدید سائنس کے بھی مختلف شعبوں خصوصاً فلکیات سے بھی مطلقاً بے بہرہ نہ ہو، ورنہ باوجود تدین و تقویٰ، صالحیت و مقبولیت کے سخت علمی غلطیوں کا شکار ہو جائے گا، اس کا قلم کہیں فرعون اور لشکر فرعون کی غرقابی کو بجائے بحر قلزم کے دریائے نیل میں دکھائے گا کہیں حضرت مسیح کا تلوار سے قریب القتل ہونا بیان کرے گا اور کہیں فرعون کو کسی تاجدار کا شخصی نام سمجھ کر دعوائے الوہیت اس کی شخصیت کی جانب منسوب کرنے لگے گا"[1]

انھوں نے اس پہلو پر زور دیتے ہوئے دوبارہ لکھا کہ:

---

[1] تفسیر ماجدی، اوّل افتتاحیہ ص ۶

"جدید مفسر کی نظر قرآن کے ماحول اور ملک کی تاریخ پر ہونا لازمی ہے اور یہ نظر جتنی گہری اور وسیع ہو اسی قدر بہتر ہے۔ بعض قدیم مفسروں نے شان نزول کو بہت اہمیت دی ہے اور اس عنوان کے ماتحت رطب ویابس ساری ہی روایتوں کو یکجا کر دیا ہے، یہ تلاش بے شک قابل قدر ہے لیکن کافی نہیں۔ اس میں وسعت اور گہرائی دونوں بہت زیادہ چاہیے۔ محض چند صحابہ اور مخلصوں کے حالات اور اقوال جمع کر دینا کافی نہیں، نہ صرف قبیلہ قریش بلکہ سارے حجاز کے طور طریقوں کو پیش نظر ہونا چاہیے۔ اُن کے رسم ورواج، عقائد واوہام، ان کے معتقدات ومزعومات، ان کے شعر وخطبات سب سے واقفیت ہونا چاہیے۔ قریبی ملکوں سے ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی، عورتوں کا ان کے ہاں سیاسی، مذہبی، معاشی، معاشرتی مرتبہ کیا تھا، دولت کے کیا کیا مصرف رائج تھے، آقا وغلام، زردار ونادار کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ مفلس یتیم مسافر کس برتاؤ کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ قانونی واخلاقی ومعاشی آداب کس سطح اور کس معیار کے تھے۔ سیاسی وعمرانی رشتے ایک طرف عراق وایران دوسری طرف شام ومصر کے ساتھ کس قسم کے تھے؟ شرک کے مختلف مذاہب اور مسیحیت، یہودیت، مجوسیت کس کس روپ میں جلوہ گر تھے، تاریخی نوشتوں کے علاوہ اثری کتبات نے ان سارے مسائل سے متعلق جو معلومات کے انبار لگا دیے ہیں، یہ سب تفسیر لکھنے والے کے دائرہ نظر کے اندر آجاتے ہیں" [1]

یہاں تفسیر ماجدی کے بعض اہم مباحث کا نمونہ پیش کرنے کے بجائے صرف ان کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جنھیں سامعین وناظرین تفسیر میں دیکھ سکتے ہیں

سورۃ الفاتحہ کی تفسیر بھی ایجاز وجامعیت کا نمونہ ہے۔ تفسیر ان فی خلق السموات والارض (البقرہ: ۱۶۴) آیت نسخ، سورۂ بنی اسرائیل میں تاریخ بنی اسرائیل

---

[1] تفسیر ماجدی ۲/۷ (طبع لکھنؤ)

اصحاب کہف اور ذوالقرنین کی بحث، بائبل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیشین گوئیاں، سورۂ روم میں تاریخی پس منظر کی نشان دہی، سورہ الفتح میں محمد رسول اللہ و الذین معہ کی تفسیر بطور نمونہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے رفع آسمانی کی بحث اس تفسیر کا سب سے زیادہ ممتاز مقام ہے۔ انبیائے بنی اسرائیل سے متعلق تاریخی مباحث بھی بہت اہم ہیں۔ قرآن سے متعلق بعض قدیم کتابوں میں جو اہم تفسیری مباحث آ گئے ہیں (خصوصاً "مشکلات القرآن" میں) ان کا بڑا حصہ تفسیر ماجدی میں نقل کر دیا گیا ہے۔ اپنی تفسیر کے ترجمہ والے حصہ کے بارے میں مولانا دریابادی نے یہ وضاحت کی ہو کہ:

"اس تفسیر کے اردو ترجمہ کا جہاں تک تعلق ہے یہ ۹۵ فی صد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نقل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرانے ترجموں میں شاہ رفیع الدین دہلوی کا ترجمہ اور نئے ترجموں میں حکیم الامت کا ترجمہ، بس یہ دو ترجمے باقی تمام ترجموں سے بے نیاز کر دینے والے ہیں۔ پہلا ترجمہ لفظی ہے اور دوسرا بامحاورہ و مطلب خیز۔ اردو تفسیروں میں نمبر اول پر حکیم الامت کی تفسیر بیان القرآن ۱۲ جلدوں میں ہے۔ علوم و معارف سے لبریز یہ تفسیر اردو میں اپنی نظیر آپ ہے۔ سب سے زیادہ اخذ و استفادہ اسی سے کیا گیا ہے۔"[1]

اخیر میں تفسیر ماجدی کے بارے میں چند ممتاز علمائے کرام کی رائیں پیش کی جا رہی ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ اہل نظر نے اسے کس نگاہِ تحسین سے دیکھا ہے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:

"جہاں تک اردو تفسیر ماجدی کا تعلق ہے، عوام و خواص دونوں ہی اسے ذوق و شوق کے ہاتھوں لیتے ہیں اور عقیدت و محبت سے مطالعہ کرتے ہیں... قدیم چیزیں تو دوسری تفسیروں میں بھی مل جاتی ہیں مگر بعض جدید چیزیں اس تفسیر کا مخصوص سرمایہ ہیں اور دور حاضر کے لیے یہی چیزیں بڑا قیمتی ذخیرہ ہیں۔ مولانا

---

[1] تفسیر ماجدی (دیباچہ)

مرحوم نے اس تفسیر پر بہت کافی محنت کی ہے اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ خدمت ان کے لیے آخرت کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور سب سے قیمتی خزانہ۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔" لے

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم لکھتے ہیں:

"تفسیر ماجدی کے بعد جن حضرات نے قرآن مجید کی تفسیر یا اس کی تفہیم کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں انھوں نے درحقیقت مولانا ہی کی خوشہ چینی کی ہے۔ مولانا کے خامۂ زرنگار سے جو مضمون نکل گیا، سدابہار ہوگیا۔ لیکن علمی تحقیقی اور ادبی حیثیت سے تفسیر ماجدی مولانا کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی آب وتاب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھے گی اور آئندہ نسلیں شکرگزاری کے ساتھ اسے یاد رکھیں گی۔" لے

مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ نے یہ اظہار خیال فرمایا تھا:

"تفسیر ماجدی اپنی بعض خصوصیات میں منفرد ہے اور تمام تفسیری ذخیرہ کی موجودگی میں اس کی بہرحال ضرورت تھی، قرآن مجید کے بیسیوں مقامات ایسے ہیں کہ ان میں قرآن کا اعجاز اور وحی محمدی کی صداقت پورے طور پر اس وقت تک عیاں نہیں ہوسکتی جب تک کہ ان آیات کا تاریخی پس منظر سامنے نہ ہو اور جن اقوال وعقائد کی تردید یا نفی کی گئی ہو ان کی حقیقت واصلیت اور ان کی اُس دور میں اہمیت ومقبولیت وعمومیت نہ معلوم ہو اس سلسلے میں مولانا عبدالماجد صاحب نے ایک نہایت قابل قدر خدمت انجام دی ہے جس کا شکریہ ان سب لوگوں پر واجب ہے جو مغربی زبانوں سے براہ راست واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے ان ماخذوں سے فائدہ اٹھا سکتے یا ان کے پاس اتنا وقت اور ایسا وسیع کتب خانہ

لے نیا دور لکھنؤ، ماجد نمبر ص ۸، اپریل مئی ۱۹۷۸ء

لے جامعہ، مارچ ۱۹۷۷ء

نہیں ہے، قرآنی واقعات و قصص اور مقامات و امکنہ، نیز اشخاص و اقوام اور مذاہب و فرق سے متعلق انھوں نے اتنا مواد جمع کر دیا جو یکجا نہیں مل سکتا، پھر جہاں تک میری نظر پڑی ہے وہ مسلک سلف سے ہٹے نہیں ہیں۔" ؎۱

یہ کتنی بڑی سعادت تھی کہ مولانا دریابادی نے قرآن کی خدمت میں تقریباً نصف صدی گزار دی اور اپنی تمام صلاحیتوں کو کتاب اللہ کے سمجھنے اور سمجھانے میں لگا دیا، اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر قرآن فہمی کی ایسی راہیں کھولیں کہ آئندہ مفسرین کے لیے ان کے نقش قدم اور آثار قلم سنگ میل اور نشانِ راہ ثابت ہوں گے ؎

خارہا از اثر گرمیٔ رفتارم سوخت　　منتے بر قدم راہرو انست مرا

سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

؎۱ تعارف تفسیر ماجدی ج ۲ ص ۳ (لاہور ۱۹۵۴ء)

حبیب ریحان ندوی

مولانا دریابادی کی دینی خدمات

افکار شبلی سے متاثر ہونے والوں میں اس وقت کے مسٹر عبدالماجد اور ہماری آج کی محفل کے 'نوشہ' مولانا عبدالماجد دریابادی بھی ہیں۔

انگریزوں سے مرعوبیت

عبدالماجد دریابادی کی پیدائش کے وقت انگریزی سامراج پوری طرح ہندوستان کی قسمت کا مالک بن چکا تھا اور بچپن ہی میں مولانا کے دیکھتے دیکھتے عوام و خواص میں انگریزوں سے مرعوبیت مکمل طور سے پیدا ہو چکی تھی۔ مولانا لکھتے ہیں:

"میرے بچپن تک مسلمانوں کا ایک مخصوص معاشرہ تھا۔ خصوصی آداب و اطوار تھے۔ خاص قسم کا لباس، خاص قسم کے بال، خاص قسم کے کھانے وغیرہا۔ تغیر و انقلاب کی آندھی نے سارا شیرازہ منتشر کر دیا۔ پہلے تو انگریزیت کا دور دورہ رہا۔ وضع قطع، مکان و لباس، کھانا پینا سب مغربی طریقوں کا ہوتا چلا گیا۔" (آپ بیتی ص۵۱)

جدید اسلوب نگارش کے موجد و خاتم

مولانا عبدالماجد دریابادی ایک جدید اسلوب نگارش کے موجد اور خاتم ہیں۔ طنز کے بادشاہ ہیں۔ اردو صحافت میں سب سے پہلے "سچی باتیں" انھیں نے لکھنی شروع کیں جن میں سیاسی، ادبی، دینی، تہذیبی، ثقافتی اور اجتماعی موضوعات پر انتہائی مختصر لیکن جامع تبصرہ کیا جاتا تھا۔

راقم کے نزدیک مولانا کی شخصیت کا سب سے عظیم پہلو ان کی ادبیت، فصاحت و بلاغت

اور معجزانہ اسلوب نگارش ہے۔ کسی نے لکھا کہ " عبدالماجد دریابادی ہاتھ میں قلم لیے پیدا ہوئے"، کسی نے کہا " وہ پیدائشی ادیب تھے"۔ دونوں عبارتیں حقیقت سے دور اور مبالغہ پر مبنی ہیں۔ لیکن مجازی طور پر ان سے اسی بات کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ عظیم قلم کار، اردو کے بہترین ادیب و ناقد اور طنز کے بادشاہ تھے۔ نوعمری میں ان کی یہ صلاحیتیں ظاہر ہوگئی تھیں۔

دہریت کا غلبہ کیوں ہوا

عبدالماجد دریابادی کی پیدائش ایک دین دار گھرانے میں ہوئی۔ انھیں اپنے مذہب اور معاشرہ سے فطری محبت رہی۔ اردو، فارسی اور عربی کی مختصر تعلیم حاصل کی، نیز علمائے عصر کے مضامین پڑھ کر کچھ لکھنے پڑھنے اور دفاع اسلام کا شوق بھی نوجوانی میں پیدا ہوا لیکن یہ معمولی سی دینی تعلیم اور بچپن کے عقائد اس زبردست سیلابِ بلا کا مقابلہ کرنے میں بالکل ناکام رہے جو کالج کے راستے سے آیا

انسوس کہ ابلیس کو کالج کی نہ سوجھی

اور جس میں مغربی فلاسفہ اور مفکرین کی دسیسہ ریزآرا شامل تھیں جو براہِ راست اسلام پر حملہ کرتے تھے لیکن زیادہ تر اخلاقی واجتماعی وعلمی تحریروں میں اسلام کے خلاف زہر کی آمیزش کرتے تھے اور غیر پختہ ذہنی اور صحیح عقائدی واسلامی معلومات نہ رکھنے والا نوجوان ان کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہی واقعہ مسٹر عبدالماجد کے ساتھ پیش آیا، کیونکہ پختہ عقیدہ بھی نہیں تھا، صرف موروثی طور پر مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان تھے۔ علم وفضل خاندان میں تھا مگر رواجی دین نافذ تھا۔ عربی زبان سے بھی واقفیت پوری طرح نہ تھی۔ انگریزی تعلیم وتربیت کا جو شوق اس زمانہ میں والدین اور خاندان والوں کو تھا اور اس کے ساتھ پختہ دفاعی انتظام بھی نہیں تھا اور مغربی تفکیرات کو پھیلانے اور عقیدہ واخلاق کی "بوسیدہ"، "قدیم" اور "پارینہ" و "غیر حقیقت پسندانہ" بنیادوں کو منہدم کرنے کا منظم پلان جو دانایانِ فرنگ نے بنایا تھا اس کے مقابلہ میں نادان طریقہائے علم وتربیت اور بے تدبیر دفاعی انتظامات خس وخاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ اگر موجودہ مسیحیت اپنے غیر فطری و غیر معتدل عقائد وافکار کی وجہ سے قابل قبول نہ ہو تو یورپین مادی دین بظاہر اپنی مادی ترقیوں، سائنسی محیر العقول ایجادوں، آزادی کے مستانہ نعروں

اور اخلاق باختگی کے ببانگ دہل مظاہروں کی وجہ سے قبول کر لیا جائے۔

کھلا اور بے نقاب الحاد

عبدالماجد دریابادی کا الحاد و لادینیت کی وادیوں میں بھٹکنا کوئی حیرت انگیز یا غیر فطری بات نہیں تھی۔ بلکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ جس نے فلسفے کا مطالعہ کیا اور مغربی تہذیب کے زیر سایہ مغربی یونیورسٹیوں میں پڑھا، جہاں انسانیت کے دماغ کو ایک جہنمی منصوبے کے ماتحت ایک خصوصی سانچے میں ڈھالنے کا منظم پروگرام ہے۔ حتیٰ کہ اسلامی تعلیمات انگریزوں کی بنائی ہوئی اسلامی فیکلٹیوں میں پڑھیں ان میں سے اکثر عجیب و غریب قسم کے الحاد و لادینی کا شکار ہوئے۔

مسٹر عبدالماجد دریابادی کے معاملہ میں حیرت کی بات یا انفرادیت کی شان یہ ہے کہ انھوں نے برملا اپنے لادینی اور ملحد ہونے کا اعلان کیا اور براہ راست اسلامی تعلیمات پر تنقیدیں کیں اور مذہب سے باغی ہونے کا شہرہ پیٹ دیا۔

نقاب پوش ارتداد

ان کے برخلاف مکار، سیاسی، شاطر، ملحد و مرتد یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ عربی زبان و اسلامی علوم سے مکمل ناواقفیت کے باوجود الحاد و ارتداد کا اعلان تو نہیں کرتے لیکن کتاب و سنت کے مسلمات میں تاویل کے نام پر تحریفات کا لامتناہی سلسلہ کھول دیتے ہیں جس کے نمونے آئے دن دیکھنے میں آتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ "قرآن مجید محمدؐ کی بہترین کتاب ہے" یا "محمدؐ بڑے جینیس انسان تھے، ایسی عظیم شریعت اور تعلیمات دنیا کے سامنے پیش کر دیں" یا یہ کہ "اسلام کی پیروی عبادات میں کی جانی ضروری ہے۔ باقی زندگی کے دوسرے اقتصادی، اجتماعی اور قوانین شہری و فوجداری و پرسنل امور میں انسان آزاد ہے" یا یہ کہ "اسلام عرب کے صحراؤں اور بدوی معاشرہ کے لیے مناسب تھا، بیسویں صدی کی ماڈرن اور مہذب اقوام کے لیے نہیں" یا یہ کہ "چوری ڈاکہ اور حرام کاری کی سزائیں اور قصاص (یعنی جان کے بدلے جان)، کے قوانین انتہائی ظالمانہ اور وحشیانہ ہیں اور عصور قدیمہ کی شقاوت، ناانصافی اور ظلم و زیادتی کے حامل ہیں"، یعنی خاکم بدہن یہ

دعویٰ کہ نعوذ باللہ خدا ظالم تھا یا ہے، یا یہ کہ "عورت کو گواہی، میراث اور دوسرے وہ حقوق جس میں اسلام نے اس کے فطری و سیکالوجی اختلاف کی بنا پر اسے برابری اور مکمل مساوات عطا نہیں کی وہ اسے دی جائے۔" وغیرہ وغیرہ قسم کے وہ مسائل جو واضح قرآنی و نبوی نصوص میں وارد ہوئے ہیں۔

الغرض بلا نقاب یا نقاب پوش مرتد و ملحد پیدا کرنا مغربی طریق تعلیم و تربیت کا بے نقاب اصول ہے۔ حیرت اس پر نہ کیجیے۔ حیرت تو ان پر ہے جن کو خدا کی قدرت نے اس بحر ظلمات میں شناوری کرنے کے بعد بھی ساحل سلامتی سے ہمکنار کیا۔

جس طرح گیہوں کے بیج سے جو پیدا ہونا محال و ناممکن ہے اسی طرح زہر سے تریاق۔ جس تعلیم کی بنیاد ہی لادینیت، لا اخلاقیت، ادریت اور کائنات محیط پر کسی ذات مستودہ صفات خلاق و علیم کی بالادستی کے عدم اقرار اور لاریب حقیقتوں کے انکار پر اٹھائی جائے اس سے دین داری، اخلاق، توحید اور انسانی اعلیٰ اقدار و صفات کی توقع بے سود ہے۔

اسلام سے عداوت کے ظاہری اسباب

اسلام سے بغاوت کے اسباب میں ایک سیکالوجی کی کتاب تھی جس کا تعلق بظاہر مذہب سے کچھ نہیں تھا بلکہ عضویات دماغی اور مرطبات دماغی سے تھا جس میں واضح طور پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ مصروع شخص مان کر یہ لکھا تھا "مصروع (مرگی کا دورہ والا) شخص کے لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ اپنے دئے بڑا کارنامہ دنیا کے لیے چھوڑ جائے۔" (آپ بیتی صفہ ۲۴۰)

کیونکہ عبد الماجد دریابادی نے اسلامی طب اور اطبا اور ان کی آرا کا مطالعہ بھی نہیں کیا تھا اور علمائے سیرت و طب نے صرع سے متعلق جو لکھا ہے اور حضور پر نور کے لیے اس کی حیثیت دعویٰ سے زیادہ نہیں ہے، وغیرہ سے ناواقفیت تھی اور حضور پر لاکھوں صفحات کا لٹریچر جو عربی میں موجود تھا وہ بھی نہیں پڑھا تھا، صرف قوالوں اور نعت گویوں کی زبان سے یا پھر میلادناموں میں لکھے ہوئے کارناموں کو پڑھا تھا اس لیے ایک مغربی کی نفسیاتی کتاب سے انھوں نے اتنا زیادہ اثر قبول کیا۔

اصل وجہ یہ تھی جس کا اظہار مولانا نے خود کیا ہے کہ "صاحب" کی تحقیقات لاریب آسمانی حقائق سے بھی زیادہ صحیح ہیں اور یہ کہ صاحب لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔ حالانکہ یہ دونوں مفروضے جو بربنائے ناواقفیت تھے، غلط تھے۔

مولانا پر اثر ایک اور کتاب سے بہت بڑا پڑا جو اصول معاشرت و آداب سے متعلق تھی۔ فرماتے ہیں:

"کتاب کیا تھی بارود بچھی ہوئی سرنگ تھی۔ حملہ کا اصل ہدف وہ اخلاقی بندشیں تھیں جن میں مذہب کی دنیا اب تک بطور علوم متعارفہ کے پکڑے ہوئے ہے... مثلاً عفت و عصمت... اس لیے مذہب و اخلاق کے گڑھے ہوئے ضابطہ کو اپنے پیروں سے روند ڈالو۔ انداز بیان بلا کا زوردار اور خطیبانہ تھا۔ سولہویں سال کا ایک طفل ناداں اس سیلاب میں اپنے اخلاق و ایمان کی ننھی منھی سی کشتی کو کیسے صحیح و سالم رکھ پاتا! خصوصاً جبکہ کتاب کی دعوت و دعائیت عین نفس کے مطابق ہو" (ص ۲۳۵)

اسی طرح مسٹر دریابادی نے ایک یوروپین کی لکھی ہوئی کتاب میں حضور پرنورؐ کی ایک قلمی تصویر اس مستند حوالے کے ساتھ دیکھی کہ فلاں جگہ سے اتاری گئی ہے جس میں آپ کو نعوذ باللہ ایک بدوجنگ جو اور ظالم و فاتح کی شکل میں تلوار لٹکائے تیوریوں پر بل پڑے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر بجائے یہ کہنے کے کہ نعوذ باللہ یہ تصویر حضورؐ کی نہیں ہوسکتی بلکہ یہ کسی شیطانی دماغ کی اختراع ہے۔ مسٹر عبدالماجد اس سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔ یہاں بھی حضور پاکؐ کے حلیۂ، وضع و قطع، شمائل، حسن اخلاق و کردار، عفو عام وغیرہ کے جملہ حسین و دل کش کردار، اور اسلام میں مجسموں اور اسٹیچوؤں کی حرمت وغیرہ کی جملہ تعلیمات سے ان کی لاعلمی کا ثبوت ملتا ہے اور دوسری طرف مغرب سے مرعوبیت کا۔ مولانا ہی کی عبارت ملاحظہ ہو:

"فرنگیت سے مرعوب ذہنیت اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ خود اس فوٹو میں کوئی جعل سازی ہوسکتی ہے اور صاحب کی بات بھی کوئی غلط ہوسکتی ہے، تحقیق تو ہو نہ ہو وہی ہے جو اس فوٹو سے عیاں ہے۔" (آپ بیتی ص ۲۳)

اسی طرح پہلی بات یعنی مطالعۂ دینی اور مذہبی کی کمی وغیرہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"فرنگی الحاد کے جس سیلاب عظیم سے ٹکراؤ تھا اس کے مقابلہ کے لیے وہ ہرگز کافی نہ تھا۔" (ص ۲۳۵)

اگر براہ راست اسلام کی طرف آتے

مولانا دریابادی نے یہاں اپنے اسلام کی طرف واپسی کے روحانی سفر کا واقعاتی تجربہ اور تدریجی ارتقا بیان کیا ہے۔ اگر وہ ان تحریروں کو نہ پڑھتے اور اضطراری طور پر ان تجربوں سے نہ گذرے ہوتے، سیدھے شاہراہ اسلام پر لوٹ آتے اور کتاب وسنت کی صحیح تعلیمات کا مطالعہ براہ راست بھی ان کو نصیب ہوجاتا تو وہ صراط مستقیم کو پاکر صحیح رجوع الی الحق کی دولت سے مالامال ہوجاتے۔ بلکہ راقم کا خیال ہے، اور راقم عاجز کے خیال کی کچھ اہمیت نہیں اس میں غلطی کا امکان موجود ہے، کہ اگر وہ ان متنوع تجربات اور ان کے بعد مزید روحانی تجربوں اور تحریروں سے محفوظ رہتے تو مزید مفید خدمت انجام دے سکتے تھے اور ان اجتہادی وجذباتی آرارے محفوظ رہ سکتے تھے جو افراط وتفریط تک پہنچاتی ہیں۔

سابقہ روحانی تحریریں ان تجربوں پر مشتمل ہیں جو مادیت کی نفی کرتے ہیں اور عالم غیب کی تفسیروں کے نشے میں عالم شہود سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب روح ومادہ، دنیا وآخرت، صلح وآشتی وجنگ اور ہمہ گیر انسانی ضروریات کا مذہب نہیں جس نے انسان کی عقلی وقلبی، روحانی ومادی، اقتصادی واجتماعی، سیاسی وآئینی جملہ ضروریاتِ واقعیہ کی رعایت رکھی ہو اور کائنات کے تمام تکوینی امور کی ایسی توجیہہ وتعبیر اور تفسیر وتاویل کی بنیاد انسانوں کے ذاتی اور مختلف تجربات وخیالات کی بجائے تمام تر کتاب وسنت کی واضح آسمانی تعلیمات وہدایات اور رسول اللہ ؐ کے اسوۂ حسنہ پر رکھی ہے۔

شبلی کی سیرۃ النبی کا فیض

اسی دور میں شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی جلد اول پریس سے باہر آگئی۔ اس کی اثر انگیزی کا قصہ مولانا دریابادی کے الفاظ میں سنیے؛

"کتاب شبلی کے قلم سے تھی۔ موضوع کچھ بھی سہی کیسے نہ اس کو شوق کے ہاتھوں کھولتا اور اشتیاق کی آنکھوں سے پڑھتا۔ کھولی اور جب تک اول سے آخر تک پڑھ لی دم نہ لیا۔ دل کا اصلی چور تو یہیں تھا۔۔ مستشرقین و محققین فرنگ کے حملوں کا اصل ہدف تو ذاتِ رسالت ہی تھی، خصوصاً بسلسلۂ غزوات و محاربات ظالموں نے بھی تو طرح طرح سے دل میں بٹھا دیا تھا کہ ذاتِ مبارک نعوذ باللہ بالکل ایک ظالم فاتح کی تھی۔ شبلی نے (اللہ ان کی تربت ٹھنڈی رکھے) اصل دوا اس درد کی کی. مرہم اس زخم پر رکھا، اور کتاب جب بند کی تو چشم تصور کے سامنے رسول عربیؐ کی تصویر ایک بڑے مصلح ملک و قوم اور ایک رحم دل و فیاض حاکم کی تھی جس کو اگر جدال و قتال سے کام لینا پڑا تھا تو پھر آخر درجہ میں ہر طرح مجبور ہو کر۔ یہ مرتبہ یقیناً آج ہر ہر مسلمان کو رسول و نبیؐ کے درجے سے فروتر نظر آئے گا اور شبلی کی کوئی قدر و قیمت نظر نہ آئے گی۔ لیکن اس کا حال زار ذرا اس کے دل سے پوچھیے جس کے دل میں نعوذ باللہ پورا غیض و عناد اسی ذاتِ اقدس کی طرف سے جما ہوا تھا۔ شبلی کی کتاب کا یہ احسان میں کبھی بھولنے والا نہیں۔" (آپ بیتی ص۲۴۴)

مطالعہ اور دوسری شخصیتوں کا اثر

اسلام سے قریب لانے والوں میں اکبر الہ آبادی کا مخلصانہ و حکیمانہ انداز جس میں بحث و مناظرہ کی چھاؤں تک نہ پڑنے پاتی تھی، خصوصاً قرآن پاک کو عربی ادب کے سب سے اعلیٰ نمونہ کے طور پر پڑھنے کی نصیحت کہ جرمن یونیورسٹیاں تک اسے بطور ادب پڑھاتی ہیں، اور آپ کیونکہ اس کے تقدس کے بھی قائل نہیں اس لیے وضو وغیرہ کی قید سے بھی آزاد ہیں۔

بڑی اور اہم شخصیت مولانا محمد علی جوہر کی تھی للہیت، انگریزی انشاپردازی اور سیاست ملی کے مولانا دریابادی بہت زیادہ بلکہ سب سے زیادہ قائل تھے۔ ان کی نصیحتوں اور مباحثوں نے اپنا غیر معمولی اثر چھوڑا۔ ان کا حق دریابادی نے پوری ایک ضخیم کتاب "محمد علی ذاتی ڈائری" میں ادا کر دیا ہے۔ اس کتاب کی ایک ایک سطر انشا و ادب کی نشانی ہے اور جذب و کیف و اثر

میں ڈوبی ہوئی ہے ۔

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالباری ندوی وغیرہ کے دوستانہ تعلقات کا بھی اچھا اثر رہا۔ تصوف کا مذاق بھی پیدا ہوا۔ کرامتوں اور ملفوظات سے متاثر رہے۔ وارث علی شاہ کے ملفوظات بڑے چاؤ سے پڑھے، مثنوی مولانا روم نے تو جادو کر دیا۔ اب ضمیر کو دھوکہ دیے بغیر کلمۂ شہادت بلاتامل پڑھ چکے تھے۔ الغرض بقول دریابادی:

”ضلالت مطالعہ کے راستے سے پائی، ہدایت بھی بحمداللہ اس کی راہ سے نصیب ہوئی... زندہ شخصیتوں کو دخل خاص ان انقلابوں میں کم ہی رہا“ (آپ بیتی، ص ۲۵۵)

متعین شاہراہ

مکتوبات مجدد سرہندی کا مطالعہ غالباً ۱۹۲۳ء میں ہوا۔ اس نے وہی اثر ڈالا جو تین چار سال قبل مثنوی مولانا روم نے ڈالا تھا۔ مکتوبات نے راہ متعین کر دی۔

”بجائے ادھر ادھر کی آوارہ گردی اور ہر صاحب مزار و آستانے سے لو لگانے کے اب متعین شاہراہ اتباع شریعت کی مل گئی، منزل مقصود متعین ہوگئی کہ وہ رضائے الٰہی ہے اور اس کے حصول و وصول کا ذریعہ اتباع احکام مصطفوی ہے۔“ (۲۵۷)

ورنہ اس سے پہلے آستانوں کے پھیرے، مزارات کے چکر، عرس مخدوم آبکش دریابادی کا دھوم سے منانا، قوالیاں، سماع وغیرہ کا زور بھی تین سال قائم رہا۔

”آپ بیتی“ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مکتوبات پڑھنے اور شاہراہ شریعت متعین ہو جانے کے بعد بھی بعض بزرگوں کی بتائی ہوئی مشقیں شروع کیں۔ تھوڑی بہت کوشش کشف قبور کی بھی کی لیکن گاڑی چل نہ سکی۔

اسلوب نگارش کی ندرت اور جدت

ادیبانہ حیثیت

مولانا دریابادی کی اولین حیثیت راقم کے نزدیک اردو زبان کے بہت

بڑے ادیب اور صاحب طرز انشاپردازکی ہے۔ زبان کی باریکیاں، محاورے، ضلع جگت کا استعمال برجستہ بہترین اشعار سے استشہاد، تنقید و تبصرہ اور طنز کے تو وہ بادشاہ ہیں لیکن وہ پیشہ ورانہ ادیب نہیں تھے یعنی نہ انھوں نے شعر کا کوئی دیوان چھوڑا، چند ڈراموں کو اگر مستثنیٰ کر دیا جائے تو انھوں نے افسانے اور ناول لکھے، کیونکہ ان کے فلسفیانہ مطالعہ پھر ان کے دینی رجحان نے انھیں دوسرے مختلف مفید کاموں میں رکھا۔ لیکن کیونکہ وہ زبان و ادب کا فطری سلیقہ رکھتے تھے اس کو سیکھنے، پرکھنے اور استعمال کرنے پر بڑی محنت و کاوش کی تھی اور اپنے خصوصی اسلوب زبان کے موجد تھے اس لیے انھوں نے علم و فن و فلسفہ و مذہب و تراجم و سوانح و تفسیر کی جس وادی میں بھی قدم رکھا اسے ادبی گل کاریوں سے وادی طور ایمن کی تجلی بنادیا۔

ادبی استفادہ کے ماخذ

مولانا دریابادی نے تحریر و مقالہ نویسی میں کسی کی شاگردی نہیں کی ہے اور خود بخود ادیبوں کے اسالیب سے استفادہ کر کے لکھنا سیکھا ہے۔ کسی سے اصلاح نہیں لی لیکن ضرورت پڑنے پر تحقیق و تدقیق اور پوچھ تاچھ سے اعراض بھی نہیں برتا۔ جن حضرات کے اسالیب زبان و بیان سے استفادہ کیا ہے ان کا مختصر تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

> "حقیقی معنی میں بالکل بے استادا ہوں۔ نہ کسی کی شاگردی کی نہ کسی سے اصلاح لی لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی کے مختلف دوروں میں متاثر بہتوں کی تحریروں سے رہا ہوں اور شعوری و لاشعوری تقلید خدا معلوم کتنوں کے قلم کی کی ہے۔ (پھر یہ نام لکھے ہیں) مولوی احسان اللہ عباسی چریاکوٹی، مولوی ثناء اللہ امرتسری، مولوی نذیر احمد دہلوی، اس کے بعد کے دور میں خواجہ غلام الثقلین، ظفر علی خاں، مولوی عبداللہ عمادی کا رہا اور محض ادب و زبان کی حیثیت سے قائل محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، سجاد حسین، راشد الخیری، ریاض خیرآبادی، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، محمد علی، سید محفوظ علی اور خواجہ حسن نظامی کا رہا ہوں۔ خیر یہ سب تو میرے بڑوں میں ہوئے۔ برابر والوں میں اثر کچھ نہ کچھ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر

احسن گیلانی، مولانا مودودی، مولانا عبدالباری ندوی اور ادب وانشا کے تعلق سے قاضی عبدالغفار، سید ہاشمی فرید آبادی بلکہ چھوٹوں میں بھی رشید احمد صدیقی کا۔ اس وقت نام خیال میں یہی آرہے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور ضرور ہوں گے"۔ (۳۰۷۔۳۰۸)

شبلی کے فیض اور استادی کا اعتراف

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

"پھر بھی اگر کسی کے لیے لفظ استاد کا اطلاق کر سکتا ہوں تو بلا شک وشبہ مولانا شبلی تھے، ان کا ممنونِ احسان دل کی گہرائیوں سے ہوں۔ لکھنا لکھانا جو کچھ بھی آیا ان کی نقالی میں آیا۔ برسوں ان کا چربہ اتارتا رہا ہوں۔ ان کے فقرے کے فقرے، ترکیبوں کی ترکیبیں نوک زبان تھیں۔ اللہ انھیں کروڑ کروڑ جنت نصیب کرے۔ حسنِ ترتیب، صفائے بیان ان کا حصہ تھا"۔ (۳۰۸)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"کہنا چاہیے کہ میری تحریری وتصنیفی زندگی کی جان مولانا شبلی ہی تھے۔ عقیدت مند اسکول ہی کے زمانہ سے ان کی کتابیں اور مضامین پڑھ کر ہو چکا تھا۔ کالج کے زمانہ میں ان کے ہاں حاضری کثرت سے دیتا رہا اور اخیر میں تو ان کے حاضر باشوں میں ہو گیا تھا۔ جو علمی وادبی فیض ان کی صحبت سے حاصل رہا اس کا اب اندازہ کرنا ہی مشکل ہے"۔ (۱۳۶)

شبلی کو پڑھنے کا مشورہ

اسی لیے مولانا دریابادی نے بتدیوں کو اس طرح مشورہ دیا ہے:

"اب بھی میرا مشورہ بتدیوں کے لیے یہی ہے کہ سنجیدہ مضمون نگاری اگر سلیس زبان میں سیکھنا ہے تو مولانا ہی کی کتابوں سے سیکھیے"۔

(آپ بیتی، ص ۳۰۸)

زبان وبیان کی ندرت

مولانا دریابادی نے دوسرے قدیم ادبا اور معاصرین سے بھی زبان و ادب کی خوبیاں سیکھیں۔ مرزا محمد ہادی رسوا، مولوی نذیر احمد دہلوی، سرشار لکھنوی اور ریاض خیرآبادی اور اکبر الٰہ آبادی سے انھوں نے خوب فیض حاصل کیا۔ ان کا جی ان تحریروں پر لوٹ ہوتا رہتا جو سلیس، سادہ، بے تکلف، رواں، سبک بے ساختہ ہوں۔ پرشکوہ عبارتوں میں انھیں خاصہ رنگ تکلف نظر آیا۔ اس لیے محمد حسین آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد کے رنگ وانشار کی داد وتحسین کے باوجود ان کے رنگ کی تقلید کی ہمت کبھی نہیں کی۔

یہ ساری صفات جو مولانا نے لکھی ہیں یعنی سلاست، سادگی، بے تکلفی، روانی، سبک روی اور بے ساختگی سب کی سب مولانا کی تحریروں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں اور راقم کے نزدیک ان کی تحریروں کی جان ادبی چاشنی اور اسلوب نگارش کی ندرت ہے۔

مولانا دریابادی کے مختلف دینی کام

انھوں نے مختلف النوع ادبی، دینی، علمی اور فلسفیانہ کام کیے۔ اسلام سے بیزاری اور عقلی مادیت اور رشنلزم کی تائید کے زمانہ کی تحریریں خود ان کی نظر میں قابل تنقید ہیں اور بعض کتابوں کو انھوں نے اپنی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔

ان کی دینی و مذہبی تصنیفات و تالیفات کی مختصر سرگذشت بھی طویل ہو جائے گی۔ تقریباً تیرہ سال کی عمر میں اسلام سے محبت و تعلق اور لکھنے کے شوق میں مولانا محمد علی رحمانی (مونگیری جو آگے چل کر ناظم ندوۃ العلما رہوئے) ان کے ماہ نامے تحفۂ محمدیہ سے عیسائیوں کے رد میں جو مضامین نکلتے تھے ان کی نقل و ترتیب اور معمولی تبدیلی کر کے خوش خط کاپی پر لکھ کر گویا ایک کتاب تیار کرلی تھی۔ "عقلیت" اور "روشن خیالی" کا جب زور ہوا تو جوش کے عالم میں وہ سارے ورق پارہ پارہ کر ڈالے۔ (۲۷۳)

کتابیں چاک کرنے کے پرجوش داعیہ کا ذکر آگیا تو یکسلے کا بھی تذکرہ کر دوں جس پر ۱۹۱۲ء میں اردو میں کچھ لکھنا شروع کیا اور معنون اپنے علمی و تصنیفی محسن مولانا شبلی کے نام کیا۔ سالہا سال تک یہ مسودہ محفوظ رہا پھر اس کے بعد ایک دن دین داری کے جوش میں آکر اسے چاک کر ڈالا۔

۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی نے سیرۃ النبی کی انگریزی معلومات جمع کرنے کے لیے انھیں پچاس روپیہ ماہوار پر صرف دو گھنٹہ کام کرنے کے لیے رکھ لیا۔ ایک پرجوش مولوی صاحب کے فتوی اور چیخ و پکار پر کہ مولانا شبلی سیرت کا کام ایک ملحد سے کرا رہے ہیں، ریاست بھوپال سے تعلق خراب نہ ہونے کی خاطر وہ اس کام سے سبکدوش کر دیے گئے۔

۱۹۱۴ء میں فرائض والدین نامی ایک رسالہ کالج کے رفیق کی فرمائش پر ایک خادم تعلیم کے نام سے لکھا

۱۹۲۴ء میں ایک کتاب تصوف اسلام پر آٹھ دس مستند کتابوں کو پڑھ کر ان کے مصنفوں کے حالات کے اضافہ کے ساتھ شائع کی جس میں اسلامی عناصر کو یک جا کرنے کی کوشش کی۔ یہ کتاب مقبول عام ہوئی۔

۱۹۲۹ء میں حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہونے اور سفر حجاز کے نام سے اپنا سفرنامہ لکھا۔ یہ کتاب بے انتہا مقبول ہوئی۔ اس میں جوش تاثر اور ادبی کیفیات کا اس طرح حسین امتزاج ہے کہ اس کی بعض تحریریں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں اور کم از کم اردو لٹریچر میں تجلیات کعبہ و رب کعبہ اور مکان و مکیں وغیرہ سے متعلق ایسی تجلی بخش تعبیریں کہیں اور نہیں ملتیں۔

۱۹۳۸ء میں مسلم یونیورسٹی کی مجلس اسلامیت کی دعوت پر ایک خطبہ "اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام" سے پڑھا۔ پھر ۱۹۴۱ء میں اسی مجلس کی دعوت پر "تمدن اسلامی کی کہانی اس کی زبانی" پڑھا۔

۱۹۴۱ء میں رضا اکیڈمی رام پور کی فرمائش پر ایک مقالہ "بعض قدیم مسائل جدید روشنی میں" کے عنوان سے پڑھا۔

۱۹۴۲ء میں مجلس اسلامیات پشاور کی دعوت پر ایک بسوط مقالہ "جدید قصص الانبیاء کے دو باب" کے عنوان سے پڑھا جو بعد کو "قصص و مسائل" کے نام سے کتابی صورت میں چھپا۔

۱۹۵۰ء میں "حکیم الامت یا نقوش وتاثرات" کے نام سے ایک کتاب خطوط کی روشنی میں لکھ ڈالی جو مقبول عام ہوئی۔ اور یہ حضرت تھانوی سے ان کی عقیدت کی جیتی جاگتی دستاویز ہے۔

۱۹۵۲ء میں "محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق" نامی کتاب منظر عام پر آئی۔ یہ دراصل وہ مقالات تھے جو "سچ" کے سولہ سترہ نمبروں میں چھپے تھے۔ نظر ثانی وترمیم واضافے کے ساتھ یہ کتاب سامنے آئی اور مولانا محمد علی سے انھیں جو خصوصی تعلق تھا اس کا اظہار ہوا، اور ان کا لکھنے کا جو قرضہ باقی تھا وہ بے باق ہوا۔

مولانا تھانوی کی ایک کتاب مناجات مقبول ہے جس میں کتاب وسنت کی دعائیں ہیں۔ اس کو عام فہم مختصر شرح وترجمہ کے ساتھ "شرح مناجات مقبول" کے نام سے چھاپا۔ اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔

۱۹۵۴ء میں "اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں" چھپی جو مختلف مضامین ونشریات کا مجموعہ تھا۔

۱۹۳۳ء میں انگریزی تفسیر قرآن پاک کی طرف ایک صاحب نے توجہ دلائی لیکن اس عظیم اور وسیع وعریض کام کی اپنے اندر صلاحیت نہ پاتے ہوئے مولانا نے بڑی ہچکچاہٹ محسوس کی لیکن بہرحال یہ کام شروع ہوا اور ۱۹۳۹ء میں مکمل ہوا۔ انگریزی داں اس تفسیر کی تعریف کرتے ہیں۔

انگریزی کام کے دوران ہی اردو تفسیر کی ہمت ہوئی اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے ترجمے وتفسیر بیان القرآن اور عربی کے بے شمار تفسیری ولغوی مراجع سامنے رکھ کر اور نئی یوریین واجتماعی وسائنسی تحقیقات کی روشنی میں تحقیقی وعلمی وادبی زبان میں اسے مکمل کیا اور پھر آخر عمر تک بار بار اس پر نظر ثانی کرتے رہے۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک قرآن سے متعلق چند کتابیں لکھیں۔ حیوانات قرآنی، جغرافیہ قرآنی، قرآنی شخصیات، ایک کتابچہ اعداد القرآن کے نام سے بھی غیر مطبوعہ ونامکمل ہے۔

جنوری ۱۹۵۸ء میں "سیرت نبوی قرآنی" کے نام سے ایک اچھوتے موضوع پر لکچرز دیے جو بعد میں "بشریت انبیاء قرآن مجید میں" کے عنوان سے چھپے۔ فضائل انبیاء سے تو اردو لٹریچر بھرا ہوا ہے۔ لیکن ان کی بشری زندگی غلو فی العقیدت کی وجہ سے تقریباً روپوش ہے۔

اس کتاب نے اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۹۶۸ء میں شاہ ولی اللہ کی انتخاب کردہ "چہل حدیث مع اردو ترجمہ کے ایک پاکستا
ماہ نامہ میں چھپیں۔ مولانا نے انھیں اپنالیا اور "چہل حدیث ولی اللہی" کے نام سے اس کی شر
کے ساتھ اسے مرتب کر دیا اور اس پر مسرت کا اظہار کیا کہ اس طرح انھیں حدیث کی خدمت
بھی کچھ موقع ملا۔

مولانا کی اسلامی و مذہبی اہم تحریروں کا یہ انتہائی مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ بہت سی ایسی
چیزوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے جو براہ راست اسلامی خدمت میں داخل نہیں ہیں۔ جیسے مکاتیب
وغیرہ یا جیسے مقالات وانشار وغیرہ سے متعلق کتابیں، حالانکہ ان میں بھی خاصہ دینی عنصر موجود
ہے۔ اسی طرح سچ اور صدق کے تقریباً پچاس سالہ فائلوں میں مذہبی و دینی مضامین بے شمار
ہیں جن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے جو کسی اسکالر کی تحقیق و ترتیب اور کسی اکادمی یا پبلیکیشن
ہاؤس کی توجہ کے محتاج ہیں۔

انفرادی شان

راقم الحروف یہاں ان کے ایک دوسرے انفرادی کارنامہ کا تذکرہ مناسب سمجھتا ہے وہ یہ کہ
انھوں نے سچی باتوں کے زیر عنوان آسان، شستہ، ادبی، طنزیہ زبان اور اچھوتے اسلوب بیان
میں خبروں پر مختصر تبصروں کا جو طریقہ اختیار کیا تھا اس کو ہزاروں لاکھوں انسان شوق و اشتیاق
سے پڑھتے تھے اور اس کے انتظار میں لمحات گنتے تھے۔

مغربی افکار پر تنقید

خصوصیت کے ساتھ مغربی افکار پر ان کا ہجوم بہت سخت ہوتا تھا۔ کیونکہ مغربی تہذیب
کے زہریلے اور خبیث جراثیم نے انھیں اس طرح درہم وبرہم اور برباد کر دیا تھا کہ اگر خدا کی
دستگیری نہ ہوتی تو وہ الحاد ولادینی اور دہریت کے اندھیروں میں عقل وخرد اور ہوش مندی
وروشن خیالی کے نام نہاد دعووں کے ساتھ بھٹکتے رہتے۔ وہ چاہتے تھے کہ جدید تعلیم یافتہ نسل کو

یورپین تہذیب وثقافت، عقائد ورجحانات اور افکار وخیالات سے تحقیقی واستدلالی اور عقلی و مشاہداتی تجربوں کی روشنی میں بچانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے تحقیقی واستدلالی وعلمی مضامین بھی لکھے اور ہلکی پھلکی ادبی زبان میں اور طنزیہ اسلوب میں اور مغربی مفکرین کے اعتراضات کی روشنی میں ایسے جان دار تبصرے کیے جس سے مغربی تہذیب کا طلسم برتری ٹوٹ گیا اور اس کا کریہہ اور بدنما چہرہ اپنی لادینیت، بدعقیدگی، بےحیائی، بداخلاقی، آوارگی، سیاسی مکاری اور افترا پردازی کے ساتھ بےنقاب ہوگیا۔

اکیڈمی کا کام

اسی طرح اسلامی تعلیمات کی برتری اور عقل انسانی سے ہم آہنگی کے موضوعات پر بھی سیر حاصل بحث کی۔ مولانا نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا یا جو تبصرے کیے ان کے اگر عنوانات قائم کیے جائیں تو بلامبالغہ سیکڑوں تک پہنچ جائیں۔ اور اگر ان کے صفحات کا شمار کیا جائے تو لاکھوں سے کم نہ ہوں کہ وہ سچ، صدق اور صدق جدید کی تقریباً پچاس سالہ جلدوں اور ان کی پچاس سے زیادہ کتابوں اور طویل تفسیر قرآن میں موجود ہیں۔ اور کسی بھی مضمون نگار بلکہ کتاب لکھنے والے کے بس کی بھی یہ بات نہیں ہے کہ ایک مضمون یا ایک کتاب میں یہ سب مواد جمع کر دے۔ اس کے لیے اردو اکیڈمیاں ہیں یا عبدالماجد دریا بادی اکیڈمی کا قیام ہو۔ جو الگ الگ موضوعات پر ریسرچ اسکالروں سے کام کرائے اور ان کی تحریریں از سرِ نو طبع ہوں اور ان سے استفادہ کیا جائے اور ان کی صحیح قدر وقیمت کا اندازہ لگایا جائے اور تنقید وتبصرہ شامل ہو۔

سائنس کا فتویٰ

شراب خانہ خراب کے نقصانات کے پیش نظر ہندو، مدراس۔ ۴ رمئی ۱۹۴۱ء سے مولانا نے ایک اقتباس پیش کیا ہے۔ ”اس کی کوئی وجہ نہیں کہ الکحل کی بوتلوں میں ”زہر“ کا لیبل چسپاں نہ ہوا کرے بالکل اسی طرح جیسے سنکھیا، کاربولک ایڈ وغیرہ دوسرے زہروں کی شیشیوں پر رہا کرتا ہے۔“ اس خبر پر تبصرہ ایک خاص انداز سے کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"کسی واعظ نے نہیں، کسی ٹمپرنس ایسوسی ایشن کے ممبر نے نہیں، امریکا کی مشہور یونیورسٹی ہارورڈ کے ڈاکٹر مور نے الکحل کانفرنس کے موقع پر کہا۔ اور الکحل کانفرنس ایک خالص سائنٹفک مجلس تھی، شراب کے جواز و عدم جواز سے اسے کوئی تعلق ہی نہیں۔ لیکن اس زہر خالص کو بھی "حرام" کوئی "روشن خیال" حکومت کیسے قرار دے دے! اس کی اجازت، اس کی تجارت، اس سے حصول منفعت، اس کا نام "رواداری" ہے۔ یہ جگر صرف شریعت اسلامیہ ہی کا تھا کہ ان ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کی تحقیق و تدقیق سے ساڑھے تین سو برس پہلے اسے حرام قطعی قرار دے دیا!"

بدنسبوں کے حقوق

روس کی ایک ذمہ دار خاتون نے اپنی کتاب "عورت سوویٹ روس میں" کے اندر شادی بیاہ کے نئے ضابطوں میں جو تبدیلیاں اور جدتیں ہوئی ہیں ان کی تفصیل لکھی ہے۔ زار کی حکومت کے زمانہ میں ۱۹۰۲ء تک ناجائز بچہ نہ باپ کی طرف منسوب ہوتا تھا نہ ماں کی جانب۔ اس کے بعد انگلستان، جرمنی، فرانس وغیرہ یورپ و امریکہ کے اکثر ملکوں کے دستور کے مطابق وہ ماں کی جانب منسوب ہونے لگا۔ سوویت روس نے اول روز سے اصلاح یہ کی کہ قانونی رشتہ کی بنیاد محض خونی رشتہ کی نہ کہ ضابطۂ نکاح کو قرار دیا۔ اور اس طرح "ناجائز ولادت" کا تخیل ہی سرے سے مٹا دیا۔ مولانا نے اس پر جو تبصرہ کیا ہے ہم اس کا ایک مختصر آخری حصہ پیش کرتے ہیں:

"بیان روس کے کسی مخالف و معاند کا نہیں، ایک ایسی ذمہ دار خاتون کی زبان سے ہے جو خود اسی روس کمیونزم کی زبردست مداح و معتقد اور اس پر ایک ضخیم کتاب کی مصنف ہیں۔ حرامیوں کے حقوق کی وکالت اتنی پر زور اس سے قبل کبھی کیوں کی گئی ہوگی؟"

صدق کے اس صفحہ پر "آزاد عورت" کے عنوان سے اسی خبر کا مزید تکملہ ہے جس میں "ابن الزنا" کی پرورش کے خرچ وغیرہ کی تفصیل ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اگر عورت کے کئی مردوں سے تعلقات ہیں تو خرچہ تو سب کو حسب حیثیت دینا ہوگا لیکن بچہ کو بدنامی سے بچانے کے لیے سب سے زیادہ

یا حیثیت شخص کا نام باپ کے خانے میں اندراج کیا جائے گا۔

اس آوارگی، حرام کاری، جنسی انارکی اور بے راہ روی پر مولانا کا جاندار تبصرہ ملاحظہ ہو:

"اور یہ پرانی دقیانوسی "اسلامی" تعلیم! یہ اب تک نکاح و سفاح کے فرق، حلال و حرام کے امتیاز پر زور دیے چلی جارہی ہے! اور یہ نہیں دیکھتی کہ دنیا اپنی روشن خیالیوں اور ترقیوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانہ میں، اسلام سے قبل، عرب جاہلیت میں بھی دستور یہی تھا۔ ولایت کی ذمہ داری خود عورت چند مردوں میں سے کسی پر ڈالتی، یا کبھی ماہرین قیافہ شناس اس کا فیصلہ صادر فرماتے۔ روشن خیالیوں کے ڈانڈے جاہلیت جدید کے پھر اسی جاہلیتِ قدیم سے مل کر رہے!"

آوارگی یا قید نکاح

اسلام کے قانون تعدد ازدواج پر ہر زمانہ میں دشمنان اسلام نے اعتراض کیے ہیں۔ لیکن جو قومیں یک زوجگی کی قائل ہیں کیا وہ ایک بیوی پر قناعت کیے ہوئے ہیں اور کیا ان کے ہاں آوارگی کے نام سے اور یاری اور بوائے فرینڈ، گرل فرینڈ کے نام سے باقاعدہ آشنائی اور حرام کاری کا رواج عام نہیں ہے؟ اور کیا ان ستم رسیدہ بن بیاہی ماؤں اور لڑکیوں کا سوسائٹی میں کوئی درجہ بھی ہے؟ مولانا نے متعدد بار اس موضوع پر تبصرہ کیا ہے۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۵۶ء کے صدق جدید میں ایک یورپین عورت کے تاثرات نقل کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"مغرب کے شہروں میں ہزارہا بدبخت عورتیں جو رات کے وقت سڑکوں پر مجمع لگائے رکھتی ہیں۔ جب ہم ان پر نظر کرتے ہیں تو یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مغرب کس منھ سے اسلام کے تعدد ازدواج کی مذمت پر منھ کھولتا ہے۔ عورت کے حق میں یہ بہتر بھی ہے اور راحت انگیز بھی۔ اور معزز تر بھی کہ وہ اسلامی تعدد ازدواج کی قید میں رہے۔ صرف ایک شوہر کے ساتھ منکوح ہو کر اور اپنا جائز بچہ اپنی گود میں لیے ہوئے بمقابلہ اس کے کہ اس سے آشنائی کی جائے اور پھر اسے سڑکوں پر آوارہ گردی کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ ناجائز بچے لیے ہوئے، قانون کے دائرہ سے باہر، بے گھر، بے در ہو کر،

ہر راہ گیر کی ہدف بنی ہوئی، ہر شب ایک نئی شب، مادریت کے ناقابل اور ہر ایک کی نظر میں ذلیل"۔

مولانا کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

"الفاظ کسی مسلمان بلکہ کسی مشرقی کے بھی نہیں، ایک خالص مغربی کے ہیں اور مغرب کے بھی کسی مرد کے نہیں۔ ایک محترم خاتون مسز فینڈٹ کے ہیں۔ یہ ہے اسلام کی وہ پالیگمی (تعدد ازدواج) جس کے نام تک سے تجدد زدہ ملت اسلامی کو شرم سی محسوس ہونے لگی ہے۔ اور خود یورپ اپنے سیکڑوں سال کے تجربہ کے بعد اسی کی طرف یوں بڑھ رہا ہے"۔

طلاق بہ طور فیشن

اسلامی طلاق پر مسیحیوں کی طرف سے صدیوں سے اعتراض ہوتا رہا ہے اور مغربی تہذیب کے پروردہ بھی تعدد تعلقات کے حرام طریقوں کو حلال کرنے کے بعد اسلامی طلاق و تعدد ازدواج پر اعتراض کرتے رہے ہیں۔ مولانا نے پروفیسر مورنسن کی کتاب سے یورپ میں طلاق کے جدید رواج اور کثرت پر یہ قطعہ نقل کیا ہے:

"آج جہاں ایک طرف ناکام شادیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور ہر شادی میں ناموافقت کے موقعے زیادہ ہوتے جاتے ہیں، وہیں انقطاع تعلق کی نو پیدا آسانیوں کے اثرات بھی ظاہر ہو رہے ہیں، یہاں تک کہ طلاق میں اب عورت کے لیے کوئی عیب ہی نہیں رہا ہے۔ اب طلاق عورت کے لیے نہ باعث ذلت رہی ہے نہ باعث شرم۔ بلکہ کثرتِ وتوسع اور عموم کی بنا پر اب تو وہ داخل فیشن ہو چکی اور موجب عزت بن چکی ہے"۔

اس پر مولانا کے چند جملے کتنے موثر ہیں:

"کہیے، اب بھی اسلامی طلاق پر طعن کا حوصلہ باقی ہے؟ اسلامی طلاق بھی چھوڑ دیجیے "جاہلیت" میں بھی طلاق کی گرم بازاری کیا اس سے کچھ زیادہ تھی؟"

سائیت اور عریانی

آزادیٔ نسواں کی تحریک اور نامنصفانہ امتیازات کو ختم کرنے کی آواز تمدن جدید کی خاص راز ہے۔ امتیازات مٹانے کی ایک عجیب وغریب شکل یہ سامنے آئی ہے کہ یورپ وامریکا میں ریانی اور برہنگی کے کلب موجود ہیں، اور بے حیائی، آوارگی اور جنسی انارکی کو پوری طرح تقویت یازات لباس مٹاکر مساوات مرد وزن کو ایک سطح پر لانے کی پرزور تحریک پر قائم ہے جہاں دم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں ایک دوسرے کے سامنے جھنڈ کے جھنڈ مادرزاد ننگے رہتے ہیں۔ رآن پاک نے حکم خداوندی سے انحراف کی صورت میں "بدت لھما سوا تھما" جو ارشاد رمایا ہے تو پھر بداخلاقی وبے حیائی اور حکم عدولی کے اس یوروپین وامریکن مزاج کو قدرت کی سزا س سے بڑھ کر اور کیا مل سکتی ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں وہ اپنی شرافت، عزت اور ستر پوشی کا باس اتار پھینکے۔ مولانا نے پارسلی کی کتاب "عریانی جات جدید میں" سے چند اقتباس پیش کیے ہیں بعض ملاحظہ ہوں:

> "تمدن جدید کی تحریک یہ ہے کہ دونوں صنفوں کے درمیان نامنصفانہ امتیازات کو مٹادے اور دونوں کے درمیان مساوات حقوق قائم کردے... ادنیٰ غور سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ مسلک بے لباسی تحریک نسائیت کا زبردست معین ہے، کیونکہ یہ مسلک لباس کا امتیاز دونوں میں مٹاہی دیتا ہے اور دونوں کو ایک ہی جامۂ بے لباسی میں ملبوس کردیتا ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ عورت کو مرد کے قریب اور مرد کو عورت کے قریب لے آنے، اور دونوں کو ایک دوسرے کے ہو بہو دیکھ لینے کے موقعے بہم پہنچادینے کے لحاظ سے مسلک بے لباسی تحریک نسائیت کی عین تکمیل ہے، اور بے لباسی کا یہ ایک بہترین واہم ترین ثمرہ ہے۔"

مولانا اس پر تبصرہ کرتے ہیں:

> "ننگوں اور ننگیوں کی یورپ میں جو ترقی ہے اس کا ذکر ان صفحات میں کبھی کبھی آچکا ہے۔ مہذب دنیا میں ان تہذیب مجسم ہستیوں کی جابجا مستقل آبادیاں ہیں۔

کلب میں.... اخبارات میں.... اور ان کے اس مسلک عریانی کا ایک مستقل فلسفہ یورپ کے حسب دستور ایک شاندار علمی اصطلاح Gymnosophy کے نام سے چلا ہوا ہے۔ اسی برگذیدہ گروہ کے ایک سر برآوردہ رکن یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ ہماری تحریک تحریکِ آزادیٔ نسواں سے الگ کب ہے۔ یہ تو عین ان کی متمم و مکمل ہے، عین اس کی دوست و حلیف ہے۔ مبارک ہو تجدد نواز دوستوں کو یہ نیا حلیف!"

الفاظ کا نقاب

مغربی تہذیب نے مجرمانہ الفاظ کی سختی کم کرنے کی ایک مہم چلائی ہوئی ہے تاکہ بے راہ روی اور بدکرداری کی راہ ہموار ہو اور ذہنوں میں ان کی نرمی پیدا ہو جائے۔ مولانا دریابادی نے خطبات ماجدی میں حیات اللہ انصاری کے نام ایک خط میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حاشیہ نگار نے اس سلسلہ میں مولانا کا ۱۹ر اگست ۱۹۶۱ء کے صدق کا ایک شذرہ نقل کر دیا ہے جو طویل ہونے کے باوجود پورا نقل ہونے کے قابل ہے اور اس سے مولانا کے نفسیاتی علوم پر مہارت کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

"اردو اخباروں میں ایک نیا لفظ بعض انگریزی خبروں اور مضمونوں کے ترجمے میں آپ پڑھ رہے ہوں گے "ہم جنس"۔ لفظ فی نفسہٖ نیا نہیں۔ لیکن اب تک بالکل ہی دوسرے معنی میں آتا تھا "ہم جنس" اور "غیر جنس" ایک دوسرے کے مقابل لفظ تھے اور "اشتراک قسم" اور "اختلاف قسم" کے مفہوم میں خاص و عام کی زبان پر چلے ہوئے تھے۔ اس کے سوا کوئی مفہوم ان کا اردو میں نہ تھا۔"

جدید استعمال کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"اردو میں اب تک اس کے لیے الفاظ، اغلام و لواطت، امرد پرستی وغیرہ رائج تھے اور بالکل صحیح تھے۔ لیکن فرنگی ذہن و دماغ نے عرصہ سے اب اپنا ایک طریقہ یہ بھی رکھا کہ جرائم و بدکرداریوں کے لفظ جواب تک چلے آرہے تھے، ان سب کی جگہ نرم اور معصومانہ لفظ چلا دیے جائیں تاکہ لغت و ادب کی راہ سے بھی خود ان جرموں

اور گناہوں کے لیے راہ ہموار ہوتی جائے اور ان کی طرف سے دلوں میں ناگواری و بیزاری کے اثرات جاتے رہیں۔ منھ کالا کرنے، حرام کاری، زنا کاری کے بجائے (Free Love) آزاد محبت، منع حمل کے بجائے "خاندانی منصوبہ بندی" اوباشی اور بدمعاشی کے بجائے محض "بداخلاقی" یہ سب مثالیں اسی ذہنیت کی ہیں۔

مغرب اپنی شیطانی ذہانت سے کام لے کر برابر نئے، نرم، خوشنما الفاظ کا جال پھیلاتا جاتا ہے اور بھولا بھالا، سادہ دل مشرق برابر اس جال میں پھنستا چلا جاتا اور جرم و معصیت میں گرفتاری کے لیے راستہ صاف کرتا جاتا ہے۔"

قانون، خدائی یا انسانی

۳۰ رجون ۱۹۴۱ء کے صدق میں ہندو عورتوں کے حقوق کی کمیٹی کے حدود اختیارات بڑھا دیے جانے کی تجویز پیش کی ہے تاکہ وہ صرف جائداد کے حقوق پر غور کرنے کے بجائے سارے ہندو قانون پر غور و تبصرہ شروع کرے۔ اس کی تفصیلی خبر دینے کے بعد مولانا دریابادی نے جو اصولی تبصرہ فرمایا ہے وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے:

> "یہ مصیبت ہمارے ہندو برادران وطن کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہر وہ قوم جس کا قانون "انسانی" ہوگا، انسانی دماغوں کا شرمندۂ احسان ہوگا۔ بشری عقل و کاوش کا نتیجہ ہوگا، اس کے لیے یہ دن پیش آنا ناگزیر ہے۔ زمانہ کے حالات کی گردش کے ساتھ قانون و ضابطہ میں تبدیلی لازمی ہے۔ یہ وصف کہ وہ ہر ہر ملک، ہر قوم، ہر زمانہ کے لیے کافی ہو صرف اس قانون میں ممکن ہے جو خدائی ہو۔ خالق کائنات کا نازل کیا ہوا ہو اور زمان و مکان کے قیود سے بالاتر ہو! یہی فرق ہے اسلامی شریعت اور دنیا کے سارے قوانین و ضوابط میں۔ تجدد غریب اسی فرق کو نظر انداز کیے غیروں کی "ترقی" سے مرعوب، ان کے شوق تقلید میں مست، اپنے ہاں کے قانون کی بھی ترمیم کی فکر میں گھلا جا رہا ہے۔"

مسلم کہلانے سے شرم

۱۱ر مئی ۱۹۵۶ء کے صدق میں ایک خبر چھاپی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کلکتہ کے مسلم چیمبر آف کامرس نے لفظ مسلم سے دست بردار ہو کر اپنا نام اوریئنٹ چیمبر آف کامرس رکھ لیا۔ اخبار نے شری گولوالکر کی یہ تلقین بھی درج کی تھی کہ اگر مسلمان ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں تو انھیں ہندو بن کر رہنا ہوگا۔ اس پر تبصرہ مولانا دریابادی نے اس طرح کیا:

"لفظ مسلم سے دست برداری کی ہوا تو ۴۷ء، ۴۸ء میں چلی تھی اور اس وقت مسلمانوں کی ڈری سہمی ہوئی ذہنیت اور دہشت زدگی کی بنا پر کسی حد تک سمجھ میں بھی آسکتی تھی۔

اب ۱۹۵۶ء میں اس کا اعادہ اور وہ بھی یوپی یا ایم پی میں نہیں بلکہ کلکتہ جیسے شہر میں جہاں مسلمان بحمداللہ سر اٹھا کر چلتا پھرتا ہے، یقیناً حیرت انگیز ہے اور عبرت انگیز بھی۔"

قوم پرستی کی تخم ریزی کس نے کی

مولانا قومیت پرستی کے جو مفاسد ہیں ان سے پوری طرح واقف تھے۔ دنیا میں عظیم ترین دونوں جنگوں اور تمام خوں ریزیوں، تعصب، فرقہ واریت اور اکثر رذائل کا ظہور اسی پرجوش قوم پرستی کی وجہ سے ہوا ہے۔ گو اس کے بعض مفید پہلو بھی ہیں۔ لیکن اکثر قومیں اس کے مضر پہلو ہی سے مضرت اور نقصان اٹھا رہی ہیں۔ "پنڈت نہرو اور اسلامی تہذیب" کے عنوان سے مولانا نے صدق مورخہ ۹ر جون ۱۹۴۱ء میں ان کے ایک مضمون سے چند اقتباسات پیش کیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک ترکی، مصر، عراق، شام اور ایران نے عہد وسطیٰ کے خیالات کو قطعاً ترک کر دیا ہے۔ وہ سب انتہا درجے کے قوم پرست ہیں۔۔۔ ان میں کے بعض ممالک تو تہذیب قبل از اسلام کو زندہ کر رہے ہیں وغیرہ۔ اس پر مولانا دریابادی کا تجزیہ ملاحظہ ہو:

"پنڈت جی کا یہ بیان واقعات کے اعتبار سے صحیح ہے۔ بلاشبہ ترکی، شام، مصر اور عراق وغیرہ میں جامعہ اسلامیہ کے بجائے قوم پرستی کی وبا چل رہی ہے۔ مگر کیا پنڈت جی یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قوم پرستی اور وہ بھی جارحانہ قوم پرستی نوع انسانی کے لیے کوئی بہتر چیز

ہے؟ کیا انھیں اس بات سے انکار ہو سکتا ہے کہ ان ممالک میں قوم پرستی کی تخم ریزی یورپ اور امریکا نے کی ہے؟ اور اس لیے کی ہے کہ اخوت اسلامیہ، مساوات اسلامیہ اور وحدت اسلامیہ کو، جس سے یورپ ہمیشہ لرزاں و ترساں رہا، ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے اور قوم پرستی کا سبز باغ دکھا کر عربوں کو ترکوں سے اور ترکوں کو عربوں سے جدا کر دیا جائے۔"

پھر مولانا نے انگلستان کے مصنف والٹر تھیمر کا یہ پیراگراف پیش کیا:

"۱۹۱۴ء کی جنگ میں اس قوم پرستی کا نشانہ سب سے پہلے ترکوں کو بنایا گیا، اور عربوں نے اپنی آزادی کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ گذشتہ جنگ میں عربوں نے ترکوں کے مقابلہ پر برطانیہ کا ساتھ دیا تاکہ عرب ممالک کو آزادی مل جائے۔"

پھر مولانا لکھتے ہیں:

"جس مقصد کے لیے عیسائی مشنریوں نے عربوں میں قوم پرستی کے جراثیم پھیلائے تھے وہ آخر کار پورا ہو کر رہا، اور عربوں نے اسلامی وحدت اور اسلامی اخوت کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ہم مذہبوں سے تو جنگ کی اور کفار ناہنجار کا ساتھ دیا۔ اور یہی مقصد تھا عیسائی مشنریوں کا کہ مسلمان، مسلمان سے جدا ہو جائے اور انھیں قوم پرستی کا ایسا چسکا لگ جائے کہ وہ قیامت تک متحد نہ ہو سکیں۔"

خواب کی حقیقت

یہاں تین اقتباس خطوط ماجدی سے پیش کرتا ہوں۔ پہلا خواب کی حقیقت سے متعلق ہے۔ خواب تقریباً پانچ قسم کے ہوتے ہیں۔ ابن حزم اور دوسرے علما نے ان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مولانا نے ان قسموں کو تین قسموں میں ملا کر بیان کیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کے نام ایک خط مورخہ ۱۰ر جون ۱۹۳۴ء، اور اس سے قبل یورپین نظریات بھی بیان کیے ہیں:

"یورپ ابھی ماہیت خواب کے بارے میں خود ہی متفق نہیں۔ ایک گروہ اس کا قائل ہے کہ حالتِ نوم کی فعلیت دماغی کا نام خواب ہے۔ سیکالوجی کے قدیم ماہرین یہ کہتے ہیں کہ حالت نوم جس قسم کے مہیجات پر عامل (حامل؟) ہوں گے انھیں کے

مطابق مگر زیادہ مبالغہ آمیز صور و اشکال کے ساتھ مناظر خواب نظر آئیں گے۔ آخری اور اس وقت کا سب سے زیادہ مقبول نظریہ ... یہ ہے کہ حالت بیداری میں جو خیالات' جذبات وخواہشات شعور کے سامنے آتے ہوئے ہچکچاتے ہیں وہ حالت نوم میں شعور خفی کے سامنے ابھر آتے ہیں اور یہی خواب ہے۔

اسلام نے کہیں یہ تصریح ماہیت خواب بیان نہیں کی ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے تین قسم کے خواب متبادر ہوتے ہیں۔ (۱) اضغاثِ احلام محض خیالات پریشاں، جس طرح بیداری میں اکثر بے سروپا خیالات آتے رہتے ہیں۔ (۲) خواب مبنی بر حقیقت یا تعبیر طلب۔ مثلاً شاہ مصر کا خواب یا یوسفؑ کے رفقائے زنداں کا خواب۔ جس شخص کا قلب ونفس جس قدر زائد مطہر و مزکّٰی ہوگا، اسی قدر ان خوابوں کے معنی سمجھ سکے گا۔ (۳) انبیاء کا خواب جو بمنزلہ وحی کے ہوتے ہیں۔" (ص ۲۳-۲۴)

سورۂ فاتحہ کی معنویت وجامعیت

انگریزی جاننے کا فائدہ یہی ہوا کہ انھوں نے انگریزی میں تفسیر لکھی اور اردو تفسیر میں بھی جابجا انگریزوں کے اقوال وآراء سے استدلال کیا۔ سورۂ فاتحہ کی جامعیت پر رقم طراز ہیں:

"سورۂ فاتحہ گو صورۃً مختصر ہے۔ لیکن بلحاظ معنویت وجامعیت گویا دریا کوزہ میں بند ہے۔ منکرین ومخالفین تک اس کے ایجاز کے اعجاز کے قائل ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے "حمد باری کی یہ زبردست مناجات ... سلیس اتنی کہ مزید تشریح سے بے نیاز، اس پر معنویت سے لبریز۔"

بسم اللہ قوت بخش ذکر

بسم اللہ سے ہر کام کی ابتدا کرنے کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"ہر کام کی ابتدا بسم اللہ سے کرنے کی بڑی فضیلتیں حدیث میں وارد ہوئی ہیں اور خود رسول اللہ صلعم کی عادت مبارک یہی تھی کہ کھانا کھاتے، پانی پیتے، جانور

ذبح کرتے، غرض اس قسم کے سارے کاموں کی ابتدا بسم اللہ ہی سے کرتے تھے۔ اور یہ بھی یہی کہ جو شخص کسی کام کو خدائے رحمٰن و رحیم کا نام لے کر شروع کرتا ہے، وہ عملاً اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ میرا ضمیر پاک ہے۔ میری نیت مخلصانہ ہے۔ میرا مقصد اعلیٰ ہے اور میں توحید کا پرستار ہوں۔ ایک طرف شرک سے دوسری طرف الحاد سے بےزار۔ غرض بسم اللہ سے بڑھ کر قوت بخش اور اس سے زیادہ روح و اخلاق کو بلند کرنے والا ذکر اور کوئی نہیں۔"

لفظ اللہ کا ترجمہ

آج کل یہ بحث چلی ہوئی ہے کہ لفظ خدا کا استعمال جائز ہے یا نہیں اور صرف اللہ کا استعمال ہونا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ "اللہ" جامع و شامل ہے اور اس کا ترجمہ کسی زبان میں ممکن نہیں۔ لیکن دوسرے کسی لفظ کا استعمال کسی دوسری زبان میں جائز ہی سمجھا جائے گا جب تک کہ قرآن پاک کے ترجمے یا ترجمانی یا معانی قرآن کے ترجمے وغیرہ مطلق طور پر حرام نہ کر دیا جائے۔ مولانا نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

"اللہ خدا کے لیے اسم ذات ہے۔ کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ فارسی کے "خدا" یا انگریزی کے "گاڈ" کی طرح اسم نکرہ نہیں کہ معبود واحد کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی بولا جا سکے۔ اس کی نہ جمع آتی ہے نہ تثنیہ۔ نہ یہ کسی لفظ سے مشتق ہے، اور نہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن ہے۔"

بیٹا اور روح القدس

مولانا دریابادی الرحمٰن الرحیم کے دوران لکھتے ہیں:

"اسلام کے اس خالص توحیدی کلمہ کے مقابلے میں اب مسیحیت کا فقرۂ افتتاحیہ ملاحظہ ہو، "شروع باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے" کوئی نسبت اس شرکِ جلی کو اسلام کی توحید خالص سے ہے؟"

رب یعنی مربی

فرماتے ہیں:

"اردو میں اس کا ترجمہ پروردگار بھی صحیح ہے لیکن قریب ترین لفظ اس مفہوم کے لیے "مربی" کا ہے ... اصول ارتقاء جس پر یورپ کو ناز ہے ذرا خیال کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی پوری رعایت لفظ "رب" میں آگئی ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں کسی شئے کو درجہ بدرجہ حد کمال تک پہنچانا۔ یہ ارتقا ہے۔ یہاں مراد اس کا اصل اصول ہے نہ کہ ڈارون وغیرہ کے بیان کیے ہوئے قاعدے اور ضابطے۔"

مسلمانوں کا خدا مالک اور قادر مطلق

اس سلسلہ میں مولانا کہتے ہیں:

"ہندوستان کی بعض مشہور و مشرک قوموں کا عقیدہ ہے کہ قانونِ مکافات (ہندی اصطلاح میں "کرم") کے خلاف خدا بھی نہیں جا سکتا اور کسی خطا وار کو معاف نہیں کر سکتا۔ مسیحیوں کا بھی عقیدہ یہ ہے کہ خدا انصاف کرنے پر مجبور ہے اور اسی لیے صفت عفو و رحم کے اظہار کے لیے، اسے اپنے اکلوتے "بیٹے" کو بطور کفارہ کے سب گناہ گار مخلوق کی طرف سے پیش کرنا پڑا۔ قرآن مجید کے ایک لفظ 'مالک' میں ان سب باطل عقائد کی تردید آگئی۔ اسے اختیار کامل ہے کہ جس مستحق سزا کو چاہے سزا دے اور جس مجرم کو چاہے بعد سفارش یا بلا سفارش بالکل ہی معاف کر دے۔"

شرک کی گنجائش نہیں

ایاک نعبد وایاک نستعین کی تفسیر میں چند جملوں میں تاریخی و عقائدی حقائق کا اظہار مولانا اس طرح کرتے ہیں:

"مشرک قومیں خدا معلوم چھوٹے بڑے کتنے دیوی دیوتاؤں کو عبادت میں شریک

کرتی رہتی ہیں۔ بلکہ ان کی عبادتوں میں تو خدا کی شرکت رہنے بھی نہیں پاتی۔ معبود تمام تر اگنی دیوتا اور سورج دیوتا اور کالی مائی اور لچھمی جی وغیرہا بن جاتی ہیں۔ مسیحیوں کے ہاں بھی نماز جیسی اور جب بھی ہوتی ہے اس میں، برابر خدا کے ساتھ فرزند خدا کی شرکت رہتی ہے۔ آیت کے ایک لفظ "ایاک" سے تردید ہوگئی سارے مشرکانہ مذہبوں کے طرز عبادت کی۔"

ہر قسم کی غیر اللہ پرستی کی تردید

استعانت کی مختصر شرح کے بعد یہ کتنی صحیح بات لکھی ہے:

"آیت نے جڑ کاٹ دی ہے ہر قسم کی مظہر پرستی، فرشتہ پرستی کی۔ شرک کی خفی سے خفی راہیں بند کر دی ہیں اور کوئی خفیف سی بھی گنجائش پیر پرستی، پیغمبر پرستی، فرشتہ پرستی وغیرہ کی باقی نہیں چھوڑی ہے۔"

غضب الٰہی کا مفہوم

مولانا لکھتے ہیں:

"حیرت ہے کہ بعض جدید اہل قلم نے مسیحی پادریوں کے طعن وطنز سے متاثر بلکہ مرعوب ہو کر اسلام میں غضبِ الٰہی کے وجود ہی سے انکار کر دینا چاہا۔ گویا حق سبحانہٗ تعالیٰ ان کم فہموں کے خیال میں ایک بڑے پیمانہ پر کوئی سادھو، سنیاسی، مہاتما ہیں کہ جو بد بخت چاہے ان کے بنائے اور اتارے ہوئے قوانین کو جو سرتاسر بندوں ہی کے نفع و مصلحت، فلاح و بہبود کے لیے ہیں۔ آزادی و بے تکلفی سے توڑتا، پھوڑتا، چیرتا پھاڑتا رہے اور وہ اہمسا پر عمل کر کے شانتی کے ساتھ، جمود و تعطل کے ساتھ سارا تماشہ دیکھتا رہے اور اصلاح حال کے لیے نہ اپنی غیر محدود قوت اور لامتناہی توانائی کو حرکت میں لائے اور نہ دفع فساد کے لیے کوئی عملی اقدام کرے۔ پادریوں کے اعتراض کی اصل و بنیاد ہی غلط ہے۔ انھوں نے غضب الٰہی کو بھی قیاس کیا انسانی غصہ اور

طیش پر جو نتیجہ ہوتا ہے نفس کی انفعالی کیفیت کا۔ حق تعالیٰ پاک ہے ہر قسم کے انفعال اور تاثر سے۔ وہ صرف فاعل ہے تمام تر موثر ہے۔ اس کے اصلاحی اقدام عمل اس کی تعزیری حرکتِ ارادی کا نام بندوں کی زبان میں غضب الٰہی ہے۔ اس کی حاکمانہ قوت، مربیانہ شفقت دونوں کا عین مقتضیٰ یہی ہے کہ وہ گنہ گاروں، باغیوں، مجرموں کو ان کے جرم و بغاوت کے آخری عملی نتائج تک پہنچائے۔"

فاتحہ کا مقارنہ انجیلی دعا سے

مولانا سورہ فاتحہ کی جامعیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ خوش عقیدگی نہیں اظہار حقیقت ہے کہ جس حیرت انگیز ایجاز و جامعیت کے ساتھ سورہ فاتحہ کی سات مختصر آیتوں میں توحید الٰہی اور صفاتِ کمالیہ کا بیان آگیا ہے اس کی نظیر سے مذاہب عالم کے دفتر خالی ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر تو کیا اس کے برابر بھی مثال پیش کرنے سے دنیائے مذاہب عاجز ہے۔ مسیحی دنیا کو بڑا ناز اپنی انجیلی دعا Lords Prayer پر ہے ... ہر منصف مزاج خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن مجید کی فاتحہ الکتاب اور اس انجیلی دعا کے درمیان کیا نسبت ہے (پھر یہ دعا سورہ فاتحہ کے سامنے بالمقابل نقل کی ہے) "اے ہمارے باپ جو تو آسمان پر ہے تیرا نام مبارک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔ ہماری روز کی روٹی ہمیں آج دے اور جس طرح ہم نے اپنے قرض داروں کو معاف کیا ہے تو ہمارے قرض کو معاف کر اور ہمیں آزمائش میں نہ لا، بلکہ برائی سے بچا۔" (اس کے بعد اس طرح موازنہ کرتے ہیں) ۱۔ کہاں ربّ العالمین کی لامحدود وسعت و ہمہ گیری اور کہاں آسمان پر بیٹھے رہنے والی بعید اور محدود۔ اور پھر باپ جیسی محض مادی تعلق رکھنے والی ہستی۔ ۲۔ ایک طرف اعلان ہو رہا ہے ہمہ گیر صفات ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالکیت کا اور دوسری طرف ان کی بجائے ذکر ہے صرف زمین پر آسمانی بادشاہت آنے کا۔ ۳۔ توحید خالص پر

جو زور قرآنی عبارت میں منع عبادت غیر و منع استعانت بالغیر میں ہے انجیلی دعا میں کہیں اس کا پتہ نہیں۔ ۴۔ روٹی کی اس درجہ اہمیت مادیت کی انتہا ہے۔ ۵۔ محض برائی سے بچنے کی دعا، صراط مستقیم پر قائم رہنے کی نسبت سے کہیں زیادہ ہلکی ہے۔"

تصحیح و اضافہ

مکرمی۔

"اکادمی" بابت جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۰ء میں شائع شدہ میرے مضمون "کتابیاتِ تحقیق" میں دو تصحیحات اور ایک اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔

ص ۲۰ اور ۲۱ کے آخری حصے میں صفیر بلگرامی کو صفیر بلگرامی پڑھا جائے

ص ۱۷ سطر ۲ میں اسپرنگر کی فہرست کتب خانہ شاہ اودھ کے سلسلے میں لکھا ہے:

"اس کا اردو ترجمہ از محمد اکرام چغتائی مع مقدمہ کراچی ۷۳ء"

میرا ماخذ ڈاکٹر معین الدین عقیل کی ایک تحریر ہے۔ اسپرنگر کی فہرست کے لیے لکھتے ہیں:

"ایک عرصے سے کمیاب تھی۔ محمد اکرام چغتائی نے ایک بڑا کام کیا کہ اس فہرست کو ایک سیر حاصل مقدمے کے ساتھ جو بجائے خود تحقیق کا ایک نمونہ ہے اردو میں منتقل کیا اور اس پر مفید تعلیقات تحریر کر کے اسے بیش از معلومات بنا دیا۔ ان کا یہ کام انجمن ترقی اردو کے اہتمام سے پہلے مجلہ اردو میں اور پھر کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ (کراچی ۱۹۷۵ء)"

(پاکستان میں اردو تحقیق انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی ۱۹۸۷ء ص ۱۳۔۱۴)

ڈاکٹر نیر مسعود نے توجہ دلائی کہ اصل کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چغتائی نے دیباچہ یا سرچشمہ ہی کا ترجمہ کیا ہے، فہرست کا نہیں معین الدین عقیل کو غلط فہمی ہوئی

ص ۸۷ پر تحقیق کی کتابوں میں ذیل کا اضافہ کیا جائے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمن	یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق	لاہور ۸۹ء
ڈاکٹر تنویر احمد علوی	دلی یونیورسٹی میں اردو تحقیق	دہلی ۱۹۹۰ء
ڈاکٹر نور الاسلام صدیقی	...	دہلی ۱۹۹۰ء

فہرست کے آخری حصے میں شامل ساحل احمد کی کتاب کلہ تحقیق کا سنہ طبع ۱۹۸۸ء اور میری کتاب تحقیق کا فن کا ۱۹۹۰ء ہے

گیان چند

سید امیر حسن نورانی

مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت اور اُن کی دینی خدمات کا مختصر خاکہ

بیسویں صدی کے وسط سے ہندوستان کے جن علمار و مفکرین نے اپنے افکار و نظریات اور انداز رشد و ہدایت سے اہل علم و دانش کو متاثر کیا ان میں مولانا عبدالماجد کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی شخصیت کے متعدد پہلو اور متنوع حیثیتیں ہیں اور ہر حیثیت میں وہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کی ذات قدیم اور جدید علوم کا سنگم ہے۔ اسلامی علوم میں ماہر، صحافت میں ممتاز، صاحب طرز ادیب، بلند پایہ طنز نگار، معلم اخلاق، تصوف و سلوک کے رمز شناس کی حیثیت سے ان کا مقام بہت بلند ہے۔ ان کے افکار و نظریات اور انداز رشد و ہدایت نے بے شمار دلوں کو متاثر کیا اور فکر و عمل کی راہیں دکھائیں۔

مولانا عبدالماجد کے ذہنی اور فکری ارتقا کی تاریخ دل چسپ اور سبق آموز ہے۔ ان کی زندگی کے نشیب و فراز کو ان کی تحریروں کی روشنی میں دیکھا جائے تو صحیح خد و خال نمایاں ہوں گے۔ مولانا کی زندگی کا اہم واقعہ یہ ہے کہ وہ نہایت باوقار طریقے پر صف علمار میں شامل ہو گئے اور ممتاز علمار کی صف میں نمایاں مقام پر فائز ہو گئے اور انھیں مستند عالم تسلیم کیا گیا، ان کے ترجمہ قرآن اور تفسیر کی خوبیوں کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ یہ ان کی غیر معمولی محنت اور تبحر علمی کا نتیجہ ہے۔ آج وہ عالم اسلام کے ممتاز عالموں اور دانشوروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد نے حق گوئی اور صدق نوازی ورثہ میں پائی تھی۔ ان کے جد امجد مفتی مظہر کریم بہت بڑے عالم تھے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا، جس کی پاداش

میں ان کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی تھی۔ مولانا عبدالماجد نے بھی حق گوئی میں اپنے جدِّ امجد کی پیروی کی اور مغربی تہذیب وتمدن کے مضر اثرات سے مسلمانوں اور دوسرے اہل وطن کو بچانے کے لیے اپنے زوردار قلم کو رواں دواں رکھا۔

مولانا عبدالماجد کچھ عرصہ فلسفے کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش میں خود ہی اس میں الجھ گئے اور کچھ عرصہ راہِ راست سے بھٹکے رہے۔ جس کا نتیجہ انھیں کے الفاظ میں سنیے:

"نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعت اسلام کی طرف سے برگشتہ ہوگئی اور نفس پر جادوارتداد کا چل گیا۔ بے تکلف لندن کی ریشنلسٹ ایسوسی ایشن کا ممبر بن گیا اور اپنے کو کھلم کھلا ریشنلسٹ یعنی عقلیت پسند یا ایگناسٹک (لا ادری) کہنے لگا۔ یہی غنیمت ہوا کہ سوشل حیثیت سے مسلمان اس وقت بھی رہا۔ وہی مسلم برادری وہی مسلم معیشت۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک یعنی سترہویں سال سے لے کر ستائیسویں سال کی عمر تک یہی انداز فکر رہا۔ مغربیت کی ٹھیٹھ مادیت کا بت، ہندو فلسفہ کے مطالعہ سے ٹوٹا اور روحانیت کے نام سے چڑھ اور بیزاری نہ رہی۔ ڈیڑھ دو سال اسی حالت میں گزرے اور ۱۹۲۰ء سے کہنا چاہیے یہ مرتد از سرِ نو اسلام لے آیا۔"[1]

یہ ان کی زندگی کا سبق آموز اور عبرت خیز واقعہ ہے۔ علم کی گہرائی اور گیرائی نے انھیں وہ روشنی دکھا دی جس کی انھیں تلاش تھی۔ اس سلسلے میں اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر کی رہنمائی ان کے کام آئی۔ اکبر، مولانا کے والد ماجد کے دوستوں میں تھے ان کو مولانا کی گمراہی کا بہت دکھ تھا۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں نصیحتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ مولانا محمد علی سے تعلقات کا آغاز اس وقت ہوا جب لندن سے مولانا عبدالماجد کی انگریزی کتاب "فلسفۂ اجتماع" شائع ہوئی جس کو پڑھ کر مولانا محمد علی ان کی علمی استعداد سے بہت متاثر ہوئے لیکن ان کے ملحدانہ خیالات کی تردید خطوط کے ذریعہ کی۔ محمد علی بڑے حق گو اور نڈر رہنما تھے ان کے دلائل سے مولانا بہت متاثر ہوئے۔ اس سلسلہ میں دونوں میں قریبی روابط قائم ہوگئے۔

---

[1] خود نوشت حالات مطبوعہ ماہنامہ فروغ اردو عبدالماجد نمبر

مولانا محمد علی نے ان کو ہمدرد اخبار کے مضمون نگاروں میں شامل کرلیا۔ پھر یہ تعلق اتنا بڑھا کہ کافی عرصہ ساتھ رہا۔ مولانا عبدالماجد نے حق گوئی کا بڑا حصہ محمد علی کی صحبت میں پایا۔ مولانا عبدالماجد، علامہ شبلی نعمانی کے فیض تربیت سے بھی بہرہ یاب ہوئے۔ سیرت النبی جیسی معرکۃ الآرا تصنیف کے سلسلہ میں انگریزی کتابوں کے مطلوبہ اقتباسات کے اردو ترجمے کے لیے علامہ شبلی نے مولانا دریابادی کا انتخاب کیا۔ اس طرح مولانا کو علامہ شبلی کے افکار و نظریات سے استفادے کا موقع ملا۔ ان کی صحبت میں رہ کر علمی تربیت حاصل کی۔ شبلی کے فیض نے قلم کا جادو جگایا، اردو کا ذوق مولوی عبدالحق سے ملا جن سے مولانا کے خاص روابط تھے۔ سید سلیمان ندوی اور دیگر اکابر ندوہ سے ربط و ضبط کے باعث علوم اسلامیہ کے مطالعہ کی رغبت بڑھی اور آخر میں مولانا اشرف علی تھانوی کی عقیدت نے تصوف و سلوک کی راہ دکھائی۔ اس طرح الحاد و بے دینی سے ہم کنار عبدالماجد کتنے نشیب و فراز طے کر کے مولانا عبدالماجد معلّم اخلاق، مفکر اسلام اور مصلح ملّت کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ پھر تو نہ جانے کتنے گمراہوں کو راہ راست دکھائی۔ باہمی تفرقوں کی آگ ٹھنڈی کرنے کی جدوجہد کی، اسلام کو اس کی اصل شکل و صورت میں مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ غیر مسلموں کو اسلامی تعلیمات کی خوبیوں اور برکتوں سے دل نشیں انداز میں واقف کرانے کی مسلسل کوشش کرتے رہے جس کا ثبوت صدق جدید کی بے شمار تحریریں ہیں۔

بیسویں صدی میں جتنی سیاسی، اسلامی اور عام اخلاقی اصلاح کی تحریکیں چلیں شاید کسی اور زمانے میں چلی ہوں۔ بعض تحریکوں سے طرح طرح کی گمراہیاں پھیلیں۔ اس فضا میں کھرے کھوٹے کا فرق بتانا کسی بڑے حق گو اور دانش ور کا کام تھا۔ اس کام میں مولانا دریابادی نے دوسرے بلند مرتبہ علمار کے دوش بدوش گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی رہنمائی کی۔ مذہبی فرقوں کے نزاعات کی علانیہ مذمت کی۔ حق بات کہنے میں انھوں نے مصلحت و مروت کو بہت کم پیش نظر رکھا۔ مولانا نے اصلاحی تحریک میں اپنا زورِ قلم قرآن حکیم کی تعلیمات پھیلانے اور ان کی تشریح و تعبیر میں صرف کیا۔ اس کے ساتھ احادیث نبوی اور اسوۂ صحابہ کو توئیے رنگ اور دل پذیر ڈھنگ سے پیش کیا جس کو تعلیم جدید کے پروردہ طبقے نے بھی قبول کیا۔ مسلسل چا... سال قرآن کا مطالعہ اور اس کے

مطالب پر غور و فکر ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ انھوں نے قرآنی علوم پر بکثرت مضامین اور چھوٹی بڑی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

مولانا عبدالماجد جدید علوم سے بخوبی واقف تھے۔ مغربی تہذیب اور سائنس کی غیر معمولی ترقیوں نے جن نظریات اور تصورات کو جنم دیا ان کو مذہب کے لیے چیلنج سمجھا جانے لگا۔ انھوں نے اسلام کی تعلیمات کی برتری کو سائنسی نقطۂ نظر سے ثابت کرنے کی جد و جہد کی۔ انھوں نے ملت اسلامیہ کی اصلاح کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس دور میں اتنا نہیں ہوسکا جتنا شاید آنے والی نسلیں کریں گی۔ ان کی تحریر بھی بڑے بڑے خطبوں اور تقریروں سے زیادہ موثر ہے۔

مخالفین اسلام خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں جب اسلام کے خلاف کچھ لکھتے اور وہ مولانا کی نظر سے گزرتا تو اس کا نہایت مدلل جواب لکھتے تھے۔ ان کی تحریروں کا ترجمہ صدق جدید سے دوسری زبانوں میں بھی ہوتا رہتا تھا۔ ایک دو بار ان کی تحریروں کی گونج یو۔ این۔ او۔ میں سنی گئی۔ مولانا کے بعد صدق جدید کا بند ہوجانا ایک علمی اور ملی المیہ ہے۔ اگر وہ جاری رہتا تو مولانا کے لکھے ہوئے شذرات مسلسل دوبارہ شائع ہوتے رہتے۔ اور سچ اور صدق اور صدق جدید کے مضامین کا ایک مکمل انتخاب بھی شائع ہوجاتا۔ مگر زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ آج ان کی بیشتر تصانیف نایاب ہیں۔ ضرورت اس کی ہے انھیں اہتمام کے ساتھ یکساں سائز میں شائع کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سمینار کے افتتاح کے موقع پر اترپردیش کے وزیر اعلی کی پیش کش سے اردو اکیڈمی یا عبدالماجد اکیڈمی کوئی مناسب لائحہ عمل تیار کر کے استفادہ کرے تو بڑی خدمت بلکہ اہم کارنامہ ہوگا۔

حکیم عبد القوی دریابادی

مولانا عبد الماجد دریابادی کی تصانیف کا
مختصر تعارف

مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کا شمار اردو کے چوٹی کے صاحب طرز انشا پردازوں اور ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔ بچپن ہی سے انھوں نے مضمون نگاری شروع کی اور ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز ان کے دو چھوٹے رسالوں کی شکل میں ہوا جو اردو کے مشہور روزنامہ 'وکیل' امرتسر نے اس وقت شائع کیے جب مولانا انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ مولانا مرحوم نے تقریباً چوراسی سال کی عمر پائی اور اس عرصہ میں انھوں نے تقریباً چھوٹی بڑی ملا کر اڑسٹھ کتابیں لکھیں جو مختلف موضوعات پر ہیں۔ ان تصانیف کا مختصر تعارف ایک ہیچ مداں پیش کر رہا ہے:

۱۔ غذائے انسانی:

گوشت خوری کے خلاف بعض حلقوں سے جو اعتراض کیے جاتے ہیں ان کے منطقی اور علمی جواب اس مختصر کتابچہ میں دیے گئے ہیں مگر کہیں بھی مناظرانہ تلخی نہیں پائی جاتی۔

۲۔ محمود غزنوی:

متعصب اور فرقہ پرست مورخوں نے محمود غزنوی پر جو بے اصل الزام لوٹ کھسوٹ اور مذہبی تعصب کے لگائے ہیں ان کا شافی جواب مستند تاریخی حوالوں سے دیا گیا ہے۔

۳۔ فلسفہ جذبات:

فلسفہ مولانا کی دل چسپی کا خاص موضوع تھا، اس خشک موضوع کو انھوں نے سنجیدہ اور عام فہم پیرایہ میں اردو والوں کے سامنے پیش کیا۔ انجمن ترقی اردو نے اسے شائع کیا اور اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

فلسفہ اجتماع:

یہ کتاب مولانا کے دورِ الحاد کی یادگار ہے۔ اس کی کچھ چیزیں مذہبی اعتبار سے
ل گرفت تھیں اور ان کی بنا پر ان کے خلاف کچھ کفر کے فتوے بھی لگائے گئے۔ یہ کتاب
ن ترقی اردو نے شائع کی تھی۔ جب مولانا کے خیالات میں انقلاب عظیم آیا تو انھوں نے اس
اب کو اپنی فہرست تصانیف سے خارج کر دیا۔

سائیکلوجی آف لیڈرشپ (انگریزی):

یہ انگریزی کتاب مولانا کی ابتدائی تصنیفوں میں ہے۔ اس کو انگلستان کے مشہور
شر فشر اینڈ انون کمپنی نے شائع کیا، اس میں بڑی حد تک وہی چیزیں تھیں جو اردو میں
سفہ اجتماع' میں تھیں۔ مولانا نے یہ کتاب مولانا محمد علی جوہر کو جو چھنڈواڑہ جیل میں نظر بند
ے مطالعہ کے لیے بھیجی۔ مولانا محمد علی نے کتاب کی علمیت، حسن انشا اور عبارت کی تعریف
، لیکن ساتھ ہی اس کے الحادی اجزا پر سخت تنقید کی، جس کا اثر مولانا نے قبول کیا۔

مکالمات برکلے:

مشہور برطانوی فلسفی برکلے کے "ڈائیلاگس" کا ترجمہ سلیس اردو میں مولانا نے کیا
ر دار المصنفین اعظم گڑھ نے شائع کیا۔

فلسفہ اور اس کی تعلیم:

یہ کتاب فلسفہ کی مختصر تاریخ پر ہے اس کو النا ظر بک ایجنسی، لکھنؤ نے چھاپا۔

فلسفیانہ مضامین:

مولانا کے متفرق فلسفیانہ مضامین جو لکھنؤ کے مشہور رسالہ 'الناظر' میں شائع ہوئے
تھے، ان کو الناظر بک ایجنسی نے کتابی شکل میں شائع کیا۔

و ۱۰۔ مبادی فلسفہ (حصہ اول وحصہ دوم):

اس کتاب میں فلسفہ کے مختلف مضامین پر مولانا مرحوم نے پختہ مسلمان ہو جانے کے بعد
ظر ثانی کی اور انداز بیان کو زیادہ سلیس اور دل نشیں بنا کر دار المصنفین اعظم گڑھ کے ذریعہ
شائع کرایا۔ دوسرا ایڈیشن چند سال ہوئے یو پی اردو اکادمی نے دونوں حصوں کو یک جا

کر کے شائع کیا۔

۱۱۔ ھم آپ :

یہ کتاب پاپولر سائیکالوجی پر مولانا مرحوم نے ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد کی فرمائش پر لکھی اور جو اردو ٹائپ میں شائع ہوئی۔ فلسفہ پر مولانا کی یہ آخری کتاب تھی۔

۱۲۔ منطق :

جدید منطق پر مولانا کی ترجمہ کردہ کتاب دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے شائع کی اور یہ وہاں کے نصاب میں مدتوں داخل رہی۔

۱۳و ۱۴۔ تاریخ اخلاق یورپ (حصہ اول و دوم) :

مشہور یورپین مورخ کیلی کی مشہور کتاب "ہسٹری آف دی یورپین مارلس" کا ترجمہ مولانا نے صحیح معیاری اردو میں انجمن ترقی اردو کی فرمائش پر کیا اور اسی نے اس کتاب کو شائع کیا جو اپنے زمانہ میں خاصی مقبول و مشہور ہوئی۔

۱۵۔ تاریخ تمدن (حصہ دوم) :

انگریز مصنف ٹامس کی کتاب کا ترجمہ منشی احمد علی کاکوروی کر رہے تھے۔ حصہ اول مکمل ہو چکا تھا کہ ان کی وفات ہو گئی۔ دوسرے حصہ کا ترجمہ مولانا نے کیا، اس کتاب کو بھی انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔

۱۶۔ تاریخ یورپ :

سررشتۂ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی نے اس ضخیم کتاب کا ترجمہ کروایا، کچھ اجزا کا ترجمہ مولانا نے اور باقی کا دوسرے اہل علم حضرات نے کیا۔

۱۷۔ پیامِ امن :

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴-۱۹۱۸ء کے خاتمہ پر فرانسیسی امن پسند فلسفی مسیو پال رچرڈ نے جنگ کی تباہ کاریوں سے دنیا کو خبردار کرتے ہوئے امن و آشتی بنائے رکھنے کی اپیل ایک کتاب کے ذریعہ کی۔ مولانا اس وقت گاندھی جی کی تحریک ترک موالات اور فلسفہ عدم تشدد کے گرویدہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کتاب کو اردو کا جامہ پہنایا اور ایک نیا باب اسلام اور امن کے

نام سے شامل کیا۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دارالمصنفین اعظم گڑھ نے شائع کیا اور دوسرا ایڈیشن ابھی چند سال ہوئے عبدالماجد اکیڈمی نے شائع کیا۔

۱۸۔ تصوف اسلام :

الحاد و تشکیک کی وادی سے مذہب کی طرف مولانا کی واپسی تصوف کے ذریعہ ہوئی، اس کتاب میں انھوں نے صحیح اسلامی تصوف کی تاریخ بیان کی ہے اور تصوف کی معیاری کتب کا تعارف کرایا ہے۔ اس کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ اب تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۔ فیہ مافیہ (فارسی) :

مولانا نے صاحب مثنوی معنوی مولانا جلال الدین رومی کے ملفوظات جو فارسی نثر میں ہیں ان کا متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کر کے ایک مقدمہ کے ساتھ شائع کیا جس میں مولانا روم کی سوانح اور تعلیمات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

ادبی تصانیف :

۲۰۔ زود پشیماں (ڈرامہ)

یہ ڈرامہ مولانا نے اپنی روشن خیالی کے زمانہ میں لکھا تھا اور اس میں ان کی چند غزلیں ناظر کے تخلص کے ساتھ شامل ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحلیم شرر کی رائیں بھی درج ہیں۔ اس کتاب کو الناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کیا۔

۲۱۔ مثنوی بحر المحبت :

مشہور شاعر غلام ہمدانی مصحفی کی نایاب مثنوی کو ایڈٹ کر کے مع اپنے مقدمہ کے مولانا نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ذریعہ شائع کرایا۔ دوسرا ایڈیشن کئی سال قبل جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کیا۔

۲۲۔ مقالات ماجد (حصہ اول)

مولانا کے ادبی مضامین کا مجموعہ۔ پہلا ایڈیشن تاج آفس، بمبئی نے اور دوسرا ایڈیشن عشرت بک ڈپو، لاہور نے چھاپا۔

۲۳ و ۲۴ ۲۔ ادبی مقالات پر نظر ثانی کر کے انشائے ماجد کے دو حصے مرتب کیے گئے جن کو نسیم بک ڈپو، لکھنؤ نے شائع کیا اور عنقریب دوسرا ایڈیشن کچھ اور اضافوں کے ساتھ شائع ہونے والا ہے۔ ان مجموعوں میں مولانا کے بہت سے ادبی شاہکار شامل ہیں۔ مثلاً:
(۱) اردو کا ایک بدنام شاعر (نواب مرزا شوق صاحب زہر عشق)، (۲) مرزا رسوا کے قصے کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے (۳) پیام اکبر (۴) نیا آئین اکبری (۵) اردو کا واعظ شاعر (خواجہ حالی)، اور بہت سے پر اثر تعزیتی مضامین اور معیاری تبصرے بھی شامل ہیں۔

۲۵۔ نشریات ماجد:

لکھنؤ اور دہلی ریڈیو اسٹیشنوں سے مولانا نے مختلف ادبی و مذہبی عنوانات پر تقریریں نشر کیں ان کا دلچسپ مجموعہ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ نے چھاپا ہے۔ ان نشریات کی زبان دیگر مضامین سے مختلف Talk کے انداز کی ہلکی پھلکی مگر ادبی چاشنی اور خوبیوں سے لبریز ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن جلد شائع ہونے والا ہے۔

۲۶ مضامین عبد الماجد:

ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد نے 'سچ' اور 'صدق' میں مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے مختلف مضامین شائع کیے۔

۲۷۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں:

مولانا مرحوم کو مشہور ظریف و حکیم شاعر حضرت اکبر الہ آبادی سے خصوصی تعلق تھا کیوں کر انھوں نے ان کی اصلاح میں بڑا حصہ لیا تھا۔ اکبر پر مولانا نے بہت لکھا۔ اس موضوع پر مختلف مضامین کا مجموعہ ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ نے شائع کیا اور دوسرا ایڈیشن سال گزشتہ اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوا ہے۔

۲۸۔ مکاتیب اکبر:

حضرت اکبر الہ آبادی کے خطوط بنام مولانا عبد الماجد دریا بادی مع توضیحی حواشی، جن کو خواجہ حسن نظامی صاحب مرحوم نے دہلی سے شائع کیا۔

۲۹۔ خطوط مشاہیر:

اس مجموعہ میں شبلی نامہ (مولانا شبلی کے خطوط بنام مولانا دریا بادی)۔ اکبر نامہ (حضرت اکبر الہ آبادی کے خطوط)۔ جوہر نامہ (مولانا محمد علی جوہر کے خطوط) مولانا مرحوم کے علیحدہ علیحدہ دیباچوں اور مفصل نوٹوں کے ساتھ شامل ہیں۔ پہلا ایڈیشن تاج کمپنی لاہور نے اور دوسرا ایڈیشن نسیم بک ڈپو، لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

۳۰ و ۳۱۔ مکتوبات سلیمانی (حصہ اول وحصہ دوم):

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم سے مولانا کے بڑے مخلصانہ اور خصوصی تعلقات آخر دم تک رہے۔ ان کے خطوط کو مولانا کے دیباچوں اور مفصّل حاشیوں کے ساتھ صدق بک ایجنسی، لکھنؤ نے دو حصوں میں شائع کیا ہے۔

۳۲۔ سفر حجاز:

مولانا دریا بادی ۱۹۲۹ء میں سفر حج سے مشرف ہوئے تھے، ان کا سفرنامہ قسط وار ہفتہ وار 'سچ' میں نکلا۔ بعد میں کتابی شکل میں چھپا اور بہت مقبول ہوا چنانچہ تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۳۳۔ ڈھائی ہفتہ پاکستان میں یا مبارک سفر:

پاکستان کا سفر (لاہور اور کراچی) مولانا نے پہلی بار ۱۹۵۵ء میں ملک غلام محمد کی دعوت پر کیا تھا۔ اس کی روداد کو صدق بک ایجنسی نے شائع کیا اور چند سال ہوئے عبدالماجد اکیڈیمی نے دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔

۳۴۔ حکیم الامت، نقوش وتاثرات:

مولانا کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم سے خاص عقیدت تھی اور ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ اس کتاب میں مولانا نے اپنے تاثرات، خطوط اور ملاقاتوں کا حال اپنے خاص رنگ میں لکھا ہے۔ پہلا ایڈیشن دار المصنفین اعظم گڑھ، دوسرا پاکستان میں اور تیسرا تھانہ بھون میں زیر طبع ہے۔

۳۵، ۳۶۔ محمد علی ذاتی ڈائری (حصہ اول و دوم):

مولانا محمد علی مرحوم سے مولانا دریا بادی کو انتہائی محبت اور عقیدت تھی، انھوں نے

بڑے سوز و گداز کے ساتھ اپنے مشاہدات اور تاثرات قلم بند کیے ہیں جن کی وجہ سے کتاب نہایت دل چسپ ہو گئی ہے۔ خود مولانا مرحوم کو اپنی یہ تصنیف خاص طور پر پسند تھی۔ اب یہ کتاب تقریبًا نایاب ہے۔

۳۷۔ تفسیر ماجدی (انگریزی):

سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد مولانا مرحوم نے تن تنہا کلام مجید کا انگریزی ترجمہ اور تفسیر مکمل کرنے کی سعادت حاصل کی جس کو تاج کمپنی لاہور نے سات منزلوں میں الگ الگ اور پھر ایک جلد میں یک جا کر کے شائع کیا۔ یہ تفسیر انگریزی تعلیم یافتہ طبقوں اور غیر مسلموں کے لیے خاص طور پر نافع ہے کیونکہ ان کے تمام شبہات و اعتراضات کا کافی و شافی جواب دیا گیا ہے اور جا بجا تاریخ، جغرافیہ اور ماڈرن سائنس کی روشنی میں کلام خداوندی کی حقانیت اور صداقت ثابت کی گئی ہے۔ ہندستان میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء نے دوسرا ایڈیشن مولانا کی نظر ثانی و اضافوں کے بعد چار جلدوں میں شائع کیا ہے۔

۳۸۔ انگریزی ترجمہ قرآن:

تاج کمپنی لاہور کی فرمائش پر مولانا نے ماڈرن انگریزی میں کلام مجید کا ترجمہ کیا جو پاکستان میں شائع ہوا۔

۳۹ تا ۴۲۔ تفسیر ماجدی (اردو)

مولانا نے انگریزی تفسیر و ترجمہ کے بعد اردو میں کلام مجید کی تفسیر لکھی جس کا اصل مقصد جدید تعلیم یافتہ طبقوں کے شکوک کا ازالہ اور اسلام کا موازنہ دیگر مذاہب کی تعلیم سے کرنا ہے۔ اپنے رنگ کی محققانہ تفسیر ہے جو ہند و پاک میں بہت مقبول ہوئی۔ پہلا ایڈیشن تاج کمپنی لاہور نے شائع کیا۔

کئی سال بعد مولانا نے اس تفسیر پر مکمل نظر ثانی کی اور اس میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ کیا۔ دو جلدیں جس میں دس پاروں کی تفسیر ہے اور تیسری جلد گیارہویں پارہ کی، صدق بک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کی۔ مکمل تفسیر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ کے زیر اہتمام زیر طبع ہے۔

۴۔ جغرافیہ قرآنی یا ارض القرآن:

تفسیر لکھنے کے بعد مولانا نے کچھ چھوٹی کتابیں قرآنیات پر مرتب کیں، اس کتاب میں ان مقامات کے نام یا اشارے آئے ہیں ان کے متعلق ضروری معلومات بہ ترتیب حروف تہجی درج ہے۔

۴۔ حیوانات قرآنی:

جن حیوانات کا ذکر آیا ہے ان کے اور ان کے متعلقات مثلاً گوشت، دودھ کھال وغیرہ سے متعلق معلومات کا ذخیرہ ہے۔

۴۔ شخصیات قرآنی یا اعلام القرآن:

جو نام قرآن مجید میں آئے ہیں یا جن ناموں کا اشارہ ملتا ہے ان کے بارے میں ضروری معلومات حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ دی گئی ہیں۔

۴۔ قصص ومسائل:

مولانا نے کچھ لکچر جدید قصص الانبیا، اور قدیم کلام کے مسائل جدید روشنی میں پیشاور اور رام پور میں دیے تھے ان کو کتابی شکل میں پہلے نفیس اکیڈمی حیدرآباد اور دوسرا ایڈیشن صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ نے شائع کیا۔

۴۔ بشریت انبیاء:

یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد ہے۔ جو تمام تر قرآنی آیات سے ماخوذ ہیں۔ اس کو صدق جدید بک ایجنسی نے شائع کیا، پھر دوسرا ایڈیشن پاکستان سے نکلا۔

۴۔ خطبات ماجدی یا سیرت نبویؐ قرآن کی روشنی میں:

مولانا نے "سیرت نبویؐ قرآن مجید کی روشنی میں" پر مدراس میں کچھ لکچر دیے تھے جس کا پہلا ایڈیشن اُس انجمن نے جس نے لکچر دلوائے تھے شائع کیا اور پھر دوسرا ایڈیشن دیباچہ اور اختتامیہ کے اضافہ کے ساتھ صدق جدید بک ایجنسی، لکھنؤ نے شائع کیا۔

۴۔ مشکلات القرآن:

۱۹۷۰ء میں مولانا دوبارہ لکچر دینے مدراس گئے تھے وہاں مشکلات القرآن کے عنوان

پر پانچ لکچر دیے تھے ان کا مجموعہ کتابی شکل میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ مولانا کی وفات کے چند ماہ بعد شائع ہوا۔

۵۰۔ ترجمہ وشرح مناجات مقبول:

مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کی مرتب کردہ دعاؤں کی مشہور کتاب مناجات مقبول کی شرح مولانا دریابادی کے قلم سے۔ان کی مقبول ترین کتب میں ہے اور اس کے اب تک چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۵۱۔ شرح چہل حدیث ولی اللّٰہی:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مرتب کردہ چالیس حدیثوں کی مختصر شرح جیبی تقطیع پر صدق بک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کی۔

۵۲۔ مردوں کی مسیحائی:

مولانا نے سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر 'سچ' اور 'صدق' میں بہت سے مضامین لکھے ان کا مجموعہ جو اردو میں بہترین نثری نعت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۵۳۔ صابر رسول:

حیدر آباد کی ایک انجمن نے الگ رسالہ کی شکل میں شائع کیا۔

۵۴۔ ۵۵۔ یتیم کا راج اور یتیم کی جیت:

مولانا کے دو مشہور سیرتی مضامین جن کو تحریک سیرت لاہور اور پھر لکھنؤ کی ایک انجمن نے رسالوں کی شکل میں شائع کیا۔

۵۶۔ تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام:

مولانا نے دو لکچر انجمن تمدن اسلامی علی گڑھ کے دو جلسوں میں دیے تھے ان کا مجموعہ آفسیٹ پر ادارہ ادبیات دہلی نے چند سال ہوئے شائع کیا۔

۵۷۔ تحفہ خسروی:

راعی ورعایا کے تعلقات پر فارسی کتب اخلاق سے ماخوذ یہ کتاب مولانا نے الناظر

بک ایجنسی لکھنؤ سے شائع کرائی تھی۔

۵۸۔ فرائض والدین:

خادم تعلیم کے فرضی نام سے مولانا کی یہ کتاب نول کشور بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

۵۹۔ مشاہیر سائنس:

میک ملن کمپنی کی شائع کردہ انگریزی کتاب کا ترجمہ۔

۶۰۔ خطبۂ صدارت مجلس استقبالیہ آل انڈیا خلافت کانفرنس لکھنؤ:

مولانا تحریک خلافت کے سرگرم داعی تھے اور اودھ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے تھے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے یہ خطبہ انھوں نے پڑھا تھا۔

۶۱۔ ندوہ کا پیام ندویوں کے نام:

دارلعلوم ندوۃ العلماء کے طلباے قدیم کے سالانہ اجلاس میں مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے اور پھر مستقل صدر کی حیثیت سے مولانا نے دو خطبے پڑھے تھے جن کو ۱۹۷۶ء کے جشن ندوہ میں ادارہ فروغ اردو نے شائع کیا۔

۶۲۔ نورانی جہیز:

مولانا نے اپنی بڑی لڑکی کے نکاح پر جو موثر خطبہ پڑھا تھا اسی کو مولانا محی الدین منیری نے بمبئی سے شائع کیا۔ پھر گجراتی اور انگریزی میں ترجمے بھی ہوئے۔

۶۳۔ خطبات ماجدی:

ادارہ انشاے ماجدی کلکتہ نے مولانا کے دیے ہوئے چار خطبات نکاح خاص اہتمام سے شائع کیے جن کی بہت مانگ ہے۔

۶۴۔ معاصرین:

یہ مولانا کی آخری تصنیف ہے جس میں انھوں نے اپنے سے بڑے، برابر اور چھوٹے مخصوص معاصرین کا ذکر اپنے خاص انداز میں کیا ہے۔ یہ کتاب ادارہ انشاے ماجد کلکتہ نے شائع کی۔

۶۵۔ آپ بیتی:

مولانا مرحوم نے کئی سال ہوئے اپنی خود نوشت سوانح حیات لکھی جس پر برابر نظر ثانی

کرتے رہے اور ان کی وصیت کے بموجب ان کے انتقال کے بعد مکتبۂ فردوس ادب لکھ
نے شائع کی۔ حال میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اردو ادب میں حسن انشا اور دل آویزی کے
لحاظ سے یہ کتاب منفرد ہے۔ اس پر مقدمہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے تحریر فرمایا

۶۶۔ سیاحت ماجدی:

اس مجموعہ میں مولانا کے قلم سے ان کے گیارہ سفروں کی روداد بڑے دل چسپ اندا
سے بیان کی گئی ہے۔ اس کو ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ نے شائع کیا ہے۔

۶۷، ۶۸۔ مکتوبات ماجدی (حصہ اول و دوم):

مولانا مرحوم کو خطوط لکھنے میں بڑا ملکہ حاصل تھا اور غالبؔ کی طرح ان کے خطوط
اپنی ادبی چاشنی، معنویت اور دل کشی کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ دو جلدوں میں
کئی سو دل آویز مکتوبات ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ نے شائع کیے ہیں۔

خود مولانا مرحوم تفسیر ماجدی، محمد علی اور حکیم الامت کو اپنی تصنیفات میں زیادہ پسند
کرتے تھے۔ مگر ادب و انشا کے پرستاروں نے ان کے تمام رشحات قلم کی پوری قدر کی اور
آج بھی ان کی تصنیفات ادبی دنیا میں بڑی قدر سے دیکھی جاتی ہیں۔